TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL LIBRARY
OU_224077
UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۴۳:۵ | غ - ن ذ Accession No. ۱۲۳۸۹
17389

Author

Title ذ ر س کا غزل نمبر ۱۹۵۸ء

This book should be returned on or before the date last marked below.

نقوش

شمارہ (۶) اپریل سنہ ۱۹۵۸ء

طلبائے مدرسہ فوقانیہ چوک کے ترجمان

نورس کا "غزل نمبر"

سرپرست

عالیجناب محمد حمید الدین صاحب بی۔ ایس۔ سی۔ ایم۔ ایڈ (عثمانیہ)

مینجنگ ایڈیٹر

محمد منظور احمد

نائب مدیر	مدیر
محمد مجیب اللہ متعلم دہم (ا)	سید احمد متعلم دہم (ج)

طلبا کے مضامین کی فہرست

١- اداریہ — ٣

٢- قطرے سے گہر ہونے تک — شیخ جلیل دہم (ب) ٥

٣- مشاہیر کا اثر — مرزا اسمٰعیل بیگ دہم (الف) ٥

٤- نیوٹن — محمد قاسم تاج صدیقی دہم (الف) ٦

٥- آزادی کی خاطر — سید عبدالغفار دہم (ب) ٨

٦- ہمارے وزیر اعظم — تلجا پرشاد — ہشتم (ب) ١٠

٧- انسانیت — سید ولی الدین دہم (الف) ١٢

٨- زندگی کا ساز — نارائن راج ماتھر دہم (ب) ١٣

٩- انصاف — میر سیادت علی متعلم دہم (ب) ١٤

١٠- تین چیزیں — محمد قاسم تاج صدیقی دہم الف ١٦

١١- آزادی کی برکتیں — اختر سعید احمد — دہم الف ١٧

١٢- ممتاز محل کی دو وصیتیں — محمد مظہر الدین متعلم نہم ب ١٨

١٣- ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ — سید فاضل متعلم ہشتم ج ١٩

١٤- لطیفے — محمد شوکت علی متعلم ہشتم د ١٩

١٥- ریڈیم — محمد عارف الدین فاروقی نہم ب ٢٠

١٦- امید — حسین بن سعید نہم (ب) ٢٢

١٧- مولانا ابوالکلام آزاد — احسان محمد نہم (الف) ٢٣

١٨- مضمون نگاری — خواجہ محمد علی شاہ قادری نہم (د) ٢٤

١٩- سورج — بشیر احمد خاں نہم (ب) ٢٥

٢٠- ایک یتیم کی عید — محمد عروج احمد خاں نہم (الف) ٢٦

٢١- زندگی کا ہر لمحہ قیمتی ہے — بشیر احمد خاں (د) ٢٧

٢٢- دوسرا پنج سالہ منصوبہ — سید احمد نہم (د) ٢٩

٢٣- ناخن — محمد جلیل الدین نہم (ج) ٣٠

٢٤- ہندوستان کی آزادی — محمد ضیاء الدین صابر ہشتم (ب) ٣١

٢٥- تعلیم — محمد کلیم اللہ حسینی ہفتم (ب) ٣٢

٢٦- طالب علم — سعید احمد ہفتم (ب) ٣٣

٢٧- چار بہرے — سید عبدالحی ہفتم (الف) ٣٣

٢٨- تگ و دو — سید احمد — محمد محب اللہ — خواجہ عزیز الدین ٣٥

٢٩- پچھلے شمارے پر تبصرہ — پروفیسر آل احمد سرور — روزنامہ سیاست، حیدرآباد

٣٠- غزل نمبر ٤٥

فہرست غزل نمبر

۱	دکن میں غزل گوئی کا آغاز	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۴۵
۲	اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر	" "	۴۸
۳	محمد قلی قطب شاہ	پروفیسر ابوظفر عبدالواحد	۵۱
۴	ملا غواصی	محمد اکبرالدین صدیقی	۵۴
۵	سلطان عبداللہ قطب شاہ	پروفیسر سید محمد	۵۷
۶	ہاشمی بیجاپوری	ڈاکٹر عبدالحفیظ قتیل	۵۹
۷	نصرتی	پروفیسر سید محمد	۶۱
۸	علی عادل شاہ ثانی شاہی	پروفیسر عبدالقادر سروری	۶۳
۹	ولی اورنگ آبادی	محمد اکبرالدین صدیقی	۶۷
۱۰	قاضی محمود بحری	محمد اکبرالدین صدیقی	۷۱
۱۱	سراج اورنگ آبادی	محمد اکبرالدین صدیقی	۷۳
۱۲	مرزا داؤد اورنگ آبادی	"	۷۶
۱۳	مرزا جمال اللہ عشق	"	۷۸
۱۴	لچھمی نرائن شفیق	سید حمید شطاری	۸۰
۱۵	ماہ لقا بائی چندا	زینت ساجدہ	۸۳
۱۶	شمس الدین فیض	مس رشید موسوی	۸۷
۱۷	امیر مینائی	محمد اکبرالدین صدیقی	۹۰
۱۸	فصیح الملک داغ	علامہ تمکین کاظمی	۹۳
۱۹	ڈاکٹر احمد حسین مائل	خواجہ حمیدالدین شاہد	۹۹
۲۰	صدیق احمد سید محمد بے نظیر شاہ وارثی	محمد اکبرالدین صدیقی	۱۰۰
۲۱	یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد	علامہ حیرت بدایونی	۱۰۳
۲۲	فصاحت جنگ جلیل	علی احمد جلیلی	۱۰۶

۲۳	نواب عزیز یار جنگ	محمد اکبرالدین صدیقی	۱۱۰
۲۴	نواب عزیز جنگ ولا	محمد سعادت اللہ خاں	۱۱۴
۲۵	شوکت علیخاں فانی	ڈاکٹر عبدالحفیظ قتیل	۱۱۷
۲۶	حضرت امجد حیدرآبادی	خواجہ حمیدالدین شاہد	۱۲۳
۲۷	صفی اورنگ آبادی	محمد اکبرالدین صدیقی	۱۲۶
۲۸	علی اختر	محمد سعادت اللہ خاں	۱۳۰
۲۹	حضرت سید علی منظور	خواجہ حمیدالدین شاہد	۱۳۵
۳۰	علامہ حیرت بدایونی	—	۱۳۷
۳۱	نجم آفندی	محمد سعادت اللہ خاں	۱۳۹
۳۲	محمد عبدالحمید خاں خیالی	—	۱۴۱
۳۳	ناصر زید پوری	محمد سعادت اللہ خاں	۱۴۳
۳۴	عبدالقیوم خاں باقی	خواجہ حمیدالدین شاہد	۱۴۶
۳۵	صاحبزادہ میر محمد علیخاں میکش		۱۴۸
۳۶	سکندر علی وجد	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	۱۵۱
۳۷	محشر عابدی	متین سروش	۱۵۶
۳۸	کنول پرشاد کنول	اکبرالدین صدیقی	۱۵۸
۳۹	شاذ تمکنت	مغنی تبسم	۱۶۱
۴۰	علی احمد جلیلی	—	۱۶۵
۴۱	رائے منوہر لال شارب	خواجہ حمیدالدین شاہد	۱۶۸
۴۲	مغنی تبسم	شاذ تمکنت	۱۷۰
۴۳	وحید اختر	—	۱۷۲
۴۴	غلام سرور ڈنڈا	خواجہ حمیدالدین شاہد	۱۷۵
۴۵	عزیز قیسی	شاذ تمکنت	۱۷۷
۴۶	مظہر حسین قیصر	شاذ تمکنت	۱۷۹
۴۷	خیرات ندیم	خواجہ حمیدالدین شاہد	۱۸۱

۴۸	شمس الدین تاباں	خواجہ حمید الدین شاہد	۱۸۳
۴۹	شیخ حسین سالک	مغنی تبسم	۱۸۵
۵۰	عبداللہ ابن احمد تاب	خواجہ حمید الدین شاہد	۱۸۷
۵۱	امان ارشد	مغنی تبسم	۱۸۹
۵۲	حمید الماس	مغنی تبسم	۱۹۱
۵۳	وحید گلکنڈوی	خواجہ حمید الدین شاہد	۱۹۳
۵۴	خمار انصاری	مغنی تبسم	۱۹۵
۵۵	قمر ساحری	خواجہ حمید الدین شاہد	۱۹۶
۵۶	سعادت نظیر		۱۹۸
۵۷	متین سروش	ابو محمود	۲۰۰
۵۸	خواجہ حمید الدین شاہد	مغنی تبسم	۲۰۲
۵۹	راشد آذر	شاذ تمکنت	۲۰۴
۶۰	شاہد صدیقی	محمد سعادت اللہ خاں	۲۰۶
۶۱	سلیمان اریب	عالم خوندمیری	۲۰۸
۶۲	بشیر النساء بیگم بشیر	نصیر الدین ہاشمی	۲۱۲
۶۳	احمد معین الدین بزمی	—	۲۱۴
۶۴	کچھ غزل کے بارے میں	زینت ساجدہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی	۲۱۶

محمد منظور احمد

اِدارِیہ

یہ دسمبر ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ ہم نے اُسوقت کے صدر مدرس جناب رادھیکا پرشاد صاحب کے آگے یہ تجویز رکھی تھی کہ اب کی بار "نورس" کا "غزل نمبر" شائع کیا جائے تو مناسب ہوگا۔ ساتھ ہی اُنکے سامنے اس "غزل نمبر" کا سرسری خاکہ پیش کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ "نورس" کا یہ "غزل نمبر" دکن کے غزل کہنے والے شعراء کے "تذکرہ" کی نوعیت کا ہوگا جسمیں اُردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ سے لیکر موجودہ دور تک کے غزل کہنے والے شعرا کی زندگی کے اہم واقعات اُنکے کلام پر تبصرہ اور بطور نمونہ انکی دو دو یا تین تین منتخب غزلیں یا منتخب غزلیں نہ ملنے کی صورت میں یا ان کی مختلف غزلوں کے منتخب اشعار پیش کئے جائیں گے۔

خوشی کی بات ہے کہ جناب رادھیکا پرشاد صاحب نے اس تجویز کو منظور فرمایا اور کام شروع کرنیکی اجازت عطا فرمائی۔ لیکن یہ کام ابھی ابتدائی مرحلوں سے گذر رہا تھا کہ صدر مدرسہ کا تبادلہ سٹی کالج کی گزیٹیڈ مددگاری پر عمل میں آیا اور آپ کی بجائے جناب محمد حمید الدین صاحب مددگار ہمہ مقصدی ہائی اسکول ہنمکنڈہ بہ حیثیت صدر مدرسہ تشریف لائے۔ خدا کا شکر ہے کہ نئے صدر مدرسہ نے نہ صرف اس غزل نمبر کے کام کو جاری رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی بلکہ آپ نے اس صبر آزما کام کے ہر کٹھن مرحلہ پر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔ واقعہ یہ ہے کہ محترم صدر مدرسہ کی فراخدلانہ اعانت کے بغیر ہم اس مشکل کام سے قطعاً عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تھے۔ اس اعانت اور حوصلہ افزائی کیلئے ہم صدر مدرسہ کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

چونکہ "نورس" طلبائے مدرسہ کا ترجمان ہے اور ہر سال اس میں ہماری درسگاہ کے طلبا کے مضامین ہی زیادہ تر شائع ہوتے رہے ہیں۔ اسلئے اب کی بار بھی مختلف عنوانوں پر طلبا کے (۲۴) مضامین کو اس شمارہ میں سب سے پہلے جگہ دیگئی ہے تاکہ دیگر طلبا میں بھی مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہو اور اس طرح "نورس" کی اشاعت کا مقصد پورا ہو۔

اب جبکہ "غزل نمبر" کی ترتیب کا کام تقریباً مکمل ہو چکا ہے اور "نورس" کا یہ چھٹا شمارہ آپکی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، ہم اس خصوصی نمبر کے تعلق سے دو ایک باتوں کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں

پہلی بات اور غالباً سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اس "غزل نمبر" کو دکن کے شعرا کی حد تک محدود کرنیکا سبب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم زبان یا ادب کے بارے میں عصبیت کی بناء پر شمال، جنوب، مشرق و مغرب کی اصطلاح میں سوچتے ہیں! بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ شمالی ہند کے شعرا کو بھی اگر اس میں شامل کر لیا جاتا تو کام کی وسعت بہت بڑھ جاتی اور پھر ہمیں کافی بڑی تعداد میں قلمی معاونین کا تعاون حاصل کرنیکی کوشش کرنی پڑتی مزید برآں اس قسم کے "غزل نمبر" کی ضخامت بھی کہیں سے کہیں پہنچ جاتی حقیقت یہ ہے کہ نہ ہم اتنے زیادہ لکھنے والوں کا تعاون بآسانی حاصل کر سکتے تھے اور نہ ہمارا ادارہ اسقدر ضخیم رسالہ کی ترتیب کا خرچ برداشت کر سکتا تھا۔ اسکے علاوہ نقوش (لاہور) کے شاندار "غزل نمبر" کے بعد شمالی ہند کے شعرا کا تذکرہ ایک بے معنی سی بات بھی ہوتی۔

بہرحال ہم نے کچھ تو کام کی نوعیت و وسعت اور کچھ اپنی مالی حالت کے پیش نظر صرف دکن کے غزل کہنے والے شعرا کا تذکرہ شائع کرنے پر اکتفا کیا۔ اسکے علاوہ چند قلمی معاونین اور شعرا کی تصویریں بھی جنکے بلاک بآسانی ہمیں مل سکے شکریہ کیساتھ اس نمبر میں شائع کیجا رہی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ چند اہم غزل گو شعرا ہماری خواہش اور کوشش کے باوجود اس غزل نمبر میں جگہ نہ پا سکے بعض مضمون نگاروں نے ان اہم شعرا پر لکھنے کا قطعی وعدہ فرمایا تھا لیکن آخر وقت تک انکا یہ وعدہ تشنۂ تکمیل نہ ہو سکا۔ بعض ایسے نوجوان شعرا کو اس نمبر میں جگہ دیگئی ہے جن سے حیدرآباد کی ادبی دنیا کچھ زیادہ متعارف نہیں ہے پھر بھی چونکہ انکے شعر کہنے کی صلاحیت انکی شاعری کے روشن مستقبل کا پتہ دیتی ہے اسلئے ہم نے ایسے شاعروں کو بھی اس خصوصی نمبر میں شامل کر لیا ہے۔ اس "غزل نمبر" کے ترتیب دینے میں جامعہ عثمانیہ نظام کالج سٹی کالج چادر گھاٹ کالج اردو کالج اور کلیہ اناث کے لکچراروں ریڈروں اور پروفیسروں کے علاوہ حیدرآباد کی ادبی دنیا کی بعض ممتاز شخصیتوں نے قلمی تعاون فرمایا۔ اسکے لئے ان تمام حضرات کا دلی شکریہ ادا کیا جاتا ہے ہم جناب محمد اکبرالدین صاحب صدیقی، جناب مغنی تبسم صاحب، جناب خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد، جناب سعادت نظیر صاحب اور جناب سید محمد صاحب کے شکر گذار ہیں کہ ان حضرات نے اس غزل نمبر کے ترتیب دینے میں ہماری مدد فرمائی۔ جناب محمد اکبرالدین صاحب صدیقی اور جناب مغنی تبسم صاحب بطور خاص ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کام کی تکمیل کے آخری مرحلہ تک ہماری اعانت فرمائی۔

ہم جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کے بھی شکر گذار ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ہماری درخواست پر ادارۂ ادبیات اردو سے بہت سے قدیم و جدید شعرا کے بلاکس عاریتاً عنایت فرمائے۔

ہم پھر ایک بار محترم صدر مدرس کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انکے پاکیزہ ادبی ذوق اور دلی تعاون کی بدولت "نورس" کے اس "غزل نمبر" کی اشاعت عمل میں آسکی۔

"نورس" اب کی بار غیر معمولی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کیلئے ہم طلباء، اساتذہ، صدر مدرس اور دیگر قارئین سے معافی کے خواستگار ہیں۔

ہمارے صدر مدرس

جناب محمد حمید الدین صاحب

بی - یس - سی - ایم - ایڈ (عثمانیہ

"قطرہ سے گہر ہونے تک"

شیخ جلیل متعلم دہم (ب)

قدرت نے انسان کو اچھے اور برے جذبات عطا کئے ہیں اچھے جذبات کی بدولت انسانی زندگی دلکش اور خوشگوار ہوتی ہے انہی جذبات نے انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی میں اہم حصہ ادا کیا ہے۔

جذبات ہر انسان کو عطا کئے گئے ہیں ان کی تہذیب اور ان کا صحیح استعمال انسان، علم کی مدد سے کرتا ہے، دنیا کے سب ہی بڑے لوگ پیدائشی طور پر بڑے نہیں تھے ان میں اکثر اپنی محنت استقلال اور دھن کی بدولت نہ صرف اپنے خاندان اور سماج بلکہ دنیا میں شہرت اور ناموری کی بلندی تک پہنچے۔

قطرہ سے گہر ہونے تک سے مراد معمولی درجہ سے اعلیٰ مقام تک پہنچنا ہے، طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ آج ہم معمولی حیثیت کے حامل ہیں۔ یعنے ہماری زندگی سمندر میں قطرے کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن اگر ہم خلوص دل سے یہ چاہتے ہیں کہ قطرے کے درجہ سے ترقی کرکے گہر یعنے موتی کا مقام حاصل کریں تو پھر ہمیں ان منزلوں سے گذرنے کیلئے تیار رہنا پڑیگا جن کا سامنا ہمیں قطرے سے گہر ہونے تک لازمی طور پر کرنا پڑتا ہے

طالب علمی ہی کے زمانے میں ہمیں اپنے مستقبل کو درخشاں بنانے کی فکر کرنا چاہیئے۔ جو لوگ بچپن، نوجوانی، بلکہ جوانی میں بھی ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے سخت جد وجہد اور لگاتار محنت کرنے سے جی نہیں چراتے وہ یقیناً قطرے سے گہر بننے کا حق رکھتے ہیں قدرت ان کی محنت کوشش، استقلال، بلند ہمتی اور بلندی خیال کا انعام، کامیابی کی صورت میں انہیں دیتی ہے اور یہ ایسے لوگ سماج میں ایک باعزت مقام حاصل کرتے ہیں۔

ہم طالب علم ہیں۔ اس لئے اگر ہم سماج میں باوقار مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ حصول علم کا سچا شوق اپنے آپ میں پیدا کریں ایک اعلیٰ نصب العین ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہے، اور اس کے حاصل کرنے کے لئے مجنوں کی طرح دھن کے پکے ہوں۔ دنیا کی کوئی مصیبت، آفت، پریشانی، رکاوٹ بلکہ ناکامی بھی ہمیں پست نہ کرسکے۔ قطرے سے گہر ہونے یعنے معمولی مقام سے بلند درجہ حاصل کرنے کا شوق ہمارے سر میں اس طرح سما جائے کہ کوئی دوسرا خیال ہمارے دماغ میں راہ نہ پاسکے اور ہم استقلال سے اپنی زندگی فرض کی ادائی کیلئے وقف کردیں۔ بس اسی طرح ہمیں عزت ملے گی اور ترقی کرکے ایک نہ ایک دن ہم سماج میں اونچا مقام حاصل کرسکیں گے، بے شک مصیبتوں کے چکر ہی سے گذر کر انسان کی زندگی دوسروں کے لئے قابل رشک بنتی ہے

"قطرہ آغوش تلاطم میں گہر بنتا ہے"

مشاہیر کا اثر

مرزا اسمٰعیل بیگ
متعلم دہم (الف)

مشاہیر قوموں کا کیرکٹر سانچے میں ڈھالتے ہیں وہ اپنے کیرکٹر کی قوت سے اپنی قوم اور ملک کے افراد کو ترقی کرنے پر مائل کرکے ہر طرح کی اعانت کرتے ہیں چونکہ انسان فطرتاً نقال واقع ہوا ہے اس لئے وہ دوسروں کو جو کچھ کرتے دیکھتا ہے وہی خود کرنے لگتا ہے۔ نیک اور کامیاب زندگی بسر کرنے والے لوگ دوسروں کیلئے مشعل ہدایت ہوتے ہیں پاکبازوں کی مثال

ہم کو نیک بنا دا اور بدکاروں کی مثال ہم کو سیہ کار بننے کی ترغیب دیتی ہے، ہمارے اوّل معلم والدین اور پھر ہم سبق طلبا اور اس کے بعد اساتذہ ہوتے ہیں

لیکن بعض انسان مامور من اللہ ہوتے ہیں ان کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے وہ بنی نوع انسان کو حق و صداقت کی تلقین کرتے ہیں)، اور ان میں پائی جانے والی تمام خرابیوں کی اصلاح کرکے انھیں نیک بنا دا اور پاکباز بناتے ہیں، ان کو نبی، رسول اور اوتار کہتے ہیں، مثلاً حضرت آدمؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰ، آنحضرت صلعم، گوتم بودھ، رام چندر جی وغیرہ، وہ اپنی روحانی قوت اور ربانی امداد سے قوموں کی زندگی کی کایا پلٹ کر دیتے ہیں

مشاہیر اپنے ملک کیلئے مایۂ ناز ہوتے ہیں وہ اپنی قوم کو بام عروج پر پہونچاتے ہیں ہر قوم اپنے مشاہیر کی مرہون منت ہوتی ہے کیوں کہ یہ پُر خلوص انسان اپنی قوم کی صرف اصلاح ہی نہیں کرتے بلکہ اُسے غیر ممالک کے باشندوں کی نظر میں معزز اور ممتاز بنا دیتے ہیں، ہندوستان کے سماجی اور سیاسی رہنماؤں میں سر سیّد احمد خاں، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، راجہ رام موہن رائے، ودیا ساگر، تلک، گوکھلے، گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی قوم اور ملک کی فلاح اور ترقی کے لئے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

مشاہیر کی زندگی سے ان کی حیات میں لوگ سبق حاصل کرتے ہیں اور ان کے انتقال کے بعد ان کے روشن کارنامے صدیوں تک آنے والی نسلوں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیتے ہیں۔

نیوٹن

محمد قاسم تاج صدیقی
متعلم دہم الف

نیوٹن کو کون نہیں جانتا۔ ریاضی اور سائنس دونوں مضامین پر اس کے عظیم ترین احسانات ہیں جو رہتی دنیا تک اس کی یاد باقی رکھیں گے۔ ہمیں چاہیئے کہ ایسے انسان اعظم کی سوانح سے بے خبر نہ رہیں، اس کے طالب علم شوق کتب بینی وہمت و استقلال کو پیش نظر رکھکر علم حاصل کرنے کا دیوانہ وار شوق اپنے دل میں بھی پیدا کریں۔

نیوٹن اس زمانہ میں پیدا ہوا جبکہ اگست ۱۶۴۲ء میں پارلیمنٹ کے سامنے چارلس کے پیرلر کھڑا گئے تھے۔ برطانوی عوام سیاسی و سماجی کشمکش میں مبتلا تھے کسے معلوم تھا کہ ان حالات میں ایک غیر معمولی ذہانت کا لڑکا نشو نما پا رہا ہے جو آگے چل کر اپنی سائنسی و ہندسی تحقیقات کے ذریعہ بنی نوع انسان کی بہت بڑی خدمت انجام دینے والا ہے۔

۲۵۔ ڈسمبر ۱۶۴۲ء کو دا زاق، اسحاق، آئزاک، نیوٹن ایک غیر معروف مگر کھاتے پیتے گھرانے میں یتیم پیدا ہوا۔ ۱۶۴۵ء میں اس کی ماں سے ایک پڑوسی پادری "برنا باس اسمتھ" نے بیاہ کرلیا۔ نیوٹن اپنی دادی کے آغوش میں پرورش پا رہا تھا۔ اپنے ماموں "ڈبلیو ایکف" کی سرپرستی

ہیں اس نے گانتوں کی تعلیم بارہ سال کی عمر میں ختم کر کے کنگس اسکول میں شرکت حاصل کرلی ۔ اس اسکول کی اُس جماعت کی چھت میں جہاں نیوٹن نے تعلیم حاصل کی تھی، نیوٹن کا نام اور دستخط کھدے ہوئے ہیں۔ جن کی اب تک نگہداشت کی جارہی ہے

نیوٹن اپنی تعلیم کے دوران میں معمولی قسم کی ذہنی اور جسمانی قوتوں کا حامل سمجھا جاتا رہا ۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے نام کو روشن کر دیا ۔ اس کا موقع اسے یوں حاصل ہوا کہ نیوٹن میں شروع شروع کسی کھیل یا مضمون میں اپنے ساتھیوں سے بڑھ جانے کا جذبہ مفقود تھا ۔ حالانکہ اس میں بے پناہ مخفی اور خوابیدہ قوتیں پوشیدہ تھیں، جنھیں صرف جگانے کی ضرورت تھی ایک مرتبہ جماعت کے سب سے ہوشیار اور ذہین طالب علم نے نیوٹن کو ستایا ۔ نیوٹن نے بدلہ لینے کی ٹھانی ۔ ایک دن زور شور کے ساتھ مقابلہ ہوا ۔ نیوٹن نے دل کھول کر بدلہ لیا جب امتحان ہوا اور نتیجہ نکلا تو نیوٹن کا حریف سب میں اوّل تھا ۔ اب نیوٹن کی خفیہ ذہنی استعداد اور امنگوں کے جاگنے کی باری آئی ۔ اس نے ارادہ کیا کہ تعلیم کے میدان میں بھی اسے نیچا دکھائے گا ۔ آخر کار اگلے سال کے امتحان میں اس کا نام سرفہرست تھا اسی عزم نے نیوٹن کو اس درجہ پر پہنچا دیا کہ جہاں خود اسکول کے لئے نیوٹن کی ذات "مایۂ صد افتخار" بن گئی سنہ ۱۶۵۶ء میں اس کا سوتیلا باپ بھی چل بسا نیوٹن کو کاروبار سنبھالنا پڑا ۔ لیکن اسے زراعت اور خرید و فروخت سے مطلق دلچسپی نہ تھی، اس لئے اس نے اپنے مطالعہ کو جاری رکھا ۔ جلد ہی ان بکھیڑوں سے پیچھا چھڑا کر سنہ ۱۶۵۸ تا ۱۶۶۱ء گرانتھم میں مقیم رہا ۔ جہاں اس نے کیمبرج میں شرکت کی اسکی امتحانی تیاری سے اور غور و خوض سے اسکی مقامی شہرت بڑھ گئی، اور جب وہ وہاں سے رخصت ہو رہا تھا تو اس کے اعزاز میں ایک وداعی جلسہ کیا گیا ۔ ۵ جون سنہ ۱۶۶۱ء میں ۱۹ سالہ نیوٹن نے ٹرینیٹی کالج کیمبرج میں داخلہ حاصل کرلیا اور یہیں سے اس کی عمر کا وہ زرین دور شروع ہوتا ہے، جب اس نے مکمل طور پر سائنس اور ریاضی پر تحقیقات کے لئے وقف کر دیا تھا ۔

اگرچہ گانتوں کے مدرسہ میں اس کی علمی حالت کے متعلق اچھے خیالات پائے جاتے تھے ۔ لیکن اس نے دیکھا کہ دوسرے لڑکوں کے مقابلہ میں اسے ریاضی میں سخت محنت کی ضرورت ہے اس کے ذہنی ارتقاء کا حال رفتہ رفتہ اس کے اساتذہ پر واضح ہونے لگا کئی مرتبہ اس کی صلاحیت ظاہر ہوئی وہ ایسے عنوانات پر بھی استادانہ مقالات لکھ سکتا تھا جو کسی بڑے لیکچرار یا وسیع مطالعہ رکھنے والے شخص کی ذہنی پیداوار ہو سکتے ہیں "کپلر" کی کتاب "علم مناظر" کا مطالعہ کیا پھر اس نے فلکیات کی کتاب کا مطالعہ کیا ۔ اور محسوس کیا کہ وہ علم ہندسہ میں نہایت کمزور ہے اس لئے اس نے اقلیدس کی کتابوں کا مطالعہ کیا پھر اس کے ٹیچر بارو "Barrow" نے اپنی کتاب

لکھا جائے گا۔ اور انسانیت کو ہمیشہ ہمیشہ نیوٹن پر فخر رہے گا۔

آزادی کی خاطر

عبدالغفار متعلم دہم (ب)

جد وجہد آزادی ہند کے سلسلے میں جن لوگوں نے اپنی جانیں نثار کی ہیں ان کے کچھ حالات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱۸۵۶ء میں لارڈ کیننگ جب گورنر جنرل مقرر ہوا اور لندن سے چلتے وقت اس نے حسب دستور جو تقریر رخصتی ضیافت کے موقع پر کی تھی اسے بعد کے واقعات نے یادگار بنا دیا ہے۔ کیننگ کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا اسے ہندوستان میں آئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ملک میں وہ ہنگامۂ قیامت برپا ہوا جسے عام طور پر غدر ۱۸۵۷ء کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس غدر میں زیادہ تر وہ ہندوستانی سپاہی شریک تھے جو انگریزوں سے برگشتہ ہو گئے تھے

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ان ہندوستانی سپاہیوں نے انگریز افسروں کو قتل کرنا شروع کیا اور تمام اسلحہ اور ساز و سامان پر قبضہ کر کے انھوں نے دہلی کی طرف دھاوا بول دیا۔ اور دہلی کے لال قلعہ میں جو انگریز موجود تھے انھیں تہہ تیغ کر دیا۔

اس زمانے میں بہادر شاہ ظفر دہلی پر حکومت کر رہا تھا۔ دہلی میں ہنگاموں کے ساتھ ساتھ، میرٹھ آگرہ، الہ آباد، پشاور، جھانسی میں بھی بغاوت

"مبادیات اقلیدس" شائع کی تو اسے ریاضی کا شوق ہوا۔ ۱۶۶۱ء میں ایک اسکالرشپ کے لئے مقابلہ ہوا جس میں ممتحن نے اپنی رائے نیوٹن کے حق میں دی لیکن علم ہندسہ میں اس کی کم معلومات کا اظہار کیا۔

نیوٹن نے چوبیس سال کی عمر میں دو مشہور عالم مضامین کائناتی تجاذب اور احصا پر اپنی تحقیقات شائع کر دیں، اٹھائیسویں سال میں اس نے طیف اور رنگ کی ماہیت پر اپنی تحقیقات مکمل کر لی۔ تیسویں سال سے پہلے ہی اس نے مسئلہ ثنائی تفریقی احصاء رنگ کی ماہیت طیف اور منشوروں پر تجربات مکمل کئے۔ اس طرح وہ ابتدائے عمر ہی سے ایک ایسی راہ پر گامزن تھا جو پوری دنیا سے اوس کی قابلیت اور ذہانت اور صلاحیت کا لوہا منوانے والی تھی۔

آخر کار ایسی مفید اور اہم زندگی خاتمہ کے قریب پہنچنے لگی۔ اسے اپنا آخری لمحہ زندگی نزدیک محسوس ہونے لگا۔ لیکن اس کی تحقیقات بند نہیں ہوئی۔ اگست ۱۷۱۶ء میں اس کی جسمانی حالت بہت خراب ہو گئی اس نے اپنا آخری وقت اپنے آبائی مکان میں زیادہ تر پڑھنے خصوصاً انجیل کی تلاوت میں صرف کیا۔ ۲ مارچ ۱۷۲۷ء میں "رائل سوسائٹی" کی صدارت کے لئے اس نے لندن کا سفر کیا۔ بالآخر ۲۰ مارچ ۱۷۲۷ء میں اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔

نیوٹن نے برطانیہ اور دنیا کی ریاضیاتی اور سائنسی زندگی پر جو اثر چھوڑا ہے وہ تاریخ میں زریں حروف سے

کی آگ پھیل گئی۔ ہندوستانی سپاہی انگریزوں کی ناانصافی اور بری حکمت عملی سے ناراض تھے اس لئے انھوں نے اس انقلاب کا استقبال کیا ان کے لیڈروں نے کنول کے پھول کو اپنا نشان انقلاب بنایا اور کنول کے پھول کی تقسیم عمل میں آئی۔ اس طرح بغاوت کی لہر سارے شمالی ہند میں دوڑ گئی۔ یہ طے ہوا تھا کہ ۳۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو تمام ملک ہند میں ایک ساتھ بغاوت کر دی جائے اور انگریزی فوج کو ہٹا کر ملک میں آزادی کا اعلان کر دیا جائے۔

دلی میں بہت سے بددل اور ناراض لوگوں نے باغیوں کا ساتھ دیا اور باغی سپاہیوں کی سب سے زیادہ تعداد دلی میں جمع ہوئی جہاں انھیں یہ آرزو کھینچ لائی تھی کہ بہادر شاہ ظفر کو ہندوستان کا شاہنشاہ بنا دیا جائے۔ شہر دلی فتح ہو گیا۔ تانتیا توپی اور جھانسی کی رانی نے انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ جھانسی کی رانی کی بہادری بے مثال رہی۔ لیکن ۱۸۵۹ء میں تانتیا توپی کو کسی رازدار نے دغا دیکر گرفتار کرا دیا اور اُسے پھانسی دے دی گئی۔ پھر بغاوت پر قابو پانے کے بعد انگریزوں نے بہادر شاہ کو قید کر کے رنگون بھیج دیا۔ جہاں وہ ۱۸۶۲ء میں ۸۷ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہونے کے بعد ہندوستان کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے سپوتوں کی توجہ ملک کی آزادی حاصل کرنے کی طرف مبذول ہوئی اس تحریک میں اعتدال پسند لیڈروں میں دادا بھائی نوروزجی فیروز شاہ مہتا، گوپال کرشن گوکھلے [illegible]ں طور پر قابل ذکر ہیں یہ سب چاہتے تھے کہ انگریزی عملداری کے تحت ہندوستان آہستہ آہستہ ترقی کرے۔ تقسیم بنگال کی تحریک کے بعد کانگریس میں انتہا پسند لیڈروں نے زور پکڑنا شروع کیا۔ بال گنگا دھر تلک، بپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے نے اہل ہند میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

لیکن ہندوستان کی سیاسی حالت میں سب سے بڑا انقلاب اس دن شروع ہوا جب گاندھی جی نے یہاں کی سیاست میں قدم رکھا ان کی ابتدائی زندگی جنوبی افریقہ میں گذری انھوں نے ہندوستانیوں کیلئے حق حاصل کرنے کے لئے ستیاگرہ طریقہ کو پہلی بار استعمال کیا اور بڑی حد تک کامیابی حاصل کی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد انگریزی حکومت نے ہندوستانیوں پر زیادتیاں کیں ان سے گاندھی جی کو یقین ہوا کہ جب تک ان انگریزوں سے ترک موالات نہ کیا جائے اس وقت تک ملک کو آزادی نہیں مل سکتی۔ اس تحریک میں بہت سے لوگ شریک ہو گئے اس اثناء میں گاندھی جی کو جیل کی سختیاں برداشت کرنی پڑیں اُنھوں نے کہا کہ جب تک ہندوستان کو بدیسی سامراج سے آزادی حاصل نہ ہوگی اس وقت تک یہ دنیا کی نظروں میں عزت حاصل نہیں کر سکتا۔

۱۹۱۹ء میں جلیان والا باغ کا حادثہ پیش آیا جہاں نہتے عوام کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اور ہزاروں آدمی مارے گئے۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے آزادی کی قرارداد پاس کرنے کے لئے جدوجہد کی اور سنہ ۱۹۳۰ء میں ستیہ گرہ شروع کر دی۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں حکومت ہند نے ایک قانون بنایا اس قانون کے ذریعہ بہت سے اختیارات ہندوستانیوں کو دیئے گئے سنہ ۱۹۳۷ء میں کانگریس نے آٹھ صوبوں پر اپنی حکومتیں قائم کیں، جیسے بنگال، یوپی، بمبئی، مدراس وغیرہ دوسری جنگ عظیم کے بعد انگلستان کی حکومت نے سوچا کہ ہندوستان سے اپنی فوجیں واپس بلا لینا چاہیئے اس ملک کے رہنے والوں کو اس بات کا موقع دینا مناسب ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق حکومت قائم کریں، چنانچہ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ سے بات چیت کے بعد یہ طے ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان کی علیحدہ علیحدہ حکومتیں بنا دی جائیں۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ملک کی تقسیم عمل میں آئی اور اس کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کا اعلان کر دیا گیا اور ہندوستان کے مایہ ناز نیتاؤں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آئی، ابھی آزادی کی خوشیاں پایہ تکمیل کو نہ پہنچی تھیں کہ اہل ہند کو پھر ایک غمناک واقعہ کا سامنا کرنا پڑا۔ گاندھی جی جنھوں نے آزادی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو جب وہ پراتھنا کے لئے برلا ہاؤس جا رہے تھے تو راستہ میں ایک شخص نے انھیں گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اس المناک حادثہ سے تمام دیس باسیوں کو سخت صدمہ پہنچا۔

گاندھی جی نے پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنا جانشین بنایا تھا۔ بھارت دیس کے پہلے صدر بابو راجندر پرشاد بنائے گئے۔ جو مہاتما گاندھی کے پرانے ساتھیوں میں سے ہیں ہمارے دیس کی خوش قسمتی ہے کہ آزاد ہند کا وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو ہم میں موجود ہے وزیر اعظم ہونے کی حیثیت سے ملک کے انتظام کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہے ان کی قابلیت دانشمندی اور سچائی نے ہمارے ملک کے مرتبہ کو دنیا کی نظروں میں اونچا کر دیا ہے۔

ہمارے وزیر اعظم

تلسی پرشاد متعلم
ہشتم (ب)

دنیا کی تاریخ میں بڑے بڑے عالموں، راجاؤں، بہادروں کے نام ملتے ہیں، لیکن دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کی فہرست تیار کی جائے تو پنڈت جواہر لال نہرو کا نام سر فہرست رہے گا آج نہ صرف ہندوستان کا بلکہ دنیا کا ہر آدمی پنڈت نہرو کو جانتا ہے۔ انھوں نے جو حال ہی میں مختلف ممالک کے دورے کئے ہیں ان سے ان کی شہرت کا واضح ثبوت ملتا ہے روس کے لوگوں نے ان کا استقبال کرنے کیلئے سڑکوں کو گلاب کے پھولوں سے ڈھانک دیا چین کے لوگوں نے اس طرح محبت کا برتاؤ کیا

جس کی مثال نہیں مل سکتی، ملک عرب میں ان کو "امن کا پیامبر" پکارا گیا۔

پنڈت نہرو ۱۴ - نومبر ۱۸۸۹ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام موتی لال تھا آپ ہندوستان کے مشہور وکیلوں میں سے ایک تھے، پنڈت جواہر لال نہرو کو بارہ سال کی عمر میں پڑھنے کے لئے لندن بھیجا گیا۔ لندن سے بیرسٹر بن کر ہندوستان واپس آئے اس وقت گاندھی جی کی نگرانی میں ہندوستانی لوگ آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ جواہر لال نہرو نے اپنا کام شروع کرنے کے بجائے آزادی کی لڑائی میں حصہ لینا شروع کیا۔ کئی بار ان کو جیل بھیجا گیا۔ ان ہی دنوں میں ان کی شادی "کملا" نامی ایک لڑکی سے ہو گئی۔ یہ بہت نیک خاتون تھیں۔ میاں بیوی دونوں مل کر ملک کی آزادی کے لئے لڑتے رہے کچھ عرصہ کے بعد آپ کو "اندرا" نام لڑکی پیدا ہوئی، اس کے بعد ایک لڑکا تولد ہوا۔ جو سات دن کے بعد انتقال کر گیا تھوڑے دنوں کے بعد آپ کی بیوی بیمار ہو گئیں۔ علاج کے لئے سوئزر لینڈ بھیجا گیا لیکن وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ اتنا غم سہہ کر بھی جواہر لال نہرو ملک کی آزادی کے لئے لڑتے رہے

ایک مرتبہ کسی نے آپ سے دوسری شادی کر لینے کو کہا، جواہر لال جی نے کہا "میں نے شادی ملک سے کر لی" پنڈت نہرو نے ملک کی آزادی کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا۔ پولس کی لاٹھیاں سہیں، بھوکے پیاسے رہے دھوپ میں جلتے رہے، بارش میں بھیگتے رہے لیکن اپنے ارادے میں اٹل رہے۔ آخر کار انگریزی سرکار کو گھٹنے ٹیکنا پڑا اور ہندوستان نے سیاسی آزادی حاصل کی۔ آزادی کے بعد آپ کو بھارت کا وزیر اعظم بنایا گیا۔ تب سے آپ ہمارے ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

نہ صرف جواہر لال بلکہ ان کے سارے خاندان نے اپنے آپ کو ملک پر سے قربان کر دیا۔ موتی لال نہرو نے جو پہلے انگریزی لباس استعمال کرتے تھے انگریزی لباس کی ہولی جلائی اور کھدر کے کپڑے پہننے لگے۔ آپ کی والدہ سروپ رانی بھی ملک کی خدمت کرتی تھیں۔ وجئے لکشمی پنڈت جو آپ کی بہن ہیں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی صدر رہ چکی ہیں۔ یہ اعزاز صرف قابل ترین آدمی کو حاصل ہوتا ہے، آج کل وجئے لکشمی لندن میں ہندوستان کی ہائی کمشنر ہیں۔

جواہر لال نہرو ایک بہادر اور اعلیٰ پایہ کے سیاست داں ہیں آپ ہمیشہ مصیبتوں سے کھیلتے رہے مصیبت نے آپ کی حوصلہ افزائی کی ہے، آپ انگریزی زبان کے مشہور مصنف بھی ہیں، آپ نے کئی کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے "ہندوستان کی کھوج" "میری کہانی" "دنیا کی تاریخ" ایک

ٹھملکسٹ، وغیرہ ساری دنیا میں مشہور ہیں۔
آپ کی رہبری میں ہندوستان ترقی کے راستہ پر گامزن ہے گذشتہ دس سال میں ہمارے ملک نے جو ترقی کی ہے بلاشبہ قابل تعریف ہے کچھ عرصہ پہلے آپ نے اپنی قوم کو "آرام حرام ہے" کا نعرہ دیا تھا وہ خود بھی بہت کام کرتے ہیں۔ رات کے دو دو بجے تک آپ کے دفتر کی بتی جلتی رہتی ہے۔ کوئی اخبار روزانہ کا ایسا نہیں جس میں ان کی کسی نہ کسی مصروفیت کی اطلاع شائع نہ ہوتی ہو خدا کرے کہ ہمارے آزاد خیال وسیع النظر اور کشادہ دل وزیراعظم ملک و قوم کی خدمت کے لئے عرصہ دراز تک زندہ رہیں۔

انسانیت

سید ولی الدین
متعلم دہم الف

انسانیت ایک ایسی صفت ہے جو قوموں کی زندگی بناتی ہے ملکوں کی ترقی کا سبب بنتی ہے انسانیت ہر انسان کو میسر نہیں آتی اگر میسر ہو تو وہ وہ اپنے آپ کو جماعت کا ایک معمولی رکن اور مختلف جماعتوں کو قوم کے مختلف اعضا سمجھتا اور ان کی مناسب و موزوں خدمت کرتا ہے جب قوم کے افراد متحد ہو جاتے ہیں تو وہ کسی کام کو بھی کٹھن نہیں سمجھتے اور ہر جہتی ترقی کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ اقبال نے کیا خوب کہا تھا ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اسی طرح ہر فرد انسانیت کا حامل بن جائے تو قومیں ترقی کریں گی ملک ترقی کریں گے اور ہر فرد اپنا فرض ادا کرنے کا اہل ثابت ہوگا انسان انسانیت کی خوبی کا حامل ہو جانے کے بعد قوم کی خدمت کو اپنا نصب العین قرار دیتا ہے، قوم کے مختلف افراد اور مختلف طبقے کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی صورت میں قوم کی خدمت کرتے ہیں ادیب اور فلسفی اپنی گہری فکر و نظر کے ذریعہ زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھاتے ہیں۔
عملی خدمت کرنے والوں میں ملک کے رہنماؤں کو اعلیٰ مقام حاصل ہے ایک شخص جو رہنما بن کر اپنی زندگی کو سلاخوں کے پیچھے گذارتے ہوئے حق و صداقت پر چلتا ہے تو اس کو قوم میں اونچا درجہ حاصل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ ایثار و قربانی کے ذریعہ ہی انسانیت کی مثال دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ پس ایک معمولی انسان کو بلندی پر پہونچانے میں جو چیز کارگر ہوتی ہے وہ اس کی قومی خدمت ہے ہمارے ملک کے ممتاز رہنماؤں کو پیش نظر رکھیئے ان میں بہت سوں نے اپنا بچپن، لڑکپن اور نوجوانی یا طالب علمی کا دور اطمینان سے گذارا ہے اگر وہ ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھتے اور عوام کے رہنما نہ بنتے تو ان کی زندگی بہر حال گذر جاتی لیکن وہ لازوال شہرت کہاں حاصل ہوتی جو ان کی بے لوث قومی خدمت کی بدولت انھیں آج حاصل ہوئی ہے

جلسہ وداعی جناب رادھیکا پرشاد صاحب سابق صدر مدرس (۱۷-۲-۱۹۵۸ء)

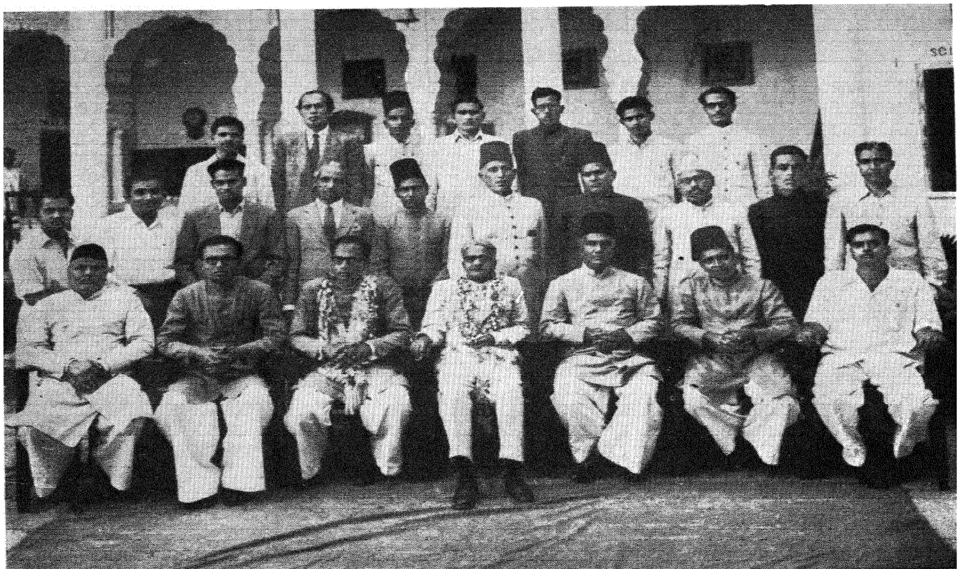

بیٹھے ہوے دائیں سے بائیں:- مسٹر وسنت راو-محمود حسین صاحب-سید جعفر علی صاحب-جناب رادھیکا پرشاد صاحب سابق صدر مدرس
جناب محمد حمید الدین صاحب صدر مدرس-محمد منظور احمد-محمد انور خاں صاحب-

کھڑے ہوے دائیں سے بائیں:- محمد عبد الکریم صاحب-محمد یحیی صاحب؛ ہلکا رمدرسہ-فصیح الدین صاحب-شیخ محی الدین صاحب
سید عباس حسین صاحب-سید عبد الرحمن صاحب-سید عبد الرزاق صاحب فاروقی-مسٹر اے-سریند رکمار-
مسٹر پی-بھاسکر راو-مسٹر یس-راما مورتی

کھڑے ہوے (دوسری صف) محمد سبحان صاحب - مسٹر بی-گوپال راو - فصیح الدین صاحب ریاض - مسٹر شنکر راو -
سید عبد القادر صاحب - مرزا تراب علی بیگ صاحب - مسٹر آر-شنکر یا شاستری

جلسہ کرسی نشینی انجمن اتحاد طلبا
بابتہ ۵۸ — ۱۹۵۷ء

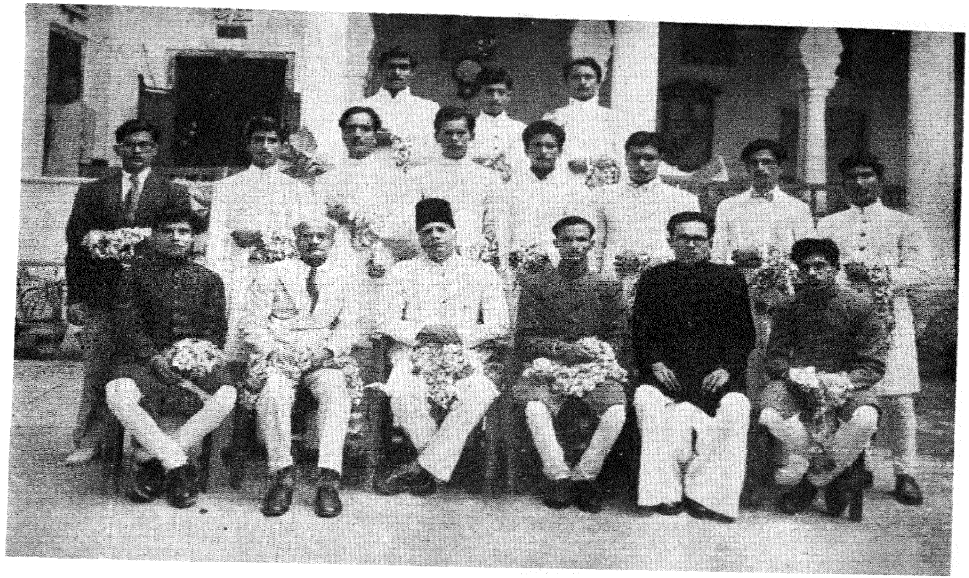

بیٹھے ہوئے

بائیں سے دائیں:- محمد مجیب اللہ متعلم دہم (الف) معتمد انجمن اتحاد جناب راد ھکا پرشاد صاحب صدر مدرس-صدر انجمن اتحاد جناب حبیب الرحمن صاحب معتمد انجمن ترقی اردو حیدرآباد (مہمان خصوصی) — سید احمد متعلم دہم (ج) نائب صدر انجمن محمد منظور احمد مشیر انجمن اتحاد خواجہ غوث الدین متعلم نہم (ج) نائب معتمد انجمن

پہلی صف میں کھڑے ہوئے بائیں سے دائیں:- احمد عبد الواسع-احمد عبد العلیم صدیقی-حمید الحق-زبیر احمد-شیخ غلام دستگیر-سراج الدین خاں — احمد شریف — عروج احمد خاں-

دوسری صف میں کھڑے ہوئے بائیں سے دائیں:— سید غوث احمد الدین — سید حامد محی الدین قادری — غیاث الدین-

اس طرح ایک فرد اپنی زندگی کی تعمیر کرتے ہوئے
قوموں اور ملکوں کا سردار بنتا ہے، دنیا کے مشاہیر
کی طرح اگر ہم بھی اپنے اوپر آرام حرام کرلیں، ذاتی
مفاد کو پس پشت ڈالیں اور بے غرض خدمت کا
مصمم ارادہ کریں تو ہمیں بھی دنیا میں اعلیٰ مقام
حاصل ہوسکتا ہے۔

غرض انسان انسانیت کو اپنی زندگی کا زیور
سمجھے تو وہ اس سرچشمہ سے حاصل ہونے والے
ہزاروں فائدوں سے متمتع ہوسکتا ہے اور اپنے
مستقبل کو درخشاں بنا سکتا ہے۔

زندگی کا ساز

نارائن راج ماتھر
متعلم دہم (ب)

زندگی ایک خواب ہے جیسے تم دیکھ
رہے ہو وقت کی باتیں نرالی ہوتی ہیں ہر ذرّہ رنگ
تبدیل کرتا ہے۔ تغیر ہی کو اس دنیا میں ثبات ہے
جب تک تار کو چھیڑو گے نغمہ نکلے گا، اِدھر
تار ٹوٹ گیا اُدھر نغمہ بند ہم نے کسی پریشان حال
شخص کو دیکھا ہوگا، وقت کی نزاکت، حالات
کی مجبوریوں کا نشانہ، فاقوں کا مارا
بھیانک آنکھیں ۔ آخر ایسا کیوں؟
اس دُنیا میں انسان کو اشرف المخلوقات کہا
گیا ہے اگر ارذل مخلوقات سے تشبیہ دیجاتی
تو کیا ہی اچھا ہوتا وہ دیکھو تڑپتے ہوئے مفلس
انسان کو اسی کے قریب سے بہت سے بے درد
یوں ہی نظر بچائے خاموش گذر جاتے ہیں،
پھر بھی وہ انسان کہلانے کے لایق ہیں؟ کیا وہ
اپنا فرض ادا کر رہے ہیں؟ ایسے ہی روح فرسا
مناظر دیکھ کر میں اکثر سوچنے لگتا ہوں کہ کیا ہی
اچھا ہوتا کہ ہر انسان جانور اور ہر جانور انسان
بن جاتا بے شک دنیا میں تغیرات ہوتے ہیں
لیکن آہستہ آہستہ اگر قدرت جلد بازی سے کام
لے گی تو ہر کس وناکس کو قدرت سے شکوہ رہیگا
اس لئے ہمیں توقع رکھنی چاہیئے کہ آہستہ آہستہ
گندگی صاف ہوگی، برائیاں دور ہونگی انسانیت
صحیح معنوں میں اپنا روپ دکھائے گی، انسان نے
ہمیشہ اعمال کی سزا بھگتی ہے اس نے اپنے کئے کا
پھل پایا ہے کبھی اس نے اپنے عمل سے قدرت کا مذاق
اُڑایا ہے انسان ہوکر انسانیت کا خون کیا ہے
آج وہ اپنے فرض کی طرف سے غافل ہے اور اس
پر دعویٰ ہے ترقی کا۔ غلط راہ پر چلتا ہے، اور
ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے خواب دیکھتا ہے!
اُسے سمجھانا ہے کہ ؎

کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است!

انسان نے بیج بوئے مگر پھوٹ، انتشار اور
مصیبتوں کے غلط اُصول پر عمل پیرا ہونے والے
ہمیشہ خسارہ میں رہتے ہیں، اس قدر صاف بات
بھی سمجھ میں نہ آئے تو عقل کا قصور ہے۔
وقت کی نزاکت پر غور کرو یہ کانفرنس کمیٹیاں
بے سود ہیں، اگر چاہتے ہو کہ امن ہو تو سب سے

ضروری قدم جو کامیابی کا ہے آگے بڑھاؤ اور امن قائم کرو اور اپنے اعمال کی درستی کرو بے لوث محبت پیدا کرو ۔ یہ مذہبی جھگڑے نازیبا حرکات انسانیت کے دامن پر بدنما دھبے ہیں، کلنک کا ٹیکہ ہیں، انھیں دور کرنا چاہیئے آپس میں محبت و انسانیت کا رشتہ قائم رکھنا بیحد ضروری ہے، انسان وہی ہے جس کے دل میں دوسروں کا درد ہو ۔

اگر اب بھی نہ سنبھلے ابھی دور بیں بھی ہوشیار نہ ہوئے تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا ساز سوز میں تبدیل ہوجائے گا، دنیا میں جو تغیرات ہو رہے ہیں ان پر ہمیشہ نظر رکھنی چاہیئے! ٹھوکریں کھانے کے بعد سمجھدار انسان سنبھلتا ہے! لیکن دنیا کے بہت سے ناسمجھ انسان ابھی تک نہیں سنبھلے قدرت آزماتی ہے، اس کی آزمائش میں پورے اُترنا عزم صمیم رکھنے والوں کا حصہ ہے ۔

دنیا کی موجودہ صورت حال قابل حیرت تو نہیں کیونکہ انقلاب زمانہ اس سے قبل ایسے بہت سے لیل و نہار دکھا چکا ہے مگر وقت کے مڑتے ہوئے دھارے پر نظر رکھنا عقلمندی ہے، اس لئے ہم سب کو زندگی کے ساز سے خوشگوار اور دل خوش کن نغمہ سننے کے لئے میدان زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے، اور کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونی چاہیئے جس سے زندگی موت کا راگ گانے لگے ۔ اس کے لئے اگر "آدمیت احترام آدمی" کے اصول کو پیش نظر رکھا جائے تو ساری دنیا میں پائیدار امن قائم ہوسکتا ہے ۔ "جیو اور جینے دو" کا اصول کس قدر پیارا اصول ہے لیکن اس پر سچے دل سے عمل اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہم کشادہ دلی اور وسیع النظری سے کام لیں ۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ ساز زندگی کے تار ہی کہیں ٹوٹ نہ جائیں ۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو!

انصاف

میر سجاد علی
متعلم دہم (ب)

برسات کی ایک اندھیری رات تھی اور چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی احمد اپنے دادا کے کمرے میں بیٹھا تھا اور انھیں کہانی سنانے پر مجبور کر رہا تھا آخر دادا ایک بار زور سے کھانسا، اور اپنی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنا شروع کیا ۔

بہت زمانہ گذرا ملک ایران میں نوشیرواں نامی ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا اس بادشاہ کے کوئی اولاد نہیں تھی جب بادشاہ بوڑھا ہونے لگا تو اس کو اولاد کی زیادہ فکر ہوئی ۔

بادشاہ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اس کے وزیر نے آکر کہا حضور! آپ سے کوئی نجومی ملنا چاہتا ہے ۔ بادشاہ نے کہا بلاؤ! نجومی آیا ۔ اور مودب ہو کر کہنے لگا آپ کے یہاں ایک لڑکی جنم لینے والی

ہے" بادشاہ بہت خوش ہوا لیکن اس کو نجومی
کی بات پر یقین نہ آیا، اور نجومی سے پوچھا کیا
سچ کہہ رہے ہو؟ نجومی نے کہا، جی ہاں سرکار
میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں چنانچہ نجومی کے کہنے کے
مطابق بادشاہ کے محل میں ایک خوبصورت
لڑکی پیدا ہوئی، ملک میں ہر طرف مسّرت کی لہر
دوڑ گئی بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس نجومی کو
انعام و اکرام سے سرفراز کیا غریبوں اور
یتیموں کو کھانا اور کپڑا مفت تقسیم کیا گیا اور
اس لڑکی کا نام "مہ پارا" رکھا گیا لڑکی جب ذرا
بڑی ہوئی تو اسکی تعلیم کے لئے ایک لایق استاد
مقرر کیا گیا لڑکی بہت ذہین تھی زمانہ گذرتا گیا
دن ہفتوں مہینوں اور برسوں میں تبدیل ہوتے
گئے مہ پارا بچپن کی سرحد پار کرکے عالم شباب
میں قدم رکھ چکی تھی۔ بادشاہ کو لڑکی کی شادی
کی فکر ہوئی، چنانچہ اس نے ایک خوبصورت
تعلیم یافتہ باخلاق نوجوان شہزادے کے ساتھ
اس کی شادی کر دی، زمانہ کا چکر چلتا رہا۔ کچھ عرصہ
بعد مہ پارہ کی گود میں ایک حسین لڑکا کھیل رہا
تھا اس لڑکے کو بادشاہ بہت چاہنے لگا تھوڑی
دیر کے لئے بھی لڑکا نظروں سے غائب ہوتا تو
بادشاہ بے چین ہو جاتا تھا ایک دفعہ کا ذکر
ہے کہ گرما کا موسم تھا مسافر درخت کے نیچے آرام
کر رہے تھے پرندے گرمی کی شدت سے ہانپ
رہے تھے ایسے وقت بادشاہ کا چہیتا داماد شکار
کی تلاش میں گھوم رہا تھا، تلاش و جستجو کے بعد ایک
ہرن نظر آیا اس نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا
جب گھوڑا ذرا قریب ہوا تو شہزادہ تیر چلانے ہی
والا تھا کہ ایک دردناک اور دل ہلا دینے والی
آواز آئی شہزادے نے بہت ہی غصے سے گھوڑے
کو روکا پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک غریب کسان
کا لڑکا اس کے گھوڑے کے پیر کے نیچے دب کر
دم توڑ رہا ہے شہزادے نے اس بات کو چھپانے کی
بہت کوشش کی۔ لیکن ایک روز یہ بات بادشاہ
کو معلوم ہوگئی۔ انصاف پسند بادشاہ کا چہرہ غصہ
سے سرخ ہوگیا۔ اور اس حادثے کی تحقیقات
شروع ہوگئی اس نے اپنے داماد اور دوسرے
افراد کو حاضر ہونے کا حکم دیا بادشاہ بہت حیران
تھا کہ فیصلہ کیا کرے فرض اور محبت کی کشمکش تھی
صبح ہوئی اور دوبارہ بادشاہ دربار میں تشریف
فرما ہوا دربار میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وزیر
نے بادشاہ کو تمام واقعات سنائے بادشاہ غور
سے سنتا رہا کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے فیصلہ
سنایا! قاتل کے لڑکے کو جنگل میں ڈال دیا جائے
اور مرحوم کے باپ کو اس گھوڑے پر جس پر قاتل
سوار تھا سوار کیا جائے اور چھوڑ دیا جائے مرحوم
کا باپ اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑائے اور
قاتل کے لڑکے کو کچل ڈالے اس حکم کی تعمیل
کل ہو اور دربار برخاست ہوا۔ یہ حکم سن کر تمام
درباری کانپ اٹھے مگر بادشاہ کی پیشانی پر بل

تک نہیں پڑا، شاہی محل میں کہرام برپا ہوگیا بادشاہ شہزادہ اور شہزادی کی آنکھ کا تارا دوسرے دن رسی سے باندھ کر جنگل میں ڈالا گیا، تھوڑی دیر بعد گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آواز آئی اور اسکے تھوڑی دیر بعد شہزادے کی نعش محل میں لائی گئی"۔

یہ کہتے ہوئے دادا کی آنکھیں آنسوؤں سے پُر ہوگئیں اور انھوں نے ایک آہ کے ساتھ اپنی کہانی ختم کردی، احمد بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ زمانہ قدیم کے لوگ بھی کیسے انصاف پسند ہوا کرتے تھے!

تین چیزیں:—

محمد قاسم تاج صدیقی متعلم دہم (الف)

(۱) تین چیزوں سے محبت کرو۔ ۱۔ شجاعت ۲۔ شرافت ۳۔ مروت
(۲) تین چیزوں سے نفرت کرو۔ ۱۔ ظلم ۲۔ غرور ۳۔ بیوفائی
(۳) تین چیزوں کی عزت کرو۔ ۱۔ مذہب ۲۔ انصاف ۳۔ عمل صالح
(۴) تین چیزوں کے لئے لڑو۔ ۱۔ عزت ۲۔ ملک ۳۔ دوست
(۵) تین چیزوں کے لئے تیار رہو۔ ۱۔ غم ۲۔ زوال ۳۔ موت
(۶) تین چیزوں کو عزیز رکھو ۱۔ عقل ۲۔ پیش بینی ۳۔ استقلال
(۷) تین چیزوں کو چھوڑ دو ۱۔ کاہلی ۲۔ فضول گوئی ۳۔ جلدبازی
(۸) تین چیزوں کو پسند کرو ۱۔ وقت ۲۔ خلق ۳۔ خوش دلی
(۹) تین چیزوں کو اختیار میں رکھو ۱۔ زبان ۲۔ غرض ۳۔ غصہ
(۱۰) تین چیزوں کی آرزو کرو۔ ۱۔ صحت ۲۔ دولت ۳۔ خوش مزاج بیوی
(۱۱) تین چیزوں سے نفرت کرو ۱۔ کمینہ پن ۲۔ ظاہرداری ۳۔ حسد
(۱۲) تین چیزوں کے لئے دعا کرو ۱۔ ایمان ۲۔ امن ۳۔ صفائی قلب
(۱۳) تین چیزوں کا اعتبار نہ کرو ۱۔ خوشامد ۲۔ دورنگی دوست ۳۔ دشمن
(۱۴) تین چیزوں کو پاس نہ آنے دو ۱۔ جھوٹ ۲۔ چغلی ۳۔ چوری
(۱۵) تین چیزوں کو بڑھاؤ ۱۔ اچھی کتابیں ۲۔ اچھے کام ۳۔ اچھے دوست (اچھی صحبت)
(۱۶) تین چیزوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو ۱۔ ماں ۲۔ ملازم ۳۔ جانور
(۱۷) تین چیزوں کی عادت ڈالو۔ ۱۔ عبادت الٰہی ۲۔ سخت محنت ۳۔ (موزوں) ورزش
(۱۸) تین چیزوں کو اپناؤ ۱۔ اچھے اخلاق ۲۔ اچھی نظر ۳۔ اچھی زبان

آزادی کی برکتیں

اختر سعید احمد
متعلم دہم (الف)

جس طرح دنیا کی بہت سی مفید چیزوں کی برکتیں ہوا کرتی ہیں، اسی طرح آزادی کی بھی کئی برکتیں ہیں ملک اگر آزاد ہو تو باشندگان ملک اپنے ملک کی ترقی و بہبودی کے لئے اچھے کام کر سکتے ہیں۔ ملک سے جہالت کو نکالنے کے لئے مدارس کھولدیئے جاسکتے ہیں، جہاں مفت تعلیم ہو ان مدارس سے ملک کے غیر تعلیم یافتہ افراد فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ عوام کے لئے ایسے دواخانے کھولدیئے جاسکتے ہیں جہاں دوا مفت تقسیم ہوتی ہو۔

اگر ملک غلام ہو تو عموماً باشندوں پر غلامانہ ذہنیت چھائی ہوئی رہتی ہے۔ آزاد ملک اپنی مرضی کے مطابق اپنے مستقبل تعمیر کرتے ہیں۔ آزاد ملک کے ہر فرد میں زندگی موجود ہوتی ہے، غلام ملک کے بدیسی حکمران ہمیشہ اپنے اقتدار کے قائم و برقرار رکھنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کا محکوم ملک ہمیشہ جہالت کی تاریکی میں رہے غیر مہذب رہے اور دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کا ساتھ دینے کے قابل ہی نہ ہونے پائے۔ عام تعلیم کی مخالفت اس لئے ہوتی ہے کہ تعلیم انسان میں زندگی کا شعور اور زندگی گذارنے کا حوصلہ اور سلیقہ پیدا کرتی ہے اور یہ بات حکمران قوم کو پسند نہیں ہوا کرتی کیوں کہ سماجی اور سیاسی شعور کے بیدار ہونے کے بعد کوئی قوم غلامی کو گوارا نہیں کر سکتی۔ پس حاکم قوم محکوموں کو ہمیشہ اپنا غلام بنائے رکھنے کی فکر میں لگی رہتی ہے کسی ملک کے لئے حسب ذیل آزادیاں ضروری ہیں۔

(۱) سیاسی آزادی:۔ سیاسی آزادی سے مراد اپنے ملک میں غیر قوموں کی حکومت نہ ہو۔

(۲) سماجی آزادی:۔ سماجی آزادی سے مراد سماج سے بری رسموں اور وہموں کو نکالنا اور سماج کے افراد میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنا۔

(۳) معاشی آزادی:۔ معاشی آزادی سے مراد بیروزگاری کو ختم کرنا اور ملک میں خوشحالی اور امن کے قیام کی کوشش کرنا ہے۔

بیروزگاری کو دور کرنے کے لئے قوم کے لیڈروں کو چاہئے کہ وہ ایسے پلان بنائیں جن سے ملک کی بیروزگاری دور ہوسکے اگر کوئی ملک غلام ہو اور وہاں کے باشندوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالت خراب ہو تو وہ حکومت کے خلاف زبان نہیں کھول سکتے، غلام ملک کے سیاسی رہنماؤں کو اپنے ملک کی خرابیوں کے دور کرنے میں رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان رکاوٹوں کی وجہ سے اہل ملک جاہل رہ جاتے ہیں، بسا اوقات غلامی کی وجہ سے افراد میں اپنی قوم سے ہمدردی کا جذبہ باقی نہیں رہتا۔ اور وہ عیش پرستی یا فضول لہو ولعب میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ان ہی اسباب کی بناء پر رفتہ رفتہ اہل ملک برباد ہوجاتے ہیں غیر قوم کے افراد کو ملک سے

کوئی ہمدردی نہیں رہتی وہ اپنی قوم کی ترقی اور اپنے ملک کو دولت مند بنانے کی خاطر یہاں کی دولت لے جاتے ہیں۔

جب ہندوستان غلام تھا، یہاں کی دولت ہیرے جواہرات سب انگلستان بھیج دیئے گئے ان ہیروں میں کوہ نور کا ہیرا بھی ہے، جو ملکہ الزبیتھ کے "تاج میں ہے، اب چونکہ ہمارا ملک آزاد ہے، اس لئے اہل ہند صنعت و حرفت اور زراعت کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔ یہ ایسے پیشے ہیں جن سے ہمارا ملک ترقی کر سکتا ہے۔ ہر شخص کے دل میں یہ تمنا ہے کہ ہمارے ملک کا شمار دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ہو۔

میرے ساتھیو! غلامی ایک لعنت ہے اس سے جانور چرند، پرند تک گھبراتے ہیں، اس لئے قوم و ملک کے فائدے کے ایسے کام کرو کہ ہمارے ملک کی آزادی ہمیشہ کے لئے مستحکم بنیادوں پر قائم و برقرار رہے۔

ممتاز محل کی دو وصیتیں

محمد مظہر الدین متعلم نہم (ب)

شاہ جہاں کی بیوی ممتاز محل نہایت نیک دل عورت تھی۔ شاہ جہاں اس سے بیحد محبت کرتا تھا، ایک دفعہ وہ سخت بیمار ہوئی، مرنے کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے شوہر کو بلا کر کہا، اب میرا وقت آچکا ہے اور میں اب آپ سے جدا ہوتی ہوں اور یہ یقینی ہے موت میرے لئے ہی نہیں بلکہ دنیا کے ہر جاندار کیلئے ہے، کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا اس لئے میں دو وصیتیں کرتی ہوں، جن پر عمل کرنے کا آپ وعدہ کیجئے یہ سُننا تھا کہ شاہ جہاں رونے لگا، پھر اس نے پوچھا کہ وہ کیا ہیں؟ تب ممتاز محل نے کہا کہ پہلی وصیت یہ ہے کہ میرے مرنے کے بعد دوسری شادی نہ کرنا، دوسری وصیت یہ کہ میری قبر پر ایک عالی شان مقبرہ بنانا جو دنیا میں میری یادگار رہے؟ یہ کہتے کہتے ممتاز محل نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کی جدائی کا شاہجہاں کو بے حد صدمہ ہوا۔ بادشاہ نے دو سال تک تمام خوشیوں سے پرہیز کیا۔ اس صدمہ کا اتنا اثر ہوا کہ دو سال میں بادشاہ کے بال سفید ہو گئے اس نے دونوں وصیتوں کو عملی جامہ پہنایا۔ ممتاز محل کی قبر پر ایسا عالیشان مقبرہ بنایا جسکی مثال دنیا میں نہیں ملتی، یہ عمارت شہر آگرہ سے ۲ میل دور جمنا کے کنارے واقع ہے۔ اس کی تعمیر میں سنگ مرمر اور لال پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا احاطہ ۱۸۶۰ مربع فٹ ہے۔ چاروں طرف دروازے ہیں جن میں ۳ چھوٹے اور ایک بڑا ہے۔

بڑے دروازے پر قرآن شریف کی آیتیں کندہ ہیں۔ نفیس بیل بوٹے ہیں جن کو دیکھ کر آج کل کی سائنسی دنیا کے کاریگر بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔

ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ

سید فاضل
متعلم ہشتم (ج)

یہ دنیا کی سب سے اونچی اور بڑی عمارت ہے جو امریکہ میں واقع ہے، اس کا شمار دنیا کے موجودہ سات عجائبات میں کیا جاتا ہے۔

یہ عمارت سنہ ۱۹۳۱ء میں تیار ہوئی۔ اس کا رقبہ دو ایکڑ ہے۔ یہ سطح زمین سے (۱۴۷۲) فیٹ بلند اور (۱۰۲) منزلہ ہے۔ اس کے دو منزلیں زیر زمین ہیں۔ اسکی تیاری میں (۲) لاکھ مکعب فٹ پتھر (۷) لاکھ پچاس ہزار پونڈ فولاد نکل اور المونیم صرف ہوا، اس عمارت میں استعمال ہونے والے بجلی اور ٹیلی فون کے تاروں کی لمبائی (۳۲۰۰) میل ہے۔ اس عمارت کی (۶۷۰۰) کھڑکیاں اور چڑھنے اترنے کے لئے (۶۱) برقی جھولے سامان اتارنے اور چڑھانے کے لئے اس کے (۲۸۶۵) زینے ہیں۔ برقی جھولے ایک منٹ میں (1000) فیٹ بلندی پر پہونچ سکتے ہیں۔ روزآنہ (۳۰۰) عورتیں اور (۲۰۰) مرد اس عمارت کی صفائی اور دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اس کے برج میں (3000) بجلی کے بلب لگے ہیں۔ جن کی دیکھ بھال کے لئے روزآنہ ایک شخص آٹھ گھنٹے کام کیا کرتا ہے۔

یہ عمارت نیویارک شہر کے اس حصہ میں واقع ہے جہاں سے روزآنہ تقریباً چالیس ہزار موٹریں اور دو لاکھ پیدل چلنے والے گذرتے ہیں۔ یہاں چھ ٹیلی ویژن اور تین براڈ کاسٹنگ کمپنیوں کا مرکز ہے۔ بالائی برج پر دوربین کی مدد سے (۴۰) میل دور سمندر میں آنے والے جہاز نظر آسکتے ہیں۔

اوپر سے نیچے کی طرف دیکھنے پر چلنے والی بسیں اور موٹریں، بچوں کے کھلونوں والی بسوں اور موٹروں کی مانند نظر آتی ہیں اس کی مختلف منزلوں سے رات کے وقت ہوائی جہازوں کو سگنل دیئے جاتے ہیں۔

لطیفے

محمد شوکت علی
متعلم ہشتم (د)

(۱) استاد ۔ دھوپ لیمو کسے کہتے ہیں۔
شاگرد ۔ وہ لیمو جسے دھوپ لگ جائے۔

(۲) پولیس والا ۔ (سینما ہال میں) یہاں سگریٹ پینا منع ہے۔
گاؤں والا ۔ (دیہاتی) اجی جناب فلم کا ہیرو خود سگریٹ پی رہا ہے پہلے اسے منع فرمایئے۔

(۳) باپ ۔ (بیٹے سے) میں نے ہر وقت کہا ہے تم اس شریر لڑکے کے گھر نہیں جانا وہ خراب لڑکا ہے۔
بیٹا ۔ اچھا ابا جان میں نہیں جاتا مگر احمد میرے گھر تو آسکتا ہے نا!

(۴) بڑا بھائی ۔ (چھوٹے بھائی سے) تمہاری بہت بڑی زبان ہوگئی ہے کاٹنا چاہیئے
چھوٹا بھائی ۔ تم نے میرے لئے بڑی زبان رکھی ہے۔

(۵) **استاد** - ماں کے پیر کے نیچے جنت ہوتی ہے۔

شاگرد - (گھر آکر) امی! کیا آپ کے پیر کے نیچے جنت ہے۔

ماں - ہاں بیٹا - ارے میرے پیروں کو کیوں دیکھ رہا ہے؟

بیٹا - اس لئے کہ ماسٹر صاحب نے کہا تھا کہ ماں کے پیر کے نیچے جنت ہے۔

ریڈیم

محمد عارف الدین فاروقی
متعلم نہم (ب)

سنہ ۱۹۱ء میں میڈم کیوری نے ریڈیم کا پتہ چلایا اور جب معلوم کیا کہ یہ یورینیم سے لاکھوں گنا زیادہ تابکار ہے تو اکثر سائنسداں، سائنس کے مختلف شعبوں میں ریڈیم کا استعمال معلوم کرنے میں مصروف ہو گئے۔ بہت جلد ہی اس کے طبی طریق استعمال روشنی میں آگئے، لیکن چند ہی سال بعد اس کے مضر اور مہلک اثرات کی دریافت نے ڈاکٹروں کو بہت زیادہ محتاط بنادیا۔ اس کی دریافت کی تفصیلات اور ریڈیم کی ماہیت کو چھوڑ کر اس مضمون میں صرف انسانی جسم پر اس کے مضر اثرات سے بحث کی گئی ہے۔

آج کل ڈاکٹروں نے ان تمام ادویہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے جو ریڈیم بطور جزو رکھتی ہیں - ماہرین کے ہاتھوں ریڈیم آب حیات کا کام کرتی ہے۔ لیکن اسے دوسرے استعمال کریں تو موت کا آنا یقینی ہے۔

پٹ برگ کے ایک مشہور کھلاڑی بائرس نے ریڈیم کے حل پذیر نمکوں کا محلول بڑی مقدار میں استعمال کیا۔ اس دوا کے متعلق مشہور کیا گیا تھا کہ کم از کم (۱۵۰) امراض کے لئے مفید ترین، غیر نقصان دہ اور مجرب دوائی ہے۔

ابتداء میں دوا نے مریض پر معجزہ کا اثر کیا، ادھیڑ عمر کے بائرس نے چند ہی دنوں میں اپنے اندر ایک نئی زندگی اور جوانی کو کروٹ لیتے ہوئے محسوس کیا۔ اسے خیال ہوا کہ اس نے آب حیات کے چشمہ کا پتہ چلالیا ہے اپنے اکثر دوستوں کو بائرس نے ریڈیم کے محلول کے بوتل روانہ کئے لیکن چند ہی ماہ بعد وہ بیمار ہو گیا۔ ہڈیوں کی خرابی، یرقان اور دماغی پھوڑے نے اس کی جان لے لی۔

بائرس کی نعش پر کئی تجربات کئے گئے پتہ چلایا گیا کہ اس کے جسم میں تین مائکروگرام ریڈیم موجود تھی جس سے تین اشخاص کی موت واقع ہوسکتی ہے۔ سائنس کی تاریخ میں کسی انسانی جسم میں اس قدر ریڈیم کا پتہ نہیں چلا تھا۔ اگر ایک سنگریزہ کو سو برابر حصوں میں تقسیم کیا جائے اور اس خوردبینی ذرہ کے برابر ریڈیم کھائی جائے تو دھات تمام ڈھانچہ میں پھیل جاتی ہے، چند سال بعد یہ ذرہ بڑی دردناک اور تکلیف دہ ہو

کا باعث ہوسکتا ہے، مریض آخر کار تڑپ کر جان دے دیتا ہے۔

تمام دریافت شدہ دھاتوں میں ریڈیم سب سے زیادہ قیمتی اور کمیاب ہے۔ یہ ایک سلسلہ وار انتشار کا نتیجہ ہے۔

شروع میں ریڈیم خون پیدا کرنے والے مرکز میں ایک ہیجان پیدا کرتی ہے جس کا فوری نتیجہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں سرخ اور سفید خلیئے کی پیدائش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے نتیجتاً آدمی قابل رشک صحت از سر نو جوانی اور نئی توانائی محسوس کرنے لگتا ہے۔

جلد یا بدیر اس کا ردعمل شروع ہوتا ہے۔

ع ذرات کی مسلسل بمباری سے خون پیدا کرنے والے مرکز تیزی سے کمزور ہونے لگتے ہیں۔ سفید خلیوں کی تعداد میں کمی اور سرخ خلیوں کی غیر مسلسل پیدائش سے یرقان کی شکایت ہوجاتی ہے،

چونکہ ریڈیم کی توانائی ۱۷۰۵ سال میں نصف ہوجاتی ہے اسلئے ع ذرات مریض کی موت کے سینکڑوں سال بعد بھی ابتدا کی سی تیزی اور تشدد سے حالت تحریک میں رہتے ہیں۔

امریکہ کا ایک شخص ریڈیم کے ٹکڑوں سے گھڑیوں کے ڈائل تیار کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے جسم میں ریڈیم جمنی شروع ہوگئی۔ اس کی موت کے پانچ سال بعد اس کے ڈھانچے کو قبر سے نکالا گیا۔ اس کی ہڈی کے پاؤ اونس وزنی حصہ کو گیگر کاؤنٹر ایک

ترکیب جس سے ریڈیم کے اشعاع کو برقی رو میں تبدیل کیا جاتا ہے) کے مقابل رکھا گیا۔ ایک لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ ان رووں کو آواز میں تبدیل کیا گیا۔ آلہ سے مسلسل کراہنے کی آواز آرہی تھی۔

اس کے بعد اس کے پیر کے پنجے کو عکاسی کی تختی کے مقابل ایک بالکل اندھیرے کمرے میں رکھا گیا۔ چند دن میں پنجے کا مکمل فوٹو بن چکا تھا۔

کوئی ماہر طبیب ریڈیم کو دوا کے طور پر استعمال کا مشورہ نہیں دیتا۔ جب کوئی شخص ریڈیم کا استعمال شروع کرتا ہے تو یہ ہڈیوں میں جمع ہونی شروع ہوتی ہے اس کو محلول کی شکل میں بھی استعمال کیا جائے تو خون کے ساتھ ایک عجیب کیمیائی تعامل کے بعد یہ ناحل پذیر تابکار شئے میں تبدیل ہوجاتی ہے اور اسی شکل میں وہ ہڈیوں کی ساخت میں جمع ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صرف ریڈیم کے اشعاع استعمال کرتے ہیں۔ اشعاع سرطان کے علاج میں کچھ حد تک مفید مانا گیا ہے۔ لیکن جب دیگر امراض میں استعمال کیا جائے تو خون میں سرطان کے ذرات پیدا ہوجاتے ہیں اسی لئے اس کے استعمال میں حد سے زیادہ احتیاط برتی جاتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں دنیا کا ریڈیم کا ذخیرہ کل 30 گرام یا دو تہائی اونس پونڈ پر مشتمل ہے اس مقدار کی نصف ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہے۔

ایک گرام کے حصول کے لئے ۱۵۰ آدمیوں

دو ماہ کی مدت ۵۰۰ ٹن کچ دھات ۱۰۰۰۰
ٹن کشید کیا ہوا پانی ۱۰۰۰ ٹن کوئلہ ۵۰ ٹن کیمیاوی
ادویہ اور بڑے تجربہ خانہ کی ضرورت ہوتی ہے۔اگر
اگر اس کچ دھات کا زیادہ مقدار میں پتہ چلے تو یہ
سستی ہو سکتی ہے، حال ہی میں کینیڈا (   )
میں ایک جھیل کے اطراف واکناف اس کا پتہ چلایا گیا ہے
اس کی ناقابل اندازہ قیمت اسے نیم حکیموں
اور بازاری ڈاکٹروں کے ہاتھوں سے دور رکھتی ہے
ورنہ ان لوگوں کے ہاتھوں یہ دودھاری تلوار موت
کا بازار گرم کر دیتی۔

امید

حسین بن سعید
متعلم جماعت نہم (ب)

امید کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے
دل کے ہمیشہ مشغول رہنے کا سامان مہیا کیا ہے
وہ قوت جس کو ہم یاد کہتے ہیں ہمیشہ پیچھے دیکھتی
ہے۔جب کوئی موجودہ چیز شغل کیلئے نہیں ملتی تو یہ
گذری ہوئی باتوں کو بلا لاتی ہے اور اس کے
خیال سے ہمارے دل کو بہلائے رکھتی ہے۔
اسی طرح ایک اور قوت ہے۔جو آئندہ ہونے والی
باتوں کے خیال میں دل کو محو کر دیتی ہے، اسے
"امید" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔
ہماری زندگی میں خوشیاں اس قدر کم
اور چند روزہ ہیں کہ اگر امید کی طاقت ہمارے
پاس نہ ہوتی تو ہمیں زندگی نہایت ہی ناخوشگوار
معلوم ہوتی۔
ایک عقلمند نے کہا ہے کہ:۔
"ہم کو تمام چیزوں کی امید رکھنی چاہیئے کیونکہ
کوئی چیز ناممکن نہیں ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے
جس کی امید نہ ہو۔"
ایک ظریف نے کہا کہ:۔ مجھے اس دنیا میں
کسی چیز کا غم نہیں کیونکہ امید میرے ساتھ ہے
اور وہ ہر وقت مجھے خوش رکھتی ہے۔
اس کے دوستوں نے پوچھا!
"کیا تمھیں مرنے کا بھی غم نہیں؟"
اس نے کہا کہ "کیا عجب ہے کہ میں کبھی نہ مروں
کیونکہ خدا اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ ایک
ایسے انسان کو پیدا کرے جس کو کبھی موت نہ آئے
اور مجھے توقع ہے کہ شاید وہ شخص میں ہی ہوں
جس کو کبھی موت نہ آسکے!
اگر انسان کو زندگی کی امید نہ ہوتی تو اس کا
جینا سخت دشوار اور کٹھن ہو جاتا اور اس کی
حالت بد سے بدتر ہو جاتی، امید ہی کی وجہ
سے انسان کی زندگی میں پُربہار مسرتیں ہیں امید سے
خوش مزاجی کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ انسان
کی روح کو خوش رکھتی ہے اور تمام مشکلوں
کو آسان کر دیتی ہے۔ امید ہی ایک ایسی
چیز ہے جو انسان کی زندگی میں بہار چاند لگا
دیتی ہے۔
ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ قیصر روم نے اپنے

تمام دوست احباب کو بلایا اور اپنا سارا مال
زر اُن میں تقسیم کر دیا اس کے دوستوں نے پوچھا
"آپ نے اپنے لئے کیا رکھا؟" قیصر روم نے
جواب دیا کہ " امید "! احمد نے یہی کہا کہ
مجھے ان چیزوں کی کچھ پرواہ نہیں، اور نہ یہ
چیزیں مجھے خوش رکھ سکتی ہیں۔ اللہ امید ہی ایک
ایسی دولت ہے جس سے میں دنیا کی دولت
دوبارہ حاصل کر سکتا ہوں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد

احسان محمد متعلم جماعت نہم الف

مولانا ابوالکلام آزاد کا نام غلام محی الدین تھا
یہ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام
محمد خیر الدین تھا۔ ان کی والدہ شیخ محمد بن ظاہر
مفتی مدینہ منورہ کی بھانجی تھیں اور آپ کے دادا
مولانا محمد ہادی دہلوی علماء کے خاندان سے تھے۔
مولانا آزاد جیسے عالم فاضل انسان دنیا میں دوبارہ پیدا نہیں ہوتے
زندگی بھر مولانا کو کام سے بے حد محبت رہی۔
مولانا آزاد مرحوم نے ۱۹۱۲ء میں ایک اخبار
"الہلال" نکالا۔ کہنے کو تو اس کا نام الہلال
تھا لیکن وہ "صحافت کے آسمان پر بدر کامل
بن کر چمکا" یہ اخبار مسلمانانِ ہند کی انقلابی
سیاست کا نمونہ تھا۔ کچھ عرصہ بعد ان کو انقلابی
سیاست کے تحت ۱۹۱۶ء میں علی پور جیل میں
نظر بند کر دیا گیا۔

محمد علی جوہر نے کہا تھا کہ "میں نے لیڈری
آزاد کی کتابوں اور اقبال کی شاعری سے سیکھی ہے۔"
۱۸ برس کی عمر میں انھوں نے ایک کتاب
"حیات سرمد" لکھی۔
۱۹۲۳ء میں انھوں نے اس دور کی
یادگار کتاب "ترجمان القرآن" لکھی۔ ان کی
تمام شائع شدہ کتابوں میں "ترجمان القرآن"
ان کی خوبی تحریر کی ایک عمدہ مثال ہے۔
اس کتاب میں عربیت نام کو نہیں ہے۔ روانی
اور سادگی کا یہ عالم ہے کہ ہر شخص اس کتاب
کو بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔
چنانچہ خود مولانا نے اپنی کتاب کے بارے
میں یہ لکھا ہے کہ "میں نے ترجمان القرآن کی
تفسیر کے متعلق ایک شخص پر تجربہ کیا۔ وہ اُردو
تعلیمی رسائل بہ آسانی پڑھ لیتا تھا میں نے اسے
"سورۂ بقر" کا ترجمہ پڑھنے کو دیا۔ وہ تین جگہ
فارسی لفظوں میں آکر رُک گیا۔ لیکن مطلب سمجھنے
میں اُسے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ میں نے
وہ الفاظ بدل کر نسبتاً زیادہ سہل الفاظ
رکھ دیئے۔"
حقیقت یہ ہے کہ کامیاب انشا پرداز
وہی ہو سکتا ہے جسے الفاظ کے استعمال کا زیادہ
سے زیادہ تجربہ ہو مولانا میں یہ صفت بدرجۂ اتم
موجود تھی۔ وہ الفاظ سے نہیں بلکہ الفاظ کی روح سے
واقف تھے، ان کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ پہ پہاڑ

کی سی مضبوطی کے ساتھ جما ہوا رہتا تھا۔

شاید اسی خصوصیت کو دیکھ کر نیاز فتح پوری نے لکھا تھا کہ "آپ کا لب و لہجہ آپ کا انداز بیان واللہ مجھ سے تو وداع جان چاہتا ہے اگر آپ کی زبان میں مجھے کوئی گالیاں دے تو میں اس کو ہر وقت چھیڑا کروں"۔

ہندوستان کے اس بے مثال انشا پرداز سحر البیان مقرر عربی اور فارسی کے جید عالم نے ۲۲۔ فروری سنہ ۱۹۵۸ء کو اس دار فانی سے رحلت فرمائی ——

مولانا ابو الکلام آزاد کی وفات بلاشبہ اہل ہند کے لئے ایک صدمۂ عظیم ہے۔

مضمون نگاری

شاہ خواجہ احمد علی قادری
جماعت ہشتم د

میں نے ایک مرتبہ سوچا کہ کیوں نہ میں ایک مضمون نگار بن جاؤں۔ بچپن ہی سے میں روزآنہ اخبار کا مطالعہ کیا کرتا تھا — میں نے دیکھا کہ اس اخبار میں بچوں کے مضامین بھی چھاپے جاتے ہیں تو مضمون نگار بننے کی خواہش نے مجھے اور بے چین کر دیا۔ میں نے جب اخبار میں ایک مضمون دیکھا اور اس کے ساتھ ایک لڑکے کا نام بھی لکھا ہوا پایا تو خیال ہوا کہ شاید یہ کسی امیر کا لڑکا ہوگا جس نے روپے دے کر اپنا مضمون چھپوا لیا ہے۔ اور یہ کہ غریب طبقہ کے نوجوان کو اپنے مضامین شائع کرنے کا موقع نہیں مل سکتا اخبار کا مطالعہ میں روزآنہ کرتا تھا۔ ایک روز اس اخبار میں انعامی مضمون کے مقابلہ کا اعلان نظر سے گذرا۔ اخبار میں یہ بھی لکھا تھا کہ مقابلہ میں شرکت کی کوئی فیس نہیں میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی میں نے گھر آکر قلم سنبھالا اور لکھنا شروع کیا یوں بھی مجھے بہت شوق تھا کہ اخبار یا رسالہ میں مضمون بھیجا کروں۔ میں نے اپنے انعامی مقابلے والے مضمون کو پورا کیا اور لکھ بھیجا دوسرے ہفتے میں نے دیکھا کہ اخبار میں مضمون نویسی کے مقابلہ کا نتیجہ شائع ہوا اور میرے نام کے ساتھ انعام دوم لکھا ہوا تھا۔ میں خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اب میرے لئے مضمون لکھنا بہت آسان ہوگیا تھا۔

میرا یہ خیال ہے کہ اور مشغلوں کے مقابلہ میں مضمون نگاری کا مشغلہ بہت ہی اچھا مشغلہ ہے مضمون نگار اپنے ادبی جواہر پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتا ہے جس سے ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں نے جب سے مضمون لکھنا شروع کیا، اس وقت سے عوام کی محبت اور ملک کی خدمت کا جذبہ بھی میرے دل میں پیدا ہوا۔ یہ بالکل سچ ہے کہ مضمون نگاری کے ذریعہ سے نہ صرف ملک و قوم بلکہ بنی نوع انسان کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ جن طالب علموں میں مضمون

لکھنے کی ذرا سی بھی صلاحیت ہے انھیں اپنی اس صلاحیت کو مسلسل مشق کے ذریعہ پروان چڑھانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

سورج

بشیر احمد خاں متعلم
جماعت نہم (ب)

پرانے زمانہ میں لوگ یہہ خیال کرتے تھے کہ سورج زمین کے اطراف چکر لگا رہا ہے۔ جب سائنسدانوں نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ سورج ساکن ہے اور زمین سورج کے اطراف گھوم رہی ہے۔ جس کی بدولت یہ دن اور رات اور موسموں کا تغیر ہوتا ہے اگر سورج متحرک ہوتا اور زمین ساکن ہوتی تو زمین کا آدھا حصہ اندھیرے میں رہتا اور آدھا حصہ سورج کے سامنے (اُجالے میں) رہتا اور سورج کبھی نکلتا ہوا دکھائی دیتا نہ غروب ہوتا ہوا اور موسم میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوتی۔

یہہ بات تو سب لوگ جانتے ہیں کہ سورج اپنی گرم شعاعیں زمین پر ڈالتا ہے جس سے زمین منور ہوتی ہے اور ۱۲ گھنٹے کا دن اور ۱۲ گھنٹے کی رات ہوتی ہے۔ سورج بہت گرم ہے اور اس میں بہت سے زہریلی گیسیں پائی جاتی ہیں۔ اگر زمین بھی سورج کی طرح گرم اور آگ کا دہکتا ہوا گولا ہوتی تو زمین پر پہاڑ پگھل جاتے اور جاندار نباتات اور جمادات سب جل کر گیس میں تبدیل ہو جاتے۔ سورج زمین سے بہت دور ہونے کی وجہ سے ہم کو چھوٹا نظر آتا ہے جیسے ہوائی اڈہ پر ٹھیرے ہوئے جہاز کو دیکھیں تو وہ بڑا دکھائی دیتا ہے اور جب وہ آہستہ آہستہ اوپر اُڑتا جاتا ہے تو انتہائی بلندی پر پہونچ کر ایک کالا سا دھبہ دکھائی دیتا ہے سورج کا فاصلہ زمین سے چونکہ ۹ کروڑ میل ہے اس لئے وہ چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔

سورج زمین سے دور ہونے کے باوجود زمین پر زندگی بسر کرنے والوں کے لئے کارآمد و مفید ہے۔ وہ زمین کے جانداروں کے لئے کس قدر ضروری ہے، اِس کے سمجھنے کے لئے ایک مثال پیش کی جاتی ہے:۔

دو پودے لو ایک پودے کو سورج کی روشنی میں رکھو اور دوسرے کو اندھیرے کمرے میں چند دن کے بعد ہم دیکھیں گے کہ روشنی والا پودا ترو تازہ ہو کر بڑا ہو گیا ہے اور اندھیرے کمرے والا پودا مرجھا گیا ہے اور اس کے پتے زرد رنگ کے ہو گئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ روشنی میں رکھا ہوا پودا سورج کی روشنی حاصل کر کے ترو تازہ رہا اور اندھیرے کمرے میں رکھا ہوا پودا چونکہ سورج کی روشنی سے محروم رہا اس لئے وہ مرجھا ہو گیا!

پودے حقیقت میں سورج کی روشنی سے زندگی اور نشو و نما پاتے ہیں اور اگر روشنی نہ ملے تو ان سے نہ ہیں پھول حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ پھل۔ ان کے

علاوہ جو جانور پتوں پر زندگی بسر کرتے ہیں وہ سب کے سب ان کا من بھاتا کھانا نہ ملنے کی وجہ سے ایک دن مر جائیں گے۔

بہرحال سورج بھی انسان جانور نباتات سب کے لئے مفید اور کارآمد ہے اگر سورج زمین کو روشنی سے محروم کر دے تو ایک دن ساری دنیا ختم ہو جائے گی۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ سورج ہماری زندگی کے لئے بہت مفید اور کارآمد ہے۔

ایک یتیم کی عید

محمد عروج احمد رضا (متعلم نہم الف)

آج رمضان کے پورے ۲۹ دن ختم ہوئے آسمان پر ہلال عید نظر آیا ساری دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ بازاروں میں کچھ عجیب سی رونق ہے جدھر دیکھو ہزاروں لوگ نظر آ رہے ہیں "چاند مبارک" کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، دکانوں پر خاص کر جوتوں اور ٹوپیوں کی دوکانوں پر لوگوں کا اژدحام ہے ہر شخص اپنی پسند کی چیزیں خریدنے میں بہت مصروف ہے غرض یہ کہ ایک عجیب سی چہل پہل دکھائی دے رہی ہے۔

کلیم ایک یتیم لڑکا جس کی عمر صرف ۷ سال ہے اپنی غریب ماں کے سہارے پرورش پا رہا ہے آج تمام لڑکے اپنے والدین کے ساتھ خوش خوش بازار جا رہے ہیں لیکن بیچارہ کلیم اپنی ماں کے پاس بیٹھا ہوا ہے اس کے چچیرے بھائیوں نے کہا کہ آؤ کلیم ہم تمہیں اپنے کپڑے اور جوتا ٹوپی وغیرہ بتائیں جو ہمارے ابّا لائے ہیں۔ کلیم اپنے بھائیوں کے ساتھ گیا اس کے بھائیوں نے تمام چیزیں اُسے دکھائیں کلیم گھر لوٹا اور ماں سے کہنے لگا۔ ماں چچا میاں کے گھر گیا تھا مجھ کو راشد، حامد اور خالد نے اپنے کپڑے بتائے ان کے کپڑے بہت اچھے تھے۔ ماں میرے ابّا مجھ کو کب دلائیں گے؟ ماں نے جب اُس کی باتیں سنیں تو اُس کے دل پر ایک بجلی سی گری اس نے اپنے بچے کو کلیجے سے لپٹا لیا۔ اور کہنے لگی۔ بیٹے! تیرے ابّا شہر گئے بہت دن ہوئے وہ آتے ہی ہوں گے اور تیرے لئے بھی کپڑے لائیں گے ماں نے کلیم کو جھوٹی سچی باتوں سے تسلی دی۔

دوسرے دن صبح سویرے سے محلے کے لوگ گھروں سے باہر نکلنے لگے۔ کلیم بیٹھا ہوا یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کی ماں نے اُس کو پھٹے پُرانے کپڑے پہنا دیئے۔ کلیم محلے کے چند لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنے عیدگاہ چلا گیا۔ نماز ادا کرنے کے بعد اُس نے دیکھا کہ لڑکے اپنے سرپرستوں سے مل رہے ہیں کوئی مٹھائی خرید رہا ہے کوئی کھلونے خرید رہا ہے۔ کلیم غریب کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے وہ کیا خریدتا! وہ اپنے گھر آیا۔ ماں سے ملا۔ اُس نے کہا کہ ماں ابّا تو بہت خراب ہے ابّا بھی نہیں آئے اور تو نے مجھے پیسے

بھی نہیں دیئے۔ جب میں مسجد سے لوٹا تو سب
بچوں کے پاس پیسے تھے۔ وہ سب مٹھائیاں
کھا رہے تھے اور کھلونے خرید رہے تھے میرے
پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ ماں! کیا ابا ابھی تک
واپس نہیں آئے۔ ماں جب اس کی باتیں سنیں تو
بے اختیار رونے لگی کلیم نے ماں سے روٹھ کر
ایک خط اللہ میاں کے نام لکھا۔

اللہ میاں! دیکھو آج عید کا دن ہے
ابا ابھی نہیں آئے ماں نے مجھے کپڑے بھی نہیں بنائے
دوسرے بچے نئے نئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔
مٹھائیاں کھا رہے ہیں پیسے لے رہے ہیں۔
اللہ میاں! میری ماں نے مجھ کو ایک پیسہ بھی نہیں دیا
آپ میرے ابا کو جلد بھجوا دیجئے، ابا آجانے پر مجھ کو
بھی نئے کپڑے ملیں گے، پیسے بھی ملیں گے میں
بھی مٹھائی کھاؤں گا۔ اللہ میاں! تم ضرور میرے
ابا کو شہر سے بھجواؤ نہیں تو میں تم سے خفا
ہو جاؤں گا۔ خط لکھنے کے بعد کلیم اسے پوسٹ بکس
میں ڈالنے کیلئے نکلا۔ ابھی وہ پوسٹ بکس
میں خط ڈالنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اتنے میں
ایک شخص گھوڑے پر سوار کلیم کے پاس
پہنچا۔ اور کہنے لگا کہ لاؤ میاں میں ڈال دوں
کلیم نے کہا کہ میں یہ خط اللہ میاں کے نام بھیج رہا ہوں
تم کو نہیں دوں گا سوار نے کہا۔ مجھ کو اللہ میاں نے
بھیجا ہے لاؤ خط مجھ کو دیدو۔ کلیم نے اس کو خط دیدیا
سوار نے کلیم کو روپیوں کی ایک تھیلی دی۔ اور کہا
کہ اللہ میاں نے تمہارے لئے یہ روپے بھجوائے ہیں
تم اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ کلیم روپے لے کر خوشی
خوشی اپنی ماں کے پاس آیا اور تمام قصہ سنایا
ماں نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور اس کے
لئے نئے کپڑے خریدے اور بڑی خوشی سے عید
منائی اس طرح ایک یتیم کی عید پوری ہوئی۔

زندگی کا ہر لمحہ قیمتی ہے

بشیر احمد خان متعلم نہم ب

زندگی کے وہ لمحات جو ہم فضول باتوں میں برباد
کر دیتے ہیں ایک ایسا قیمتی سرمایہ ہیں جو انسانوں
کی قسمتوں کو بدل کر رکھ دیتے ہیں دنیا کے کامیاب
انسانوں نے وقت سے کتنا فائدہ اٹھایا ہے؟ اس کا
اندازہ حسب ذیل اقوال اور امثال سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

ایک مفکر کا مقولہ ہے کہ جس نے وقت کو برباد
کیا اس نے سب کچھ برباد کر دیا اور جس نے وقت
سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے سب کچھ حاصل کر لیا۔
واقعی وقت دنیا کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ گئی
ہوئی دولت کھوئی ہوئی صحت واپس آسکتی ہے
لیکن کھوئے ہوئے وقت کو کبھی بھی واپس نہیں
لایا جا سکتا۔

اسلام نے متبعین کو سختی کے ساتھ ہدایت کی
ہے کہ وہ اپنے وقت کو لہو ولعب اور فضولیات
میں برباد نہ کریں۔ حضرت محمد صلعم نے بیکار باتوں
میں وقت گزارنے والوں کو سخت ناپسند فرمایا ہے

یہہ سچ ہے کہ جو شخص اپنے وقت کو برباد کر دیتا ہے اس کے لئے ترقی کی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔

دنیا کا فاتح اعظم نپولین کہا کرتا تھا کہ میری فتحمندی اور کامیابی کا راز یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے ہر لمحہ سے فائدہ اٹھایا۔ نپولین کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ وہ رات میں دو بجے تک کام کرتا تھا جنگ سے قبل جنگ کا نقشہ خود ہی تیار کرتا تھا اور رات دن جنگ کی نئی نئی اسکیموں کے بنانے میں کھویا ہوا رہتا تھا۔

امریکہ کا کروڑپتی چارلس ایم شوسپ شروع میں لوہے کا کام سیکھا کرتا تھا اور اس کام سے جو وقت بچ رہتا وہ اسے پڑھنے میں صرف کرتا تھا وقت کی قدر کرنے کی بناء پر ایک طرف تو وہ لوہے کا بڑا ماہر بن گیا اور دوسری طرف اس نے اپنی علمی استعداد بڑھالی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایک لوہے کے کارخانے میں پچاس ہزار ڈالر سالانہ کی تنخواہ پر ملازم ہو گیا۔ اور کچھ عرصہ بعد اسی کارخانہ کا تین کروڑ ڈالر کا حصہ دار بن گیا اس کی وجہ محض یہی تھی کہ اس نے وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

سر ہنری الگزنڈر انگلستان کے نامور بیرسٹر گزرے ہیں یہ ایک غریب باپ کے بیٹے تھے۔ بارہ برس کی عمر میں وہ سڑکوں پر اخبارات بیچ کر پیٹ پالتے تھے۔ صرف رات کے چند گھنٹوں سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے بیرسٹری کی سند حاصل کر لی چونکہ وہ بہت محنتی تھے اور وقت سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے، اس لئے وہ ایک نامور ڈاکٹر ثابت ہوئے۔

ہر شخص آسانی کے ساتھ رات میں دو گھنٹے نکال سکتا ہے وہ ان دو گھنٹوں میں یا تو ہنر سیکھ سکتا ہے یا اپنی علمی استعداد کو بڑھا سکتا ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس وقت نہیں ہے وہ بالکل غلط بات کہتے ہیں کیونکہ حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کا بیشتر حصہ فضول کاموں میں برباد ہوتا ہے اگر انسان ان فضول باتوں سے اپنے آپ کو بچائے اور اس بچے ہوئے وقت سے فائدہ اٹھائے تو وہ کچھ سے کچھ بن سکتا ہے۔

دنیا کا نامور موجد سر ہنری ڈیوی۔

(   ) ابتدا میں ایک دواساز کے ہاں کام کرتا تھا۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنا وقت مطالعہ کتب اور کیمیاوی تجربات پر صرف کرتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ چند سال کے اندر ہی ایک کامیاب موجد بن گیا اور اپنی ایجادات سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

گاندھی جی بھی وقت کے استعمال سے دنیا کے ممتاز ترین لیڈر بن گئے۔ پنڈت نہرو کو ان کی ذاتی تصنیفات سے بے حد فائدہ ہوا۔ ہمارے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اپنی تمام تر کتابیں روزانہ

ایک دو گھنٹے وقت نکال کر رکھی ہیں۔

ہندوستان کے نامور لیڈر مولانا محمد علی جب ولایت سے تعلیم حاصل کر کے آئے تو اس وقت انھیں عربی زبان نہیں آتی تھی لیکن انھوں نے جیل خانہ میں اور فرصت کے اوقات میں اس زبان کو سیکھا یہاں تک کہ وہ ایک زبردست عالم بن گئے۔

اس طرح یو۔ پی کے سابق گورنر مسٹر کے ایم منشی جنھیں طالب علمی کے زمانہ میں حصول تعلیم سے غیر معمولی دلچسپی تھی روزانہ تھوڑا سا وقت اس شوق کے لئے نکال لیتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ گجراتی زبان کے نامور ادیبوں میں شمار کئے جانے لگے، اس طرح دنیا کے دوسرے مشاہیر نے بھی وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

ہمارے ملک میں وقت ضائع کرنے کا رواج بہت عام ہو گیا ہے اور یہاں کے باشندے وقت کی اہمیت سے بڑی حد تک ناواقف ہیں۔ ستم ظریفی کی بات تو یہ ہے کہ ایسے لوگ صرف اپنا وقت ہی برباد نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے وقت کو برباد کرتے میں بھی ان کو کسی قسم کا باک نہیں ہوتا لیکن جوں جوں ہندوستانیوں کی معلومات زیادہ ہوتی جائیں گی۔ ان کی بیکاری میں بھی کمی ہوتی جائیگی

یاد رکھیئے ترقی اور کامیابی صرف ان ہی لوگوں کا حصہ ہے جو اپنے وقت کو بیکار نہیں کھوتے اور دوسروں کے وقت کی بھی قدر کرتے ہیں ایسے لوگ روزمرہ کے معمولات سے جو وقت بھی بچ کر آئے اسے بیکار نہیں جانے دیتے، بلکہ اس کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہی فرصت کے چند لمحات رفتہ رفتہ انسان کے مقدر کو تبدیل کر دیتے ہیں۔

دوسرا پنجسالہ منصوبہ

سید احمد متعلم نہم (د)

جب بھارت ماتا کے سپوتوں نے بھارت ماتا کو سامراج کے پنجے سے آزاد کرایا تو ضرورت اس بات کی تھی کہ دیس کو ترقی دی جائے، کیونکہ انگریزی حکومت کے زمانہ میں دیس کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ دیش کو ترقی دینے کے لئے ہمارے رہنماؤں نے منصوبے بنائے۔ اور ان منصوبوں کی مدت پانچ سال رکھی۔ پہلا پنج سالہ منصوبہ نہایت ہی کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ پہلے پنجسالہ منصوبے کی کامیابی سے دوسرے پنجسالہ منصوبے کی کامیابی میں بہت مدد مل رہی ہے۔ پہلا پنجسالہ منصوبہ ایک زرعی منصوبہ تھا۔ جیسے اس میں زراعت اور گاؤں کی ترقی کی طرف زیادہ دھیان دیا گیا تھا اس لئے اس کو زرعی منصوبہ کہتے ہیں۔ پہلے منصوبے میں زراعت آبپاشی بجلی وغیرہ کی ترقی پیش نظر تھی۔

دوسرے پنجسالہ منصوبہ میں (جو اپریل سنہ 1956ء سے شروع ہوا اور مارچ سنہ 1961ء میں ختم ہوگا) صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے پلان بنائے گئے ہیں

اس لئے اس کو ایک صنعتی پلان بھی کہتے ہیں۔ ان میں نہ صرف بڑی بڑی صنعتوں کو شامل کیا گیا ہے بلکہ گھریلو صنعتوں کو بھی ترقی دینے کی تجویزیں شریک کی گئی ہیں۔

ہمارے پنجسالہ منصوبے ہماری غربت و افلاس اور بیماری کے خلاف ایک جنگ ہیں کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ کوئی بڑی چیز بغیر پلان کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کوئی ملک اس وقت تک ترقی کی منزلیں طے نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنی ترقی کا منصوبہ نہ بنائے۔ روس اور چین کی مثال ہمارے سامنے ہے روس ایسے ہی منصوبوں پر عمل کر کے آج ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچا ہے۔ ہم بھی اپنے پنجسالہ منصوبوں پر عمل کر کے ایک خوشحال آئندہ مستقبل اور ایک صحتمند سماج کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کی غربت و افلاس کو دور کرنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے کہ ہم اپنے پنج سالہ منصوبہ کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنائیں جب تک دیس سے افلاس دور نہیں ہوگا اس وقت تک دیس ترقی نہیں کر سکتا

دوسرے پنج سالہ منصوبہ میں اصل (سرمایہ) کا اندازہ (۴۸۰۰) کروڑ روپے رکھا گیا ہے۔ ہر سال تقریباً ۵۸ یا ۵۲ لاکھ لوگوں کو روزگار فراہم کیا جائے گا۔ اس طرح بے روزگاری کا جو بھیانک بھوت ہمارے سامنے ہے اس پر بڑی حد تک قابو پا لیا جائے گا۔ توقع ہے کہ اس منصوبہ کے ختم ہونے تک ہماری قومی آمدنی میں بھی بہت کچھ اضافہ ہوگا

دوسرے پنجسالہ منصوبہ کا مقصد ایک ایسے سماج کی تعمیر ہے جس کی بنیاد سوشلسٹ طرز کی ہو۔ امیروں اور غریبوں کے درمیان جو دیوار حائل ہے اُسے گرانے کی کوشش کی جائیگی دولت کی مناسب طور پر تقسیم عمل میں آئے گی دوسرے پنج سالہ منصوبہ کی تکمیل سے ہندوستان کو ایک صنعتی ملک کی حیثیت سے ترقی کرنے میں کافی مدد ملے گی اور یہاں کے لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو جائیگا اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم سب مل کر جد و جہد کریں اور دوسرے پنج سالہ منصوبہ کو پر خلوص کوششوں سے کامیاب بنائیں، ہم جلسوں سے ترقی کر سکتے ہیں یا نہ جلوسوں سے ہم صرف اس وقت ترقی کے مدارج طے کر سکتے ہیں جبکہ ہم سب مل کر محنت کریں، بقول چاچا نہرو کے "ہم بھوکے مر جائیں گے مشقت اُٹھائیں گے اور اپنے پنجسالہ منصوبہ کو کامیاب بنائیں گے۔"

ناخن

محمد جلیل الدین
متعلم نہم (ج)

ناخن کی شکل و صورت اور بناوٹ وغیرہ دیکھ کر کسی شخص کے کردار کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے حسب ذیل مختلف قسم کے ناخن دیکھ کر کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

★ ایسے حضرات جن کے ناخنوں کے ختم پر

سفید دھبہ ہے وہ زیادہ تر ایماندار ہوتے ہیں لیکن ان میں تھوڑی سی عیاری بھی پائی جاتی ہے

★ ایسے حضرات جن کے ناخن ذرا سی گولائی لئے ہوتے ہیں عموماً تیز مزاج ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ وہ پیار و محبت اور برتاؤ سنگار کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

★ جن لوگوں کے ناخن بہت زیادہ گولائی لئے ہوئے ہوتے ہیں وہ اکثر سرکش اور تند مزاج ہوتے ہیں

★ جن لوگوں کے ناخن ذرا ترچھے یا منحرف ہوتے ہیں وہ دغا باز اور فریبی ہوتے ہیں۔

★ پتلے اور تنگ ناخن والے رکاوٹیں اور مصیبتیں پیدا کرتے ہیں۔

★ لمبے ناخن والے اچھی فطرت رکھتے ہیں لیکن بدگمان ہوتے ہیں۔

★ چوڑے ناخن والے شرمیلے اور حیادار ہوتے ہیں۔

★ ایسے لوگ جن کے ناخن موٹے ہوتے ہیں نرم مزاج اور کم سخن ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی آزادی

ضیاء الدین صابر
جماعت ہشتم (ب)

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن ہندوستان کی سیاست کا سب سے اہم واقعہ ہے اس دن کو ہندوستان میں جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی اور دن کو نہیں کیونکہ اس دن ہندوستان نے انگریزوں کی غلامی کی زنجیروں سے نجات حاصل کی۔

آزادی ایک ایسی دولت ہے جس کی خواہشمند ہر قوم رہی ہے۔ کیونکہ آزادی کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کی آزادی دراصل ایک ملک کی آزادی نہیں، بلکہ متمدن تہذیب اور طاقتور ملک کی آزادی ہے جو تعداد میں ہزاروں نہیں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں پر مشتمل ہے اور جو دنیا کی آبادی کا ۱/۵ حصہ ہے۔

ہندوستان نے تقریباً نوے سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بغیر خون بہائے، اہمسا کے ہتھیار سے اور گاندھی جی کی قیادت میں آزادی حاصل کی۔ اگر یہ قومی قوت کے زور پر آزاد ہوتا تو لاکھوں آدمی جنگ آزادی میں مارے جاتے اور نتیجے کے طور پر مدمقابل سے ہمیشہ کیلئے رقابت بھی رہتی۔

مگر ہمارے قائدین گاندھی جی، بال گنگادھر تلک، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد، اور مولانا ابوالکلام آزاد نے انتہائی تدبر سے کام لے کر ہندوستان کو اس طرح آزاد کرایا کہ مشرق و مغرب کی دوستی اب بھی برقرار ہے۔ ہندوستان اس دس سال کی آزادی کے دور میں کافی ترقی کر چکا ہے۔

خاص کر ہمارے ہر دلعزیز وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے دنیا میں امن کی برقراری اور

جنگ کے امکانات کو ختم کرنے کے لئے جو کامیاب کوشش کی ہے اس سے ہندوستان کی عظمت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ ہندوستان سیاسی و معاشی اعتبار سے کافی ترقی کر چکا ہے۔ آج بین الاقوامی سیاست میں بھی ہمارا مرتبہ کافی بلند ہے۔

میں ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے طالب علم بھائیوں سے یہ خواہش کرتا ہوں کہ ہم سب دولت علم سے آراستہ ہو کر مادر وطن کی اسی طرح خدمت کریں جس طرح ہمارے بزرگوں نے کی ہے۔

میں ساتھ ہی خدا سے یہ دعا کرتا ہوں کہ وہ ہم کو عزم صمیم عطا کرے تاکہ ہماری کوششوں کی بدولت مادر ہند کی مقدر کا ستارہ چمکے اور ہمارے دور میں ہند کا شمار دنیا کے صف اوّل کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہو جائے۔

تعلیم

محمد کلیم اللہ حسینی متعلم
ہفتم (ب)

حامد کے والد بہت ہی غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہ محنت مزدوری کر کے گذر اوقات کرتے تھے جب حامد پانچ سال کا ہوا تو ان کے والد نے اُسے حصول تعلیم کے لئے محلہ کے مدرسہ تحتانیہ میں شریک کیا اور مفلسی ہی میں اپنے بچے کو مڈل تک تعلیم دی جب حامد مڈل کامیاب ہو گیا تو اونچی جماعت میں شرکت کے لئے والد کی تنگ دستی نے اُس کا ساتھ نہ دیا جس کی وجہ سے حامد کی تعلیم پر بُرا اثر پڑا۔ مجبوراً حامد ایک ساہوکار کی دوکان پر نوکر ہوا۔ دن کے وقت دوکان میں کام کرتا اور رات میں نائٹ اسکول جایا کرتا تھا۔ اس طرح اس نے میٹرک کامیاب کیا تو بی۔ اے تک تعلیم پانے کا شوق اس کے دل میں پیدا ہوا۔ جس ساہوکار کے پاس وہ نوکر تھا۔ اُس سے کچھ رقم لے کر علی گڈھ کالج کی جماعت انٹر میں اس نے شرکت حاصل کی۔ یہاں ایک دولت مند شخص کا لڑکا محمود اس کا ہم جماعت تھا سالانہ امتحان میں محمود ناکام ہو گیا اور حامد کامیاب۔ محمود نے اپنے والد کو جھوٹا خط لکھ دیا کہ میں کامیاب ہوا ہوں۔ ادھر حامد واقعی کامیاب ہو کر اپنے وطن لوٹ آیا۔ لوگوں نے اس کی بڑی عزت و توقیر کی۔ محمود کا بھی وطن وہی تھا۔ لیکن چونکہ اسے صحبت اچھی نہ مل سکی۔ اس لئے اُس کا زیادہ تر وقت سینما بینی چائے خانہ وغیرہ میں دوستوں کے ساتھ گذرتا تھا۔ بالآخر بری صحبت کا انجام بھی بُرا ہوا۔ علم جیسی بیش قیمت دولت سے وہ محروم رہا۔

جو لڑکے بُری صحبت میں رہتے ہیں وہ کسی بھی امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اے میرے ساتھیو! بُری صحبت سے بچو اور اچھی راہ اختیار کرو، ماں باپ کی باتوں پر سچے دل سے عمل کرو ہمیشہ یاد رکھو کہ "علم وہ سمندر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں"، محنت کرنے پر ہی نعمت ملتی

ہے ۔ مثل مشہور ہے کہ "مدد کر محنت ، کھا نعمت"
علم تو ایک خزانہ ہے ، اور یہ ایک ایسا خزانہ
ہے جو کبھی خالی نہیں ہوتا ۔

طالب علم

سعید احمد منعم
ہفتم (ب)

انسان پیدائش سے موت تک مختلف منازل
طے کرتا ہے اس کی ان منزلوں کے طے کرنے کی مقررہ تفصیل
کا نام زندگی ہے محض اس شاعرانہ خیال ع
"زندگی زندہ دلی کا نام ہے" سے زندگی کی صحیح اور
مکمل تعریف سمجھ میں نہیں آتی ۔ انسان اپنی زندگی
میں ایک شیر خوار بچے سے ترقی کرتا ہوا لڑکپن
میں بحیثیت طالب علم اور نوجوانی میں بحیثیت ایک
معمار ملک و قوم اور بڑھاپے میں بحیثیت نگراں کار
اور ذمہ دار شخص کے اہم خدمت انجام دیتا ہے
اس کی زندگی کا وہ دور انتہائی اہم ہوتا ہے
جبکہ وہ دنیا کے اسٹیج پر بحیثیت ایک طالب علم کے
نمودار ہوتا ہے ۔ یہی وہ زمانہ ہوتا ہے جس کے
دوران میں اس کو دنیا والوں اور دنیا کی ہمہ
قسم کی مصروفیتوں کا سبق عملاً اور اشارۃً
دیا جاتا ہے ۔ گویا وہ ذمہ دارانہ زندگی کا سنگ بنیاد
طالب علمانہ زندگی میں رکھا جاتا ہے ۔ اور
توقع کی جاتی ہے کہ ترقی ، عظمت اور شہرت
کی مہتم بالشان عمارت اس پر تعمیر کی جائیگی ۔
تعلیم و تربیت کے مقاصد کا معاملہ بھی اہم ہے
اس معاملہ کی طرف بھی والدین اور بزرگوں کی توجہ
کو منعطف کرنا بے حد ضروری سمجھتا ہوں کیوں کہ
اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے زمانہ میں والدین
کے پیش نظر یا تو سرے سے کوئی مقصد نہیں ہوتا
یا پھر ان کے سامنے ایسے مقاصد ہوتے ہیں جن کا
وجود بے مقصدی حالت سے بدتر ہوتا ہے ۔

جو والدین اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے
سلسلے میں مقاصد سے غافل یا بے خبر رہتے ہیں
وہ گویا اپنے بچوں کو رہگزار حیات کی منزلوں کی
کڑیاں جھیلنے کے لئے بالکل بے سہارا چھوڑ دیتے
ہیں ۔ اس کا نتیجہ آج موجودہ طالب علموں کے
حالات سے ظاہر ہے ۔ طالب علموں کی زندگی
محض بیجا لاڈ ، پیار اور عدم نگرانی کی وجہ سے برباد
ہو جاتی ہے اگر والدین اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے
معاملہ میں سختی برتیں تو ہمیں اعلیٰ مقاصد کے
حاصل کرنے کے لئے دشواریوں کا سامنا نہیں
کرنا پڑے گا اور اس طرح ہمارا اور ہمارے ملک
کا مستقبل درخشاں ہو سکے گا ۔

چار بہرے

سید عبدالحی
جماعت ہفتم (الف)

ایک بہرا گڈریا کسی پہاڑی پر اپنی بھیڑیں
چرا رہا تھا ۔ دوپہر کو اُسے خوب بھوک لگی ۔ اتفاق
سے وہ اُس دن کھانا اپنے ساتھ نہیں لایا تھا
گڈریا قریب کی ایک جھونپڑی میں گیا ۔ اور جھونپڑی

کے مالک سے کہا کہ "آپ ذرا میری بھیڑیں دیکھتے رہیئے تو جا کر کھانا کھا آؤں ۔ واپس آکر میں آپ کو بھیڑ کا ایک بچہ دوں گا جھونپڑی کا مالک بھی بہرا تھا، اُس نے گڈریئے کی بات نہیں سنی ۔ اور کہا کہ میں بہرا ہوں سُن نہیں سکتا بہرے گڈریے نے سمجھا کہ اُس نے بھیڑوں کی نگرانی منظور کرلی اور یہ کہہ رہا ہے کہ بھیڑوں کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں دیکھتا رہوں گا ۔ گڈریا چلا گیا۔
کھانا کھا کر جب واپس آیا تو یہ دیکھ کر اُسے بہت غصہ آیا کہ اس کی بھیڑیں کسی کی نگرانی کے بغیر اِدھر اُدھر گھوم رہی ہیں وہ فوراً جھونپڑی کے پاس گیا۔ اور اُس پر بگڑنے لگا۔ جھونپڑی والا تو گڈریا کا مطلب سمجھ نہ سکا۔ مگر اس کی غصیلی حرکتوں سے بہت خوش ہوا وہ دونوں ایک دوسرے پر چیخنے لگے۔ مگر دونوں میں کوئی بھی سُن نہ سکتا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے ۔ اسی وقت ایک شخص ٹٹو پر سوار اُدھر سے گذرا مگر قسمت سے وہ بھی بہرا تھا وہ دونوں بہرے اپنا جھگڑا طے کرانے کے لئے دوڑتے ہوئے ٹٹو سوار کے پاس گئے اور دونوں ایک ساتھ چلا چلا کر اپنا مطلب کہنے لگے بہرا ٹٹو سوار سمجھا کہ یہ دونوں مجھ پر ٹٹو چرانے کا الزام لگا رہے ہیں اور مجھے لوٹنا چاہتے ہیں یہ سوچ کر اُسے بھی غصہ آیا وہ بھی لڑ پڑا ۔
یہ تینوں جب لڑتے لڑتے تھک گئے ٹٹو سوار نے سوچا کہ گاؤں کے مکھیا کو اس معاملہ کی اطلاع دینی چاہیئے یہ خیال کرکے وہ گاؤں کی طرف چلا ۔ گڈریا اور جھونپڑی کا مالک بھی ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتے ہوئے ٹٹو سوار کے پیچھے چلے، تینوں گاؤں کے مکھیا کے پاس پہنچے لیکن اتفاق سے وہ مکھیا بھی بہرا تھا کسی بات پر گھر والوں سے ناراض ہو کر غم و غصہ کی حالت میں باہر بیٹھا تھا اتنے میں یہ تینوں بہرے پہنچے ۔ اور ان تینوں نے ایک ساتھ چیخنا، گالیاں بکنا اور دھمکانا شروع کیا۔
مکھیا سمجھا کہ یہ میرے گھر کے معاملات میں دخل دے رہے ہیں اور مجھے بُرا بھلا کہہ رہے ہیں یہ سوچ کر وہ بھی بھڑک اُٹھا اب عجب طوفان بے تمیزی اُٹھا ۔ چاروں بہرے آپس میں زور شور سے لڑنے لگے گاؤں کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے ۔
آخر ایک شخص اس معاملہ کو سمجھ گیا کہ یہ چاروں بہرے ہیں اور غلط فہمی کی بناء پر آپس میں اُلجھ پڑے ہیں ۔ اس شخص نے بیچ بچاؤ کیا اور اصل معاملہ کاغذ پر لکھ کر چاروں کا غصہ ٹھنڈا کرادیا۔

- سید احمد متعلم دہم (ج) نائب صدر انجمن اتحاد طلباء
- محمد محب اللہ متعلم دہم (ل) معتمد انجمن اتحاد طلباء
- خواجہ غوث الدین متعلم نہم (ج) نائب معتمد انجمن اتحاد طلباء

تگ و دو

ہر اک مقام سے آگے گذر گیا مہ نو — کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو
(اقبال)

سال تعلیمی (۵۸-۱۹۵۷ء) کے دوران میں ہماری درس گاہ کے طلبا کی تعلیمی اور زائد از نصاب مصروفیات نیز اساتذہ صاحبان مدرسہ کے زیر نگرانی تعلیم کے مختلف شعبوں کی بتدریج ترقی کی مختصر سی روئداد ذیل میں درج کی جاتی ہے:-

گرمائی تعطیلات اور انفلوئنزا کی وبا کے سلسلے میں دی ہوئی چھٹیوں کے ختم ہونے کے بعد جب ہم نے اسکول میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ مولوی سید جعفر علی صاحب نگراں کار صدر مدرس سے جناب رادھا کرشنا مورتی صاحب نے صدارت مدرسہ کا جائزہ حاصل فرمایا ہے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں جناب رادھا کرشنا مورتی صاحب کا تبادلہ مدرسۂ فوقانیہ مسعود پورہ کی صدارت پر عمل میں آیا آپ نے بتاریخ ۱۹ر جولائی ۱۹۵۷ء جناب سید جعفر علی صاحب اوّل مددگار مدرسہ کو صدارت کا جائزہ دے دیا۔ پھر ۸ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کو جناب رادھیکا پرشاد صاحب مددگار سٹی کالج، ہماری درس گاہ کے صدر کی حیثیت سے تشریف لائے صدر کی حیثیت سے آپ نے طلباء کے لئے بہت سے مفید کام انجام دیئے۔ اس نیک نہاد شریف النفس اور شفیق صدر نے اپنی صدارت کے دور میں پُرخلوص برتاؤ سے طلباء و اساتذہ صاحبان کے دلوں کو مسخر کرلیا تھا لیکن آپ کو آئے ہوئے چند ہی مہینے گذرے تھے کہ آپ کا تبادلہ سٹی کالج کی گزیٹڈ مددگاری پر عمل میں آیا۔ اور ۱۷ر فروری ۱۹۵۸ء کو جناب محمد حمید الدین صاحب مددگار ہمہ مقصدی ہائی اسکول ہنمکنڈہ نے آپ سے صدارت مدرسہ کا جائزہ حاصل فرمایا۔ جناب محمد حمید الدین صاحب صحیح معنوں میں سابق صدر مدرسہ جناب رادھیکا پرشاد صاحب کے جانشین ہیں، طلباء سے انکی مشفقانہ محبت، پُرخلوص ہمدردی اور تعلیمی و زائد از نصاب مصروفیات سے اُن کی غیر معمولی دلچسپی کی بدولت توقع ہے کہ ہمارا مدرسہ ہمہ جہتی ترقی کرے گا۔

درخت اُگاؤ مہم

جولائی ۱۹۵۷ء میں "درخت اُگاؤ مہم" کے سلسلہ میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا، جسے محترم صدر مدرسہ اور جناب سید عبد الرزاق صاحب فاروقی ڈرائنگ ماسٹر نے مخاطب فرمایا۔ اور "درختوں کی نگہداشت" کی اہمیت کو وضاحت سے بیان کیا۔

صد سالہ جد و جہد آزادی اور دہ سالہ آزادی کا جشن

۱۵ راگسٹ و ۱۶۔ اگسٹ ۱۹۵۷ء کو ہمارے مدرسہ میں بھی بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ صبح (۷) بجے اے، سی سی اسکاؤٹنگ اسپورٹس اور گیمس کے طلباء نے بیانڈ کے ساتھ مارچ پاسٹ کیا پھر ½ ۸ بجے صبح صدر مدرسہ جناب سید جعفر علی صاحب نے پرچم کشائی کی رسم ادا فرمائی۔ قومی ترانہ طلبا اور اساتذہ صاحبان مدرسہ نے مل کر پڑھا۔ اس کے بعد بعض اساتذہ صاحبان اور صدر مدرسہ کی تقریریں ہوئیں جن میں فاضل مقررین نے دس سالہ آزادی اور صد سالہ جد و جہد آزادی کے جشن پر تفصیل سے روشنی ڈالی طلباء میں شیرینی تقسیم کی گئی ۲ ساعت دوپہر سے اُردو، انگریزی اور تلگو میں تقریری مقابلے منعقد ہوئے، ان تقریری مقابلوں کی صدارت جناب سید علی صاحب مشاکر مدد گار مدرسہ نے فرمائی۔ دو بجے سے چار بجے تک آوٹ ڈور سپورٹس اور گیمس کے مقابلے منعقد ہوئے، ان کھیلوں میں جیتنے والے طلبا اور تقریری اور تحریری مقابلوں میں اوّل و دوم آنے والے طلباء کو اسی روز شام میں منعقدہ جلسہ میں جناب سید جعفر علی صاحب نگران کار صدر مدرسہ نے انعامات تقسیم فرمائے۔ تقریری و تحریری مقابلوں اور اسپورٹس و گیمس کے جملہ انعامات (۶۳) تھے رات میں مدرسہ کی عمارت پر روشنی کی گئی۔ جشن صد سالہ جد و جہد آزادی و دہ سالہ آزادی کی یہ مصروفیات رات میں محفل موسیقی کے انعقاد پر ختم ہوئیں۔ اس جشن کے تمام انتظامات اساتذہ صاحبان مدرسہ پر مشتمل ایک سب کمیٹی کے اراکین مسٹر فصیح الدین ریاض مسٹر پی، بھاسکر راؤ، مسٹر محمود حسین، مسٹر سید عبد الرحمٰن منیول انسٹرکٹر مسٹر محمد سبحان، مسٹر مرزا انتراب علی بیگ، مسٹر محمد منظور احمد نے کئے تھے۔

محمد عبد الکریم صاحب، کرشنا مورتی صاحب، راج ریڈی صاحب، شنکر پا شاستری صاحب، سید عباس حسین صاحب، پی بھاسکر راؤ صاحب نے اس جشن کے سلسلہ میں منعقد شدہ اُردو، تلگو اور انگریزی تقریری مقابلوں میں حکم کے فرائض انجام دیئے۔ ہم ان تمام اساتذہ صاحبان کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں

ریڈیائی مباحثے

آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد کی طرف سے "اسٹوڈنٹس براڈ کاسٹ" کے پروگرام میں بتاریخ ۳ ستمبر ۱۹۵۷ء بروز شنبہ بوقت ۴۵-۳ شام ایک ریڈیائی مباحثہ نشر کیا گیا۔ مباحثہ میں مجیدیہ گرلز ہائی اسکول کی تین طالبات اور ہماری درسگاہ کے تین طلباء نے حصہ لیا۔ اس دلچسپ مباحثہ کا عنوان تھا:- "لڑکیاں لڑکوں کے مقابلہ میں زیادہ ذہین ہوتی ہیں"

نائب صدر انجمن اتحاد طلبا

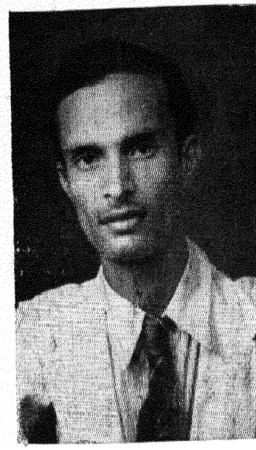

سید احمد متعلم دهم (ج)

معتمد انجمن اتحاد طلبا

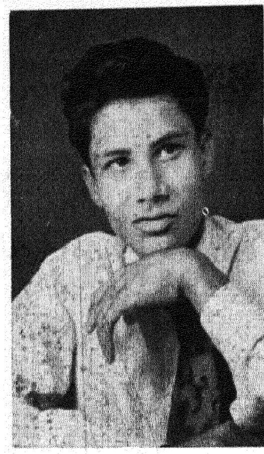

محمد مجیب اللہ متعلم دهم (الف)

نائب معتمد انجمن اتحاد طلبا

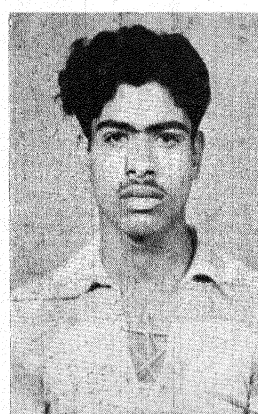

خواجہ غوث الدین متعلم نہم (ج)

خواجہ غوث الدین اور سراج الدین خاں کلکتہ میں منعقدہ آل انڈیا انٹر ہائی اسکولس کبڈی ٹورنمنٹ میں حصہ لینے کے لئے آندھرا پردیش کی طرف سے روانہ کردہ ٹیم میں شریک تھے۔

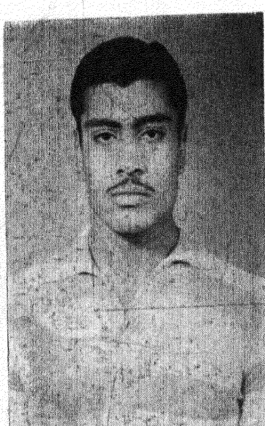

سراج الدین خاں متعلم نہم (ج)

مجلس ادارت ۵۸—۱۹۵۷ء

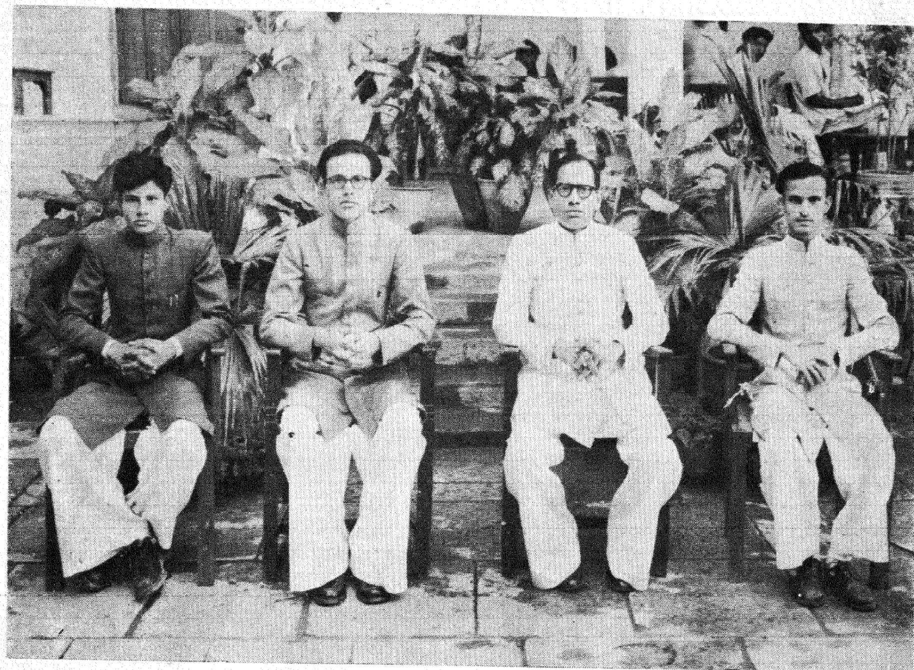

دائیں سے بائیں:— سید احمد متعلم دہم (ج) مدیر — جناب محمد حمید الدین صاحب صدر مدرس۔سرپرست — محمد منظور احمد منیجنگ ایڈیٹر

محمد مجیب اللہ متعلم دہم (الف) نائب مدیر

(۱۸) منٹ کے اس پروگرام میں ہمارے مدرسہ کی طرف سے محمد ضیاء اللہ متعلم دہم (ب) سید عبد الغفار متعلم دہم (ب) اور لطیف محی الدین متعلم دہم (ج) نے حصہ لیا۔

اسی طرح کا ایک اور ریڈیائی مباحثہ ہماری درس گاہ اور مدرسہ فوقانیہ دارالشفاء کے طلبا کے درمیان ۲۲ر نومبر ۱۹۵۷ء کو منعقد ہوا اس مباحثہ کا عنوان تھا۔ "کھیل، تعلیم سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں" یہ مباحثہ بھی کافی دلچسپ رہا

امریکی تعلیمی فلم

امریکن انفرمیشن لائبریری کی طرف سے ہمارے مدرسہ کے طلبا کو بتاریخ ۲۵ر ستمبر ۱۹۵۷ء بروز چہارشنبہ بوقت ۳۰-۶ ساعت شام امریکی تعلیمی فلم دکھلائے گئے۔ جناب سید یوسف صاحب بی۔ایس سی (آنرز) سائنس ماسٹر نے اس سلسلے میں ضروری انتظامات کئے۔ نظم وضبط کی برقراری میں جناب عبد الکریم صاحب ایم۔اے (عثمانیہ) جناب شیخ محی الدین صاحب جناب محمد سبحان صاحب اسکاؤٹ ماسٹر جناب مرزا انزاب علی بیگ صاحب اسسٹنٹ اسکاؤٹ ماسٹر جناب سید عبد الرزاق صاحب فاروقی ڈرائنگ ماسٹر اور جناب فصیح الدین صاحب ریاض فزیکل انسٹرکٹر نے حصہ لیا۔

امریکن انفرمیشن لائبریری کی طرف سے بتاریخ ۲۹ر نومبر بروز جمعہ بوقت ½ ۶ ساعت شام طلبائے مدرسہ کو اسی طرح کے تعلیمی و معلوماتی فلم دکھائے گئے۔ مسٹر وسنت راؤ سائنس ماسٹر نے انتظامات فرمائے۔

انجمن اتحاد طلبا کے انتخابات

انجمن اتحاد طلباء کے انتخابات بتاریخ ۲۷ ستمبر ۱۹۵۷ء بروز جمعہ بوقت (۱۰) ساعت صبح منعقد کئے گئے۔ رائے دہی میں جماعت ہشتم تا دہم کے طلبا نے حصہ لیا۔ دو وزارتوں، احمد وزارت (سید احمد متعلم دہم ج نائب صدر محمد مجیب اللہ متعلم دہم (ا) معتمد، خواجہ غوث الدین متعلم نہم (ج) نائب معتمد) اور ضیاء وزارت (محمد ضیاء اللہ متعلم دہم (ب) نائب صدر، سید عبد الغفار متعلم دہم (ب) معتمد اور حسین خاں متعلم نہم (ب) نائب معتمد) نے اپنی اپنی وزارت کے عہدہ داروں کے ناموں کی صراحت کے ساتھ مقابلہ میں شریک ہونے کا اعلان کیا۔ احمد وزارت کا نشان امتیازی "شمع" تھا اور ضیاء وزارت کا نشانِ امتیازی "کتاب"۔ ووٹ استعمال کرنے والے طلبا کی تعداد (۳۸۸) تھی۔ احمد وزارت نے (۲۱۹) ووٹ حاصل کئے اور ضیاء وزارت نے (۱۶۸) ووٹ۔ (۱) ووٹ ناکارہ قرار دیا گیا۔ احمد وزارت نے (۵۰) ووٹوں کی اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ منتخب شدہ کابینہ کے عہدہ داروں اور جماعت واری نمائندوں کے نام یہ ہیں۔ (۱) سید احمد متعلم دہم (ج) نائب صدر انجمن اتحادِ طلبا۔ محمد مجیب اللہ متعلم دہم (ا)

معتمد انجمن، خواجہ غوث الدین متعلم نہم (ج) نائب معتمد انجمن، جماعتواری نمایندے: احمد عبدالعلیم صدیقی متعلم دہم (ڈ) محمد عبدالواسع متعلم دہم (ب) شیخ غلام دستگیر متعلم دہم (ج)، عروج احمد خاں متعلم نہم (ڈ) حمید الحق متعلم نہم (ب) سراج الدین خاں متعلم نہم (ج) حامد محی الدین متعلم ہشتم (ڈ) ۔ (بلا مقابلہ منتخب) احمد شریف متعلم ہشتم (ڈ) سید غوث احمد الدین متعلم ہشتم (ج) غیاث الدین متعلم ہشتم (د) ۔ خوشی کی بات ہے کہ طلبائے مدرسہ نے انتخابات سے قبل پروپگنڈہ کی مہم کے دوران میں اور انتخابات کے دن انتہائی نظم و ضبط، سلیقہ اور شائستگی کا قابل تعریف مظاہرہ کیا۔ انتخابات کے دن مولوی عبدالکریم صاحب نے پریسائیڈنگ آفیسر مولوی محمود حسین صاحب اور مسٹر پی۔ بھاسکر راؤ پولنگ آفیسر اور اہلکار مدرسہ مسٹر محمد یحیٰی نے پول چیٹ کلرک کا کام بحسن و خوبی انجام دیا۔ چیف الکٹورل آفیسر حکومت آندھرا پردیش نے گذشتہ سال کی طرح اس سال بھی تین بالٹ باکس عاریتاً عنایت فرمائے۔ اس تعاون کے لئے ہم جناب چیف الکٹورل آفیسر حکومت آندھرا پردیش کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

جلسۂ کرسی نشینی انجمن اتحاد طلباء کا جلسہ کرسی نشینی بتاریخ ۱۷ ۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء بروز پنجشنبہ بوقت (۱۱) ساعت صبح منعقد ہوا۔ جناب حبیب الرحمٰن صاحب معتمد انجمن ترقی اردو حیدرآباد نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ جلسہ کی ابتداء جناب رادھیکا پرشاد صاحب صدر مدرس کی تعارفی تقریر سے ہوئی۔ صدر مدرسہ کی درخواست پر معزز مہمان خصوصی جناب حبیب الرحمٰن صاحب نے کرسی صدارت پر رونق افروز ہو کرنیٔ کابینہ کی گلپوشی فرمائی اور پھر جلسہ کی کارروائی کا آغاز فرمایا۔ سب سے پہلے سید احمد متعلم دہم (ج) منتخب نائب صدر انجمن اتحاد طلباء نے مختصر سی تقریر کی۔ جس میں انھوں نے طلبا کی طرف سے یقین دلایا کہ وہ ہمیشہ نظم و ضبط مدرسہ کا خیال رکھیں گے۔ انھوں نے اپنے ساتھی طلباء سے کہا کہ وہ حصول تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ ہوں۔ نائب صدر انجمن اتحاد طلبا کے بعد صدر مدرسہ جناب رادھیکا پرشاد صاحب نے طلبا و اساتذہ صاحبان مدرسہ کو دلچسپ انداز میں مخاطب کیا۔

جناب رادھیکا پرشاد صاحب کی تقریر کے بعد معزز مہمان خصوصی جناب حبیب الرحمٰن صاحب نے صدارتی تقریر فرمائی طلبائے مدرسہ نے آپ کی پُر از معلومات جامع اور نصیحت آموز تقریر کو توجہ سے سنا صدر جلسہ کی تقریر کے چند اہم اجزا حیدرآباد دکن کے روزناموں مثلاً رہنمائے دکن، سیاست، نظام گزٹ مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء اور علی گڈھ کے ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" مورخہ یکم نومبر ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئے تھے۔ جنھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جناب حبیب الرحمٰن صاحب نے طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "اردو کو صرف مسلمانوں

کی زبان قرار دے کر نظر انداز کرنا تمام ہندوستانیوں کے ساتھ ناانصافی کرنے کے مترادف ہے اُردو تمام ہندوستان کے عوام کی مشترکہ زبان ہے وہ ہند میں پھلی پھولی اور پروان چڑھی اسی کو یہیں ترقی کے مواقع ملنے چاہئیں، ہندی ایک اچھی زبان ہے جو ہر ہندوستانی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن ہندی کو ادق بنا کر اس کے مقصد کو نقصان پہونچایا جا رہا ہے اردو کا مسئلہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ تمام ہندوستانیوں سے تعلق رکھتا ہے، مدراس کے اکثر مسلمان ٹامل بولتے ہیں۔ لکھنؤ میں ہزاروں ہندو اردو بولتے ہیں۔ اگر اُردو کو صرف مسلمانوں کی زبان بنایا جائے تو پہلے یہ دیکھنا پڑیگا کہ یہ عربستان سے تو نہیں آئی؟ کیا وہاں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے؟ مولوی حبیب الرحمن صاحب نے طلبا پر زور دیا کہ وہ ہر سال کم از کم ایک آن پڑھ کو اردو پڑھائیں اور اُردو کی کتابیں اور اخبارات خرید کر پڑھیں تاکہ ان کے چھاپنے والے اس سلسلہ کو جاری رکھ سکیں اُنھوں نے کہا کہ زبانوں کی ترقی کا انحصار اُس کے لٹریچر پر اور ان کے بولنے والوں کی تعداد کے زیادہ سے زیادہ ہونے پر ہے"۔

صدارتی تقریر کے بعد حیدرآباد کے مشہور اور ہر دلعزیز شاعر جناب غلام سرور صاحب ڈونڈا نے اپنا کلام سنایا اور آخر میں محمد محبیب اللہ متعلم دہم (ل) معتمد انجمن اتحاد طلبا نے معزز مہمان خصوصی اور دیگر مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

غذا اور انسانی بیماریوں کا سدباب

ڈاکٹر ایشور چند سکسینہ نے بتاریخ ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء بروز سہ شنبہ بوقت (۳) ساعت شام طلبائے مدرسہ کو بعنوان "غذا اور انسانی بیماریوں کا سدباب" مخاطب فرمایا۔ جلسہ کی صدارت جناب رادھیکا پرشاد صاحب صدر مدرس نے فرمائی۔

امریکی رنگین فلم کی نمایش

جناب ڈاکٹر محمد سعید الدین صاحب پرنسپل سائنس کالج نے ہماری درخواست پر امریکی رنگین فلم کی نمائش فرمائی۔ یہ رنگین فلم دلچسپ اور جاذب نظر تھا فلم کی نمایش سے قبل، جناب رادھیکا پرشاد صاحب صدر مدرس نے تعارفی تقریر فرمائی۔ اس امریکی رنگین فلم کی نمائش کے اختتام پر محترم صدر مدرسہ نے معزز مہمان جناب ڈاکٹر محمد سعید الدین صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

عالمی یوم اطفال

جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند کے یوم ولادت یعنی ۱۴ نومبر ۵۷ء پنجشنبہ کو عالمی یوم اطفال منایا گیا۔ اس دن ہماری درسگاہ میں

ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ محمد منظور احمد صاحب۔ جناب سید عبد الرزاق صاحب فاروقی اور جناب رادھیکا پرشاد صاحب صدر مدرس نے جلسہ کو مخاطب کیا۔ مقرر صاحبان نے ملک کی ترقی کیلئے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت پر زور دیا۔ تاکہ ان میں آئندہ اہم ذمہ داریوں کے سنبھالنے کی اعلیٰ صلاحیتیں پیدا ہوسکیں۔ چاچا نہرو کو بچوں سے جو دلی محبت ہے اس کا تذکرہ بھی ان تقریروں میں کیا گیا۔

ٹرافک کنٹرول مسٹر ابو القاسم نے بتاریخ ۱۵۔ مارچ ۱۹۵۸ء روز شنبہ بوقت (۱۱) ساعت صبح "ٹرافک کنٹرول" کے عنوان سے طلباء و اساتذہ صاحبان مدرسہ کو مخاطب فرمایا۔ جلسہ کی صدارت جناب سید جعفر علی صاحب اول مددگار نے فرمائی۔

مینول ٹریننگ کے عملی اسباق گورنمنٹ کالج آف فائن آرٹس حیدرآباد کے گیارہ زیر تربیت اساتذہ صاحبان نے ہمارے اسکول میں مینول ٹریننگ کے نمونہ کے اسباق دیئے اور طلباء کو کام سیکھنے کی مشق کروائی۔ یہ مینول ٹریننگ فروری ۱۹۵۸ء میں چار ہفتوں تک ہوتی رہی۔ ہمارے مدرسہ کے مینول انسٹرکٹر جناب سید عبد الرحمٰن صاحب اس کام کے نگران کار تھے۔ آپ نے بعید مستعدی سے مینول ٹریننگ کے ان زیر تربیت اساتذہ صاحبان کی حتی الامکان مدد فرمائی۔

جلسہ سالانہ ہماری درس گاہ کا جلسہ سالانہ بتاریخ ۱۷۔ مارچ ۱۹۵۸ء روز دوشنبہ زیر صدارت جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور پرنسپل چادر گھاٹ کالج منعقد کیا گیا۔ ڈاکٹر زور نے طلباء میں انعامات تقسیم فرمائے صدر جلسہ کی آمد پر طلباء نے گارڈ آف آنر پیش کیا۔ جلسہ کی ابتداء جناب محمد حمید الدین صاحب صدر مدرس کی تعارفی تقریر سے ہوئی۔ اس کے بعد معزز مہمان خصوصی کی گلپوشی کی گئی۔ پھر صدر مدرس جناب محمد حمید الدین صاحب نے سال تعلیمی کی مصروفیات کی رپورٹ سنائی۔ اس کے بعد صدر جلسہ ڈاکٹر زور نے طلباء میں (۲۳۵) انعامات تقسیم فرمائے۔ تقسیم انعامات کے بعد ڈاکٹر زور نے طلبا کو مخاطب فرمایا۔ آپ نے طلباء اور نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ "ایک سے زائد زبانیں سیکھنا رائیگاں نہیں جاتا۔ اس سے ملک و قوم اور خاندان کو فائدہ ہوگا۔ اور یہ سب کیلئے مسرت کا باعث ہے۔ طلباء کا فرض ہے کہ وہ اردو کے ساتھ ساتھ ریاست کی زبان تلگو کو بھی بتدریج سیکھیں تاکہ وہ عملی زندگی میں کامیاب ثابت ہوسکیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ اُردو بولنے والے تین چار زبانوں کے ماہر ہوتے تھے۔ انھیں اُردو کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی میں عبور حاصل تھا۔ اب بھی ضرورت ہے کہ

اردو داں اردو کے ساتھ دوسری زبانیں سیکھیں" آپ کی یہ تقریر ۱۸- مارچ ۱۹۵۸ء کے روزنامہ سیاست اور روزنامہ رہنمائے دکن وغیرہ میں شائع ہوئی۔ اس موقع پر سابق طلباء اور شہر حیدرآباد کے اکثر مدارس کے صدور موجود تھے جن میں مسرز ذوالفقار علیخاں (مدرسہ فوقانیہ گوشہ محل) مرزا سرفراز علی (مدرسۂ فوقانیہ مشقی خیریت آباد) محمد اعظم (مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم) محمد رضا (مدرسہ فوقانیہ دارالشفاء) عبدالوہاب خاں (مدرسہ فوقانیہ چنچل گوڑہ) مغنی تبسم لکچرار (اردو کالج حمایت نگر) مسٹر نظام الدین صدیقی انسپکٹر آف فزیکل ایجوکیشن مسٹر سوما سندرم مہتمم تعلیمات بلدہ۔ مسٹر محمود حسین اسسٹنٹ سکریٹری پبلک سروس کمیشن۔ مسٹر خواجہ حمید الدین شاہد لکچرار اردو چادرگھاٹ کالج اور امیر حسن انسپکٹر ہیبول ٹریننگ قابل ذکر ہیں

صدارتی تقریر کے بعد محمد مجیب اللہ متعلم دہم (الف) معتمد انجمن اتحاد طلباء نے معزز مہمان خصوصی اور دیگر مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ قومی ترانہ پر یہ خوشگوار تقریب اختتام کو پہنچی۔

تقریری و تحریری مقابلے

سال تعلیمی کے دوران میں مدرسہ میں طلبا کے تقریری و تحریری مقابلے منعقد کئے گئے۔ ۱۴- اگسٹ ۱۹۵۷ء چہارشنبہ کے اردو تقریری مقابلہ میں طبقہ فوقانیہ سے ضیاء اللہ متعلم دہم (ب) اول۔ معین الدین متعلم دہم (ب) دوم اور مظہر اللہ شریف متعلم دہم (ب) سوم آئے۔ تلگو تقریری مقابلہ میں عبدالستار متعلم دہم (ب) کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ اور انگریزی تقریری مقابلہ میں احمد عبدالواسع متعلم نہم (ب) انعام کے مستحق قرار دیئے گئے۔ طبقہ وسطانیہ سے اردو تقریری مقابلہ میں سید اظہر سلیم کرمانی متعلم ہفتم (ب) اول اور خواجہ رفیع الدین متعلم ہفتم (ب) دوم آئے۔

۲۷ نومبر ۱۹۵۷ء چہارشنبہ کو ایک اور اردو تقریری مقابلہ منعقد کیا گیا جس کا عنوان تھا "سائنس کی ترقی امن عالم کے لئے خطرہ ہے"۔ اس مقابلہ میں ضیاء اللہ متعلم دہم (ب) اول، سید معین الدین متعلم دہم (ب) دوم اور سید عبدالغفار متعلم دہم (ب) سوم قرار دیئے گئے۔

اردو، تلگو اور انگریزی تحریری مقابلے ۱۴- اگسٹ ۱۹۵۷ء چہارشنبہ ۱۳- اکٹوبر ۱۹۵۷ء یکشنبہ، یکم ڈسمبر ۱۹۵۷ء یکشنبہ ۱۲ جنوری ۱۹۵۸ء سہ شنبہ، ۲۷- فروری ۱۹۵۸ء پنجشنبہ اور ۱۵- مارچ ۱۹۵۸ء کو منعقد کئے گئے۔ ان مقابلوں میں علی الترتیب اختر سعید احمد متعلم دہم (الف) احسان محمد متعلم نہم (الف)، سید لطیف محی الدین قادری متعلم دہم (ج)، اختر سعید احمد متعلم دہم (الف)، سید ولی اللہ حسینی متعلم دہم (ج) انعام اول کے مستحق قرار دیئے گئے۔ انعام دوم علی الترتیب محمد یعقوب متعلم دہم (ج)، خواجہ احمد علی شاہ قادری متعلم نہم (د) سید سراج الدین احمد متعلم دہم (ب) احسان محمد متعلم نہم (الف) اور اختر سعید احمد متعلم دہم (الف) نے حاصل کیا۔
تلگو، تحریری مقابلوں میں محمد عبدالستار متعلم دہم (ب) اور گوبند کانت پرشاد متعلم نہم (ب) نے انعامات اوّل و دوم حاصل کئے۔ ان تحریری مقابلوں کے مضامین کی جانچ جناب محمد عبدالکریم صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)

نے فرمائی، جس کے لئے ہم اپنے استاد محترم کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

دارالمطالعہ طلباء کے معتمد جناب محمود حسین صاحب مددگار مدرسہ ہیں۔ آپ کی نگرانی میں اخبارات و رسائل پابندی سے دارالمطالعہ کی میز پر رکھے جاتے ہیں۔ اخبارات میں رہنمائے دکن، سیاست، دکن کرانیکل، آندھرا پربھا، ہندو، پرجا متا، رسائل میں کھلونا، پھلواری چندا ماما، بالا، نیا ہند (الہ آباد) صباء ہندوستانی ادب، نگار، انڈین ریویو، لریڈرس ڈائجسٹ، قابل ذکر ہیں۔ بچوں کے مطالعہ کے قابل چھوٹی چھوٹی انگریزی کتب کا معتدبہ اضافہ جناب راد ھیکا پرشاد صاحب کی صدارت کے دور میں ہوا، اور آپ نے "ٹرے سسٹم" بھی جاری کیا جس کے ذریعہ چند پیریڈز میں جماعتوں میں کتب کی کشتیاں روانہ کی جاتی ہیں۔ اس طریقہ کار سے بچوں کے ذوق مطالعہ میں کافی اضافہ ہوا۔

کتب خانہ اساتذہ اس سال تعلیمی کے دوران میں کتب خانہ اساتذہ کی کتابوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ خصوصاً انگریزی، ہندی اور اردو کی قابل مطالعہ کتابیں خریدی گئیں۔ اس شعبہ کے نگران مولوی مرزا تراب علی بیگ صاحب ہیں۔ آپ کی مستعدی کی بدولت اساتذہ صاحبان مدرسہ کسی وقت بھی حسب مرضی سہولت سے کتب حاصل فرماتے ہیں۔ مولوی مرزا تراب علی بیگ صاحب اپنے اس کام میں بطور خاص دلچسپی لیتے ہیں۔

پور فنڈ کے معتمد جناب شریف الحسن صاحب ہیں، اس شعبہ کا کام حسن و خوبی کے ساتھ انجام پا رہا ہے۔

اے۔سی۔سی کے شعبہ کے نگران مسٹر پی بھاسکر راؤ ہیں۔ حال ہی میں مسٹر اے پریندر کمار اور شیخ محی الدین صاحب اساتذہ صاحبان مدرسہ نے بمقام چتور اے سی سی کی تین ہفتوں کی ٹریننگ حاصل فرمائی اس سے پیشتر جناب مرزا تراب علی بیگ صاحب نے بھی اے سی سی کی ٹریننگ حاصل کی تھی۔ ۲۰ رجنوری ۱۹۵۸ء سے ۲۹ رجنوری ۱۹۵۸ء تک گگن پہاڑ شمس آباد پر اے سی سی لیبر اینڈ سوشل سروس کیمپ کا انتظام ہوا تھا۔ ہمارے مدرسہ کے (۲۵) طلباء بھی اس میں شریک تھے۔ اور سخت محنت کے صلہ میں انھوں نے ایک امتیازی انعام حاصل کیا۔ ہم جناب پی۔ بھاسکر راؤ صاحب کو اے سی سی کے طلباء کی اس کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں۔

شعبۂ امتحان کے نگران مسٹر پی بھاسکر راؤ ہیں مسٹر عبدالرحمن ان کے اس اہم کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں مسٹر پی بھاسکر راؤ اور عبدالرحمن کی دلچسپی کی وجہ سے مدرسہ کے امتحانات خوش اسلوبی سے منعقد ہوا کرتے ہیں۔

اسکاوٹنگ مدرسہ میں ایک ٹروپ ۳۲- اسکاوٹس کا تھا۔ مگر سال حال ایک اور ٹروپ کا اضافہ کیا گیا جس میں ۲۴ اسکاوٹس ہیں۔

پہلے ٹروپ کے اسکاوٹ ماسٹر، مرزا تراب علی بیگ صاحب اور دوسرے ٹروپ کے اسکاوٹ ماسٹر مولوی فصیح الدین صاحب ریاض ہیں۔

محمد سبحان صاحب گروپ اسکاوٹ ماسٹر و اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ کمشنر سٹی نمبر (۱) ہیں مدرسہ کے ٹروپ نے اس سال ۳ ہائیکس اور او ورنائیٹ ہائیک کئے۔

اس کے علاوہ بہ سلسلہ ہفتہ کشافہ مدرسہ نے ہر کام میں حصہ لیا۔ ایک انعام اوّل دستی صنعت کا اور ایک انعام دوم ورائٹی انٹرٹینمنٹ کا حاصل کیا۔

پہلی آندھرا جمہوری میں ہمارے مدرسہ کے ۱۶- اسکاوٹس بہ نگرانی مرزا تراب علی بیگ صاحب کیمپ میں شریک رہے۔ اور جمبوری میں کیمپ کرافٹ ( ) اور اسکاوٹنگ کے مقابلوں میں درجہ اول کا ایک ایک انعام حاصل کیا۔ ہمارے مدرسہ کے اسکاوٹس نے ان انعامات کے علاوہ دو درجۂ دوم کے انعامات اسکاوٹس کی نمائش میں بھی حاصل کئے۔

مولوی محمد سبحان صاحب نے بہ حیثیت اسسٹنٹ ڈائرکٹر نمائش اپنی خدمات جمبوری میں ادا کیں۔ جمبوری کے موقع پر مدرسہ کے دوسرے ٹروپ کی بیانڈ پارٹی نے مسٹر فصیح الدین ریاض کی زیر نگرانی حصہ لیا جس سے مدرسہ کی نیک نامی کو چار چاند لگ گئے۔ اس بیانڈ پارٹی نے بیانڈ کا خصوصی انعام حاصل کیا۔ ہمارے اسکاوٹس نے جمبوری میں فزیکل ڈسپلے بھی پیش کیا جس کی کامیابی کا سہرا مولوی ریاض صاحب کے سر ہے۔ مولوی محمد سبحان صاحب اپنی گوناگوں مصروفیات ڈسٹرکٹ کی انجام دے کر مدرسہ کے اسکاوٹس کے لئے بھی کافی وقت دیتے ہیں۔

گیمس طلباء کے کھیلوں کے نگران جناب فصیح الدین صاحب ریاض ہیں وہ اپنے مفوضہ کام بیحد شوق اور دلچسپی سے انجام دیتے ہیں۔ ریاض صاحب ہی کے زیر نگرانی اتھلیٹک اسوسی ایشن کے بین المدارس مقابلوں میں فٹ بال، کبڈی اور اسپورٹس میں مدرسہ کی ٹیمیں شریک ہو کر اپنے معیاری کھیل کا مظاہرہ کرتی رہی ہیں۔ گذشتہ مہینہ میں ہمارے پاس کے دو کھلاڑی سراج الدین خاں اور خواجہ غوث الدین نے آندھرا پردیش کی جانب سے بین صوبجاتی ٹورنمنٹ کبڈی میں نمایندگی کی ہے۔ ہمارے مدرسہ کی بیانڈ پارٹی نے آندھرا پردیش جمبوری میں جس کا انعقاد سکندرآباد میں ہوا تھا۔ اسٹیٹ اسکاوٹ بیانڈ کے نام سے پیش ہو کر غیر معمولی شہرت

حاصل کی۔ مدرسہ نے اکٹوبر ۱۹۵۷ء میں یونائیٹڈ نیشنل ڈے کے موقع پر سکندرآباد کو بین المدارس مقابلوں میں شہر حیدرآباد کی نمایندگی کرکے انعام اول حاصل کیا۔ ۱۴۔نومبر ۱۹۵۷ء کو ہمارے وزیراعظم **پنڈت جواہر لال نہرو** کی سالگرہ کی تقریب کے موقع پر چلڈرنس ریالی میں جس کا انتظام نمائش تھیٹر میں کیا گیا تھا۔ انعام اول حاصل کیا۔ مدرسہ کے طلباء نے ۲۶۔جنوری ۱۹۵۸ء کو جشن جمہوریہ کے سلسلہ میں فتح میدان پر بین المدارس مارچنگ پاس اکسرسائزز اور ٹو سیلے کے مقابلوں میں شریک ہوکر نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح یکم مارچ ۱۹۵۸ء کو اتھلیٹک اسپورٹس کے فائنل کے موقع پر مارچنگ کا انعام اول حاصل کیا۔ بہرحال مدرسہ نے کھیلوں اور دیگر ورزشی مقابلوں میں کشادہ میدان نہ رکھنے کے باوجود نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

جلسۂ سالانہ (۷ مارچ ۱۹۵۸ء) کے سلسلہ میں مختلف قسم کے دس ٹورنمنٹ منعقد کئے گئے ان ٹورنمنٹس میں جیتنے والے طلباء کو ڈاکٹر زور نے انعامات تقسیم کئے۔

محفل موسیقی ہمارے مدرسہ کی انجمن اتحاد طلباء کے زیراہتمام تاریخ ۴۔مارچ ۱۹۵۸ء بروز شنبہ بوقت ۷½ ساعت شب محفل موسیقی منعقد کی گئی۔ جناب فصیح الدین صاحب ریاض نے اس محفل کے انتظامات کئے۔ مسرز پی۔ بھاسکر راؤ، عبدالقادر، عبدالرحمٰن، عبدالرزاق فاروقی، محمد سبحان، مرزا تراب علی بیگ محمود حسین، اساتذہ صاحبان مدرسہ نے ان انتظامات میں مدد فرمائی۔ جناب محمد حمیدالدین صاحب صدر مدرس کی دلچسپی کی بدولت محفل موسیقی خوش سلیقگی سے منعقد ہوئی۔ موسیقی کے پروگرام میں مدرسہ کے طلباء میں حبیب احمد راشد، ریاض میر محمود علی، محمد عبدالوحید، موئیدالدین نے حصہ لیا۔ بیرونی فن کاروں میں امیچرز سوسائٹی آف میوزک اینڈ آرٹس، حمایت نگر کے معتمد، خازن اور پروگرام اگزیکیٹیو، مسرز عابد علی خاں، اسداللہ احمد، اور محمود ندیم، نے اپنے دلکش نغموں سے سامعین کو محظوظ کیا۔ موسیقی کا یہ دلچسپ پروگرام تقریباً ۱۲ بجے شب اختتام کو پہونچا۔

تفریحات :۔ دوران سال تعلیمی میں طلباء نے چار مرتبہ تعلیمی تفریح کی۔ ۲۔ستمبر ۱۹۵۷ء ۲۸۔ اگسٹ ۱۹۵۷ء ۱۲۔اکتوبر ۱۹۵۷ء اور ۳۰۔نومبر ۱۹۵۷ء کو طلباء نے مسرز سرنیدر کمار، عبدالرحمٰن فصیح الدین ریاض، پی۔ بھاسکر راؤ، سید یوسف اساتذہ صاحبان مدرسہ کی زیر نگرانی حیدرآباد کے مختلف تاریخی مقامات کی سیر کی۔

آخر میں ہم صدر مدرس جناب محمد حمیدالدین صاحب کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے طلباء کی تعلیمی ذوق اور نصاب صرف فیات کی تکمیل کے سلسلہ میں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی۔ ہم جمیع طلباء و اساتذہ صاحبان مدرسہ کے بھی شکرگذار ہیں کہ ان کے تعاون کی بدولت ہم اپنی کابینہ کے مختلف پروگراموں کو عملی جامہ پہنا سکے۔

پچھلے شمارے پر تبصرہ

" نورس" بابتہ اپریل ۱۹۵۸ء کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ کے عنایت نامہ مورخہ ۵ا مئی ۱۹۵۸ء اور روزنامہ سیاست حیدرآباد کے تبصرہ کی نقل، دلی شکریہ کے ساتھ ذیل میں درج کی جاتی ہے :-

مکرمی۔ تسلیم

"نورس" کے دو شمار ے "ہماری زبان" میں تبصرے کے لئے اور ایک میرے لئے ملا۔ آپ نے پرچہ بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے اور اس کی جامعیت اور افادیت دونوں مسلم ہیں۔ میری مبارکباد قبول فرمائیے۔

امید ہے کہ آپ کی ادارت میں یہ پرچہ برابر ترقی کرتا رہے گا۔

مخلص۔ آل احمد سرور۔ جنرل سکرٹری انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ۔

رسالہ "نورس" طلبائے مدرسۂ فوقانیہ چوک کا ترجمان ہے اور ہر سال شائع ہوتا ہے اس رسالے کے خوبصورت اور دیدہ زیب سرورق کے قطع نظر اندرونی صفحات کے مضامین بھی جہاں دعوت مطالعہ دیتے ہیں وہیں اس بات کا بھی ثبوت ہیں کہ "نورس" کو محنتی اور سلیقہ مند ہاتھوں نے ترتیب دیا ہے۔ کسی تعلیمی ادارے اور وہ بھی ہائی اسکول کی جانب سے شائع ہونے والے رسالے کے لئے مضامین کا انتخاب ایک اہم اور مشکل کام ہوتا ہے لیکن "نورس" میں یہ کام بھی بڑی خوبی سے انجام دیا گیا ہے۔ جہاں مدرسہ کے طالب علموں کی تخلیقات کو زیادہ سے زیادہ جگہ دی گئی ہے وہیں مدرسہ کے باہر کے مختلف صاحبان فکر و دانش کے مضامین کو بھی موزوں مقام دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس رسالے میں پروفیسر عبدالقادر سروری کا " افسانہ یا کہانی" محترمہ زینت ساجدہ صاحبہ کا " اُردو ادب پر مغرب

کا اثر" جناب حمید الدین شاہد کا " سلطنت مغلیہ کا آخری تاجدار" محترمہ ممتاز حبیب کا " فلورنس نائٹ انگیل" جیسے مضامین بھی نظر آتے ہیں جو فوقانیہ مدرسہ کے طالب علموں کے لئے انتہائی مفید اور معلومات افزا ثابت ہوسکتے ہیں ۔

خود مدرسہ کے طلبا کی تخلیقات میں " پریم چند" کتاب کی کہانی " اور " نقش حیات" وغیرہ مضامین اگرچیکہ انتہائی مختصر اور محدود ہیں لیکن لکھنے والوں کے شاندار مستقبل کا ضرور پتہ دیتے ہیں ۔ آخر میں ہم دو باتیں ارباب "نورس" سے کہنا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ کہ "نورس" کے صفحات پر افسانوں یا کہانیوں کو قطعاً جگہ نہیں دی گئی ۔ اس کی ذمہ داری خواہ انتخاب کرنے والوں پر عائد ہو یا اپنی تخلیقات روانہ کرنے والوں پر، بہر حال اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے فوقانیہ مدرسہ کے طلبا میں افسانے اور کہانیاں لکھنے کی صلاحیتیں بڑی حد تک اجاگر ہوچکی ہوتی ہیں، دوسری بات جو ہم کہنا چاہتے ہیں وہ حصہ نظم کے بارے میں ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ مدرسہ فوقانیہ چوک کے طلبا نے کوئی معیاری نظمیں یا غزلیں نہ لکھی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ بیرونی شعرا کی نظموں کو غیر ضروری طور پر " درآمد" کیا جائے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انتخاب بہت اچھا ہے پھر بھی ایک ہائی اسکول کے رسالے میں ایسی نظمیں اگر شائع نہ ہی ہوتیں تو بہتر تھا ۔

ان دو ایک معمولی خامیوں کے قطع نظر "نورس" ایک عمدہ اور شاندار پرچہ ہے جو نہ صرف مدرسہ فوقانیہ چوک کے طلبا کی ذہانت بلکہ خود اساتذہ کی دلچسپی کا بھی مظہر ہے"۔

(روزنامہ سیاست حیدرآباد ۔ مورخہ ۲۰ رمئی ۱۹۵ء)

نورس کا "غزل نمبر"

(دکن کے غزل کہنے والے شعرا کا تذکرہ)

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

(اقبال)

دکن میں غزل گوئی کا آغاز

جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور
پرنسپل چادر گھاٹ کالج

اردو غزل گوئی کا آغاز بہمنی عہد ہی سے بیدر میں شروع ہو چکا تھا۔ چونکہ بہمنی سلطنت کا آخری دور نہایت ہی انتشار اور افراتفری میں گذرا اس لئے بہمنیوں کے عہد کی غزلوں کے وافر نمونے نہیں ملتے۔ بعض شاعر مثلاً لطفی اور مشتاق وغیرہ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں لیکن وہ اتنی زیادہ نہیں ہیں کہ ان کے کلام کے نمونوں کی بناء پر اس عہد کی غزل گوئی کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ سے پہلے غزل گوئی کے میدان میں دکن کے شاعروں نے کافی جولانیاں دکھائی ہونگی۔ تب ہی تو محمد قلی قطب شاہ اپنی غزلوں کا اتنا ضخیم دیوان مرتب کر سکا اور اس میں غزل گوئی کے پورے لوازم کو برقرار رکھ سکا۔

بحالت موجودہ محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر مانا جاتا ہے۔ اس سے پہلے گولکنڈہ میں بھی غزل گو شاعر گذرے ہونگے۔

ملا خیالی، فیروز اور محمود کے نام تو ملتے ہیں لیکن ان کی غزلوں کے نمونے نہیں ملتے محمد قلی قطب شاہ سے پہلے کے شعرائے گولکنڈہ دراصل بیدر ہی کے باشندے ہونگے اور ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں اسکی ہنر پروری شعر و سخن کا شہرہ سن کر گولکنڈہ آئے ہونگے۔ ان میں فیروز کے متعلق تو قطعی طور پر معلوم بھی ہو چکا ہے کہ وہ بیدر کا باشندہ تھا۔ قدیم دکنی بیاضیں اور کتابیں ابھی تک دستیاب ہوتی جا رہی ہیں۔ کیا تعجب ہے کہ محمد قلی سے پہلے کی غزلوں کے مجموعے بھی کسی وقت فراہم ہو جائیں۔

بعض صاحبین نے تو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب غزلیں بھی شائع کی ہیں لیکن یہ دراصل ان کے ایک پوتے کا کلام معلوم ہوتا ہے جن کا تخلص بھی شہباز تھا اور جو غالباً بیجاپور چلے گئے تھے۔ بیجاپور میں بھی ابراہیم عادل شاہ جگت گرو مصنف "نورس" کے عہد کی غزلیں دستیاب نہیں ہوئیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں غزل گوئی کی طرف بہت بعد کو توجہ کی گئی۔ یا پھر وہاں کی ابتدائی غزلوں کے نمونے ناپید ہو گئے۔

اس صورت حال کے تحت دیوان محمد قلی قطب شاہ میں جو غزلیں ہیں انھیں کو پیش نظر رکھکر دکن میں غزل گوئی کے ارتقا پر کوئی رائے قائم کیجا سکتی ہے۔ اُسکی غزلیں ایسی مرصع اور تغزل سے اتنی بھرپور ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ جس صنف سخن کو معراج کمال پر پہنچانے کے لیے شعرائے ایران نے صدیاں صرف کی تھیں وہ دکن کے اردو شاعروں کے یہاں کس قدر کم عرصہ میں انتہائی عروج تک پہنچ گئیں۔ اس کی ایک وجہ تو بظاہر یہی ہے کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے شاعروں کے سامنے ایرانی شاعروں کی غزلوں کے نمونے موجود تھے جن کو پیش نظر رکھکر ان لوگوں نے غزل گوئی کا آغاز کیا تھا۔

اس عہد میں خواجہ حافظ شیرازی سب سے زیادہ مقبول شاعر تھے اور ان کے دیوان کے متعدد نسخے دکن کے بڑے بڑے شہروں بیدر، گلبرگہ، بیجاپور اور گولکنڈہ میں متداول تھے اور اسی دور میں ان شہروں میں ان کی نقلیں بھی کی گئیں چنانچہ ایسے متعدد نسخے ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانے میں محفوظ ہیں کلام حافظ کی مقبولیت کا اثر اس عہد کے دکنی شاعروں پر پڑنا ضروری تھا۔ چنانچہ محمد قلی کے دیوان کا ایک بڑا حصہ غزلیات حافظ کے کامیاب ترجموں پر مشتمل ہے۔ اور اس کے کلام کی بڑی خصوصیت ایک یہ بھی ہے کہ اس نے خواجہ حافظ کی پیروی کرنے کی بیحد کوشش کی جس میں وہ بہت کچھ کامیاب رہا۔

محمد قلی قطب شاہ نے اپنی کلیات میں خاقانی، انوری، عنصری، نظامی، ظہیر فاریابی وغیرہ کے بھی نام لیے ہیں، اور بعض جگہ خود کو ان سے بڑا شاعر بھی سمجھتا ہے۔ یہ تو خیر شاعرانہ تعلی تھی لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ان شاعروں کا ہم پلہ بننے کی کوشش کی ہے ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ ؎

نزاکت شعر کے فن میں خدا بخشا ہے یو تج کوں
معانی شعر تیرا ہے کہ یا ہے شعر خاقانی

ایک اور مصرع ہے ؎

صدقہ نبی قطب زماں ہے اس زماں کا انوری

محمد قلی کی غزلوں میں حافظ کی رندی کے علاوہ شبابیات کا اتنا اہم عنصر موجود ہے کہ جس کی بنا پر اسے اردو کا سب سے پہلا شاعر شباب کہا جا سکتا ہے۔ اس موضوع پر اس نے ایسی ایسی بے باک اور عریاں غزلیں لکھی ہیں کہ بعد کے کسی اردو شاعر سے یہ بات بن نہ سکی۔ عہد حاضر میں جوش ملیح آبادی کو شبابیات کا امام کہا جاتا ہے لیکن ان کی نظموں میں بھی وہ بانکپن اور عیش و وصال کے حقیقی نقشے

نظر نہیں آتے جو محمد قلی کے یہاں ملتے ہیں۔

اس دور کے دوسرے غزل گو شعرا میں غواصی عبداللہ قطب شاہ اور علی عادل شاہ بیجاپور کے صاحب دیوان بھی دستیاب ہو چکے ہیں۔ ان میں غواصی نے زیادہ تر محمد قلی کے رنگ میں لکھنے کی کوشش کی ہے عبداللہ قطب شاہ تو اس کا نواسہ ہی تھا۔ اور بقول وجہی صحیح معنوں میں اس کا جانشین تھا۔ وہ غواصی اور علی عادل شاہ جیسا اعلیٰ پایہ کا شاعر نہیں تھا لیکن اس کے دیوان کا جتنا کچھ حصہ موجود ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنے نانا کی تقریباً بلفظہ پیروی کی ہے۔ علی عادل شاہ کا رنگ البتہ جداگانہ ہے۔ اس کے کلام میں سوز و گداز زیادہ نظر آتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ گولکنڈہ کے ان دونوں بادشاہ شاعروں کے مقابلہ میں چونکہ زیادہ پریشان حال اور پراگندہ دل رہا اس لئے اس کے یہاں جو سوز و گداز پیدا ہوا ہے وہ فطری ہے۔ یہ چیز محمد قلی غواصی اور عبداللہ کی غزل میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ عبداللہ کی شاعری زیادہ تر اس دور کے اکثر و بیشتر غزل گو شعرا کی شاعری کی طرح فرضی اور خیالی معاملہ بندی اور عشق و عاشقی کی ترجمانی کرتی ہے۔

یہی حال غواصی کی غزلوں کا بھی ہے۔ وہ ایک صوفی تھا اور اس نے اپنی غزلوں میں تصوف کی چاشنی دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ یہ چیز عبداللہ قطب شاہ اور علی عادل شاہ کے کلام میں پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ گولکنڈہ کے آخری فرماں روا ابوالحسن قطب شاہ اور اس دور کے بعض شعرا ذوقی وغیرہ کی بھی غزلیں ملتی ہیں۔ ان میں بھی سوز و گداز کا عنصر زیادہ ہے۔ بیجاپور کے ہاشمی نے اپنی غزل گوئی کے لئے ایک نیا میدان اختیار کر لیا۔ یہ میدان ریختی گوئی کا تھا۔ اس دور میں اس کو ریختی نہیں کہا جاتا تھا بلکہ اصل میں عورت کی طرف سے مرد کی محبت کا اظہار جن غزلوں میں کیا جاتا تھا ان کا اسلوب ہی دوسرا اختیار کیا گیا تھا اور یہ سلسلہ محمد قلی قطب شاہ نے شروع کیا تھا۔ اس کی متعدد محبوبائیں اس کی محبت کا اظہار جس طریقے سے کرتی تھیں اس کو انھیں کی زبان میں محمد قلی نے بطور غزل قلمبند کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کے کلام میں ایسی متعدد غزلیں موجود ہیں۔ ہاشمی نے اس رنگ کو اور آگے بڑھایا۔ اور ایک پورا دیوان ہی مرتب کر ڈالا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ بھی فرضی عشق و عاشقی تھی مگر زبان اور انداز بیان تخیل اور رنگینی کے باعث ہاشمی کی غزلیں بجائے خود ایک نئی چیز نظر آتی ہیں۔

یہ چند بڑے بڑے شاعر تھے اور انکی غزلوں کی خصوصیات۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کے تقریباً دو سو سالہ دور میں متعدد غزل گو شعرا پیدا ہوئے۔ ان سب پر تفصیلی نظر ڈالنے کا نہ یہ موقع ہے اور نہ یہاں اس کی ضرورت ہے۔ آئندہ صفحات میں اس دور کی غزلوں کے جو نمونے درج ہیں ان کے مطالعہ سے انکی خصوصیات واضح ہو جائیں گی۔ البتہ تین سو سال پہلے کی زبان ہونے کے باعث انکے پڑھنے اور سمجھنے میں عہد حاضر کے ارباب ذوق کو تھوڑی زحمت اٹھانی پڑے گی۔

اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر

جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ
پرنسپل چادر گھاٹ کالج

محمد قلی قطب شاہ (پیدائش جمعرات ۴ اپریل ۱۵۶۶ء وفات ہفتہ ۱۱ جنوری ۱۶۱۲ء) اردو زبان اور ادب کا محسن اعظم تھا۔ اس نے اس زبان کی ایسے وقت میں دستگیری کی جب کہ وہ اسکی بہت محتاج تھی۔ اور جس نے علم و ادب کے میدان میں ایک چھوٹے بچے کی طرح ابھی ابھی چلنا سیکھا تھا۔ محمد قلی نے اُردو شاعری پر وہ احسان کیا ہے جو بعد کے کسی بادشاہ یا شاعر یا ادیب سے نہ ہو سکا۔ اس نے نہ صرف اردو شاعروں اور فن کاروں کی قدر افزائی کی بلکہ خود بھی اس کا ایسا رسیا بن گیا کہ اس زبان میں پچاس ہزار شعر لکھے۔ اس طرح بارہ سال کی عمر کے بعد سے اگر اسکی عمر کا اوسط نکالا جائے تو ہر روز اس نے پانچ شعر ضرور لکھے ہوں گے۔

اس کے اردو کلام کی گوناگونی اور وسعت و ہمہ گیری سے پتہ چلتا ہے کہ کاروبار سلطنت کے بعد اگر اسکو کسی چیز سے دلچسپی تھی تو وہ اُردو شعر و سخن ہی تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہ تھی۔ شاعری ہی اس کے عشق و محبت کے جذبات اور عیش و عشرت کے تخیلات کی بہترین ترجمانی کر سکتی تھی۔

موجودہ معلومات کے لحاظ سے وہ اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا۔ اس سے پہلے کے کسی شاعر کی غزلوں، قصیدوں، رباعیوں۔ اور مرثیوں کا مجموعہ ابتک دستیاب نہیں ہو سکا۔ یہ مجموعہ اسکے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیگا۔ اسکی بنائی ہوئی اینٹ پتھر کی عمارتیں بہت کچھ دستبردِ زمانہ کے نذر ہو گئیں اور جو کچھ باقی ہیں شاید چند صدیوں میں وہ بھی صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائیں۔ لیکن اسکا کارنامہ ایسا ہے جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ اور ہر جگہ کے اہل علم و ادب اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ اور اُردو زبان کے ابتدائی دور کی شاعری سمجھکر ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھیں گے۔ یوں تو محمد قلی نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی اور بعد کے آنے والے شاعروں کے لئے اچھے نمونے چھوڑ گیا لیکن اسکی غزلوں میں عشق و محبت کی جو فراوانی ہے تصور و خیال کی جو رعنائی ہے اور زبان و بیان کی جو نزاکت اور شوخی ہے اس نے اردو

غزل کو اسم بامسمیٰ بنا دیا۔ بعد کے زمانے میں مرزا داغ کی غزل میں پھر یہ غزلیت ملتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے غزل کو صحیح معنوں میں حسن و عشق کی زبان بنا دیا تھا۔ مگر محمد قلی کی غزلیں پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مرزا داغ سے زیادہ اس صنف سخن میں کمال پیدا کیا تھا۔ اور طالب و محبوب کی گفتگو میں وہ بے ساختگی اور سوز و گداز پیدا کر دیا تھا جو صدیوں بعد مرزا داغ کو دوبارہ نصیب ہوا تھا۔

قدیم کلچر اور تاریخ ادب کی تحقیق کرنے والوں کی نظر میں یوں تو اسکی نظمیں معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ نظمیں بھی زیادہ تر غزلوں کی شکل میں مسلسل اور مربوط لکھی گئی ہیں۔ اور چونکہ خاص عنوان یا موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے میں نے اس کے دیوان سے ایسی غزلوں کو الگ کر کے مختلف عنوانوں کے تحت مرتب کیا اور چھپوایا ہے۔ اس وضاحت کا مقصد اس واقعہ کا اظہار تھا کہ محمد قلی نے غزل کو محض عشق و عاشقی ہی کے لئے محدود نہیں رکھا تھا بلکہ غم جانان کے ساتھ غم دوراں کے لئے بھی اس نے اسی صنف سخن میں کمال حاصل کیا۔

مولانا حالی نے غزل کے موضوعوں میں وسعت دینے کی جو تحریک اٹھائی تھی وہ دیوان محمد قلی سے ناواقفیت کی بنا پر تھی۔ اگر وہ محمد قلی کی غزلیں دیکھ پاتے تو اپنے اصلاحی خیالات کے ثبوت اور شواہد کے طور پر اس کی ان غزلوں میں سے کافی مثالیں اپنے مقدمۂ شعر و شاعری میں درج کرتے اور سچ تو یہ ہے کہ انکا نقطۂ نظر ہی دوسرا ہو جاتا۔

عہد حاضر میں ترقی پسند شاعری نے غزل کو جس طرح سیاسی اور کلچرل تخیلات کا آلۂ کار بنانے کی کوشش کی ہے یہ محمد قلی کے دیوان کے پیش نظر کوئی نئی تحریک باقی نہیں رہتی۔ محمد قلی نے اپنی غزلوں میں اپنے مذہب و سیاست کی بھی جس خوبی سے تبلیغ کی ہے اسکا مطالعہ اس موضوع کے متعدد شواہد پیش کریگا۔

غرض محمد قلی نے اردو غزل کو بڑی وسعت بخشی اور چونکہ اسکی زبان تقریباً چار سو سال پرانی ہے اس لئے اسکو پڑھنے اور سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اور عہد حاضر کے اہل اردو اس سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اس لئے افسوس ہے کہ عام اردو داں

محمد قلی کی غزلوں کی قدر و قیمت سے واقف نہیں ہو سکتے۔

مثال کے طور پر ذیل میں محمد قلی کی چند غزلیں بطور نمونہ درج ہیں جن سے کچھ اندازہ ہو سکیگا۔

پیا باج پیالا پیا جائے نا — پیا باج اک پل جیا جائے نا
میں کیسے پیا بن صبوری کروں — کہا جائے اما کہا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے — کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو پند
دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

پیا تجھ آشنا ہوں میں تو بیگانہ نہ کر مجھ کو
ملے نہ اک گھڑی تجھ یاد بن تو نا بسر مجھ کو
جہاں تو واں ہوں میں پیارے مجھے کیا کام کس سے
نہ بت خانے کی پروا ہے نہ مسجد کی خبر مجھ کو
بہشت و دوزخ و اعراف کچھ نیں ہے مرے آگے
جدھر تو واں مری جنت جدھر نیں واں سقر مجھ کو
تری الفت کا میں ہر مست ہو متوال ہوں پیارے
نہیں ہوتا بجز اس کے کسی مئے کا اثر مجھ کو
نبی صدقے قطب شہ کو نہیں آدھار کی حاجت
کہ دونوں جگ منے آدھار ہے خیر البشر مجھ کو

مئے لعلی سے رخ زردی ہماری دور کر ساقی — مجالس زہرہ رقاصی سے تو پر نور کر ساقی
لطافت و بیش ہے دن دون سو اس سرو سہی قد سے — پیالہ آس کا میرا سہ بھر سمندور کو ساقی
جو کوئی عشق میں ثابت ہے جینا ہے سدا اس کا — سو اس کے نام سے میخانہ سب معمور کر ساقی
بہشتی باغ میں میری مرادوں کے کھلے ہیں گل — مری مجلس کو مست نغمۂ طنبور کر ساقی
نظر کو مرحمت سے دیکھ مجھ مسکین کو یک پل — پیا کی کیمیائی نگہ سے فغفور کر ساقی
معانی شوق کے آنسو ڈھلیں رخ پر کر جوں موتی — کہ یک پل جیو مجھ ہنس کو نظر منظور کر ساقی

محمد قلی قطب شاہ

جناب پروفیسر ابوظفر عبدالواحد صاحب
پرنسپل اردو کالج حیدرآباد۔

محمد قلی قطب شاہ گولکنڈے کی "مملکت تلنگ" کا پانچواں تاجدار ہے جس کی بناء اُس کے دادا سلطان قلی قطب نے ۱۵۱۸ء میں ڈالی تھی۔ سلطان قلی قطب نے جو ہمدان سے ہندوستان آیا تھا، سلاطین بہمنی کے دربار میں رسوخ پیدا کیا اور اپنے تدبر اور فراست کی بدولت سلطان محمود ثانی کے عہد میں تلنگانے کا گورنر مقرر ہوا۔ اور قطب الملک کا خطاب پایا۔ سلطان محمود کے انتقال (۱۵۱۸ء) کے بعد اُس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور کوئی ۲۵ سال تک حکمران رہنے کے بعد ۱۵۴۳ء میں اپنے ایک سفاک فرزند — جمشید قلی — کی سازش سے مسجد صفا میں جو اس نے قلعہ گولکنڈہ میں تعمیر کرائی تھی۔ ادائی نماز کی حالت میں قتل کیا گیا۔ جمشید نے رعایا کے دلوں کا کانٹا بن کر کوئی سات سال حکمرانی کی اور ۱۵۵۰ء میں فوت ہوا۔ جس کے بعد اس کی بیوی "بلقیس زمان" کے جوڑ توڑ سے جمشید کا کم سن لڑکا سبحان قلی باپ کا جانشین ہوا لیکن سات ماہ بعد اسے تخت چھوڑنا پڑا اور تاج و تخت پر جمشید کا چھوٹا بھائی ابراہیم قلی (جس نے جمشید کی چیرہ دستیوں کے خوف سے جلا وطنی اختیار کی تھی اور سلطنت وجیانگر میں اوقات گذاری کر رہا تھا) قابض ہوا۔ ابراہیم قلی بڑا زیرک، ملنسار، باتدبیر اور رموز مملکت میں درک رکھنے والا فرمانروا تھا۔ وہ تلگو ادب کا بھی سرپرست تھا۔ پُرانا پُل، ابراہیم پٹن اور تالاب حسین ساگر سے آج بھی ابراہیم قلی کی منفعت رسانی اور مآل اندیشی کی یاد تازہ ہے۔

ابراہیم کے انتقال پر ۱۵۸۰ء میں اس کا اقبال مند بیٹا — محمد قلی — اُس کا جانشین ہوا۔ وہ ہر لحاظ سے بڑا ہی بھاگوان اور من چلا فرمانروا گذرا ہے اور امور سلطنت میں بھی کافی درک رکھتا تھا۔ لیکن فطرۃً رنگین مزاج اور عیش پرست واقع ہوا تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا جبکہ ملک میں چارسُو امن و امان کا دور دورہ اور دولت و اقبال کی فراوانی تھی۔ حسن کارانہ تعمیر کاری میں وہ شاہجہاں کا پیشرو اور رواداری و رعایا پروری میں وہ شہنشاہ اکبر کا ہمسر نہ بھی سہی، تو اپنے ہم عصروں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ اس کے عہد کے بہتیرے آثار آج زمانے کی دستبرد

سے ناپید ہو چکے ہیں لیکن نانِ شہر میں اس کا بنایا ہوا چار مینار اور اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا دیوان (کلیات) آج بھی اربابِ نظر کی آنکھوں کا کاجل بنا ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چار مینار کی یہ آن بان بھی ایک نہ ایک دن سیلِ حوادث کی نذر ہو جائے لیکن اس کی سدا بہار شاعری کا وہ "قطب مینار" جو اس نے اردو کے جاندار شبدوں سے تعمیر کیا ہے، سدا جگمگاتا اور دلوں کو موہتا رہے گا۔

قلی قطب نے اپنی زندگی کی بہاریں نغمہ و نشاط اور راگ و رنگ میں بسر کیں۔ زندگی اور زندگی کی رنگینیوں سے اسے عشق تھا اور یہی اس کی شاعری کا نچوڑ ہے۔ شاعری اس نے کی نہیں، شاعری اس سے ہو گئی ہے۔ وجاہت ہو کہ شاعری دونوں اس کی پُرکشش شخصیت کے بے ساختہ مظاہر ہیں۔ وہ بیک آن عاشق بھی تھا اور نشاط کار بھی لیکن شعوری طور پر اس نے کبھی ڈورے نہیں ڈالے۔ بھاگ متی پہلی ہی نظر میں اس کی رام ہوئی اور دل آرام بھی۔

اس کا ضخیم کلیات اس کی نشاط کارانہ حیات کا بھرپور مرقع ہے جس میں اس کی انوکھی شخصیت جابجا جھلکتی اور آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتی ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ بھاگ متی کے علاوہ اس کی کئی ایک "پیاریاں" بھی تھیں جن کے ساتھ وہ اپنی خوش فعلیوں اور رنگ رلیوں کے ذکر اذکار کرتا ہے لیکن یہ سب محض "گوپیاں" تھیں جو حیدر محل کا مقام حاصل نہ کر سکیں۔ اس لئے جیسا کہ مورخین کی تمنا ہے، یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اپنی خاص الخاص محبوبہ کا ذکر بھی اسی بے حجابی سے کرتا؟ اور یہ سب اہتمام اور ان حضرات کی تسلی کی خاطر کیا جاتا جو ادب اور وجاہت کے آداب سے نابلد ہیں۔

اس قسم کی "زرگرانہ" کد و کاوش کے باب میں وہ خود ایک جگہ سخن طراز ہے ؎

ہمن مدعا نا پچھے مدعی کچھ — نکو بحث کر نیں ہے اعدا کا حاجت
(نہ پوچھے) — (مت) (نہیں)

مرا دل ہے "زربفت" کا کارخانہ — نہیں مجکوں بازار "دلّال" کا حاجت
معانی مرا زرگری کوئی نہ بوجھیں — کہ اس علم میں "نیں" ہے دانا کا حاجت
(میرے رموز) — (نہیں)

قلی قطب کی شاعری پر تفصیلی ریویو اوروں نے بھی کیا ہے۔ وہی باتیں ادل بدل کر دہرانا میرے نزدیک نامناسب ہے۔ البتہ جو باتیں میں نے اپنے مطالعے سے اخذ کی ہیں، اجمالاً سپرد قلم کرتا ہوں۔

شاعری، قلی قطب کے لئے "ذریعہ عزت" نہ تھی بلکہ محض "ذریعۂ تفریح"۔ اس کا عشق بھی اعلیٰ قدروں کا حامل نہ تھا، بلکہ محض اقتضائے شباب، جو زلف و عارض کی ظاہری کشش کے سوا کچھ نہیں دیکھ پاتا اور نہ کچھ اور دیکھنا چاہتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اسکی شاعری لفظوں کی آذری ہے۔ جس طرح ایک مجسمہ ساز کی نگاہیں جسم کے ماورا کچھ نہیں دیکھ پاتیں۔ اور بغیر مادی وساطت کے حسن کا اظہار کرنے سے قاصر ہوتی ہیں۔ قلی قطب بھی حسن کے جسمانی روپ کا پرستار ہے اور مجسمہ ساز کی طرح لفظوں کی مادی وساطت سے شعری پیکر تراشتا ہے۔ اس کی آذری کے تمام پیکر (خواہ وہ نظموں کے روپ میں ہوں، یا غزلوں کے فارم میں) ایک انوکھی "خارجیت" رکھتے ہیں جسے ہم قلی قطب کی انفرادیت کی خاص الخاص "چھاپ" بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ خارجی رنگ اُس کی نظموں میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ یہی رنگ اُس کی غزلوں میں بھی رچا ہوا ہے۔ "داخلیت" اس کے ہاں نام کو نہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ گو ان کا روپ غزل کا ہے لیکن یہ بھی اسکی نظموں ہی کی طرح اسی "کارخانۂ زربفت" کی پیداوار ہیں۔

لفظوں کی یہ مجسمہ سازی بھی یقیناً شاعری ہے۔ اور اس قسم کی شاعری میں کوئی اُس کا ہمسر نہیں ؂

رتن فنطبا کے ہیں نرمول، نیں، کس شہر میں مول اِس

(نہیں)

لیکر آؤں جو بکھرا، ہو وے اُس کا شہر حیدر میں

(مانگ)

ملا غواصی

جناب محمد اکبرالدین صاحب صدیقی
لکچرار اردو سٹی کالج

ملا غواصی ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷ - ۹۸۸ھ) کے عہد سلطنت میں پیدا ہوا۔ اور گولکنڈہ میں عربی فارسی علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ وہ حیدر شاہ قادری کا مرید تھا۔ جن کا ذکر اس نے اپنی اکثر غزلوں اور قصائد میں کیا ہے۔ سلطان محمد قطب شاہ (۱۰۲۰ - ۱۰۳۵ھ) کے عہد میں اس نے اپنی مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال لکھی اور اس میں سلطان محمد قطب شاہ کی مدح کی ہے لیکن جب اس کا ۱۰۳۵ میں اچانک انتقال ہو گیا تو اس نے محمد قطب شاہ کے بجائے عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ - ۱۰۸۳ھ) کی مدح کہہ کر مثنوی دربار میں پیش کی۔ اس وقت تک گولکنڈہ میں وجہی ملک الشعرا تھا اور اس نے وجہی کے مقابل میں اپنی شمع شعر جلائی جس کی روشنی سے دیگر شعرا کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں وجہی کے ملک الشعرا ہونے تک غواصی کو دربار میں کوئی بلند مقام نہ مل سکا لیکن اس کے انتقال کے بعد اس کا افلاس ختم ہو گیا اور وہ ملک الشعرا بنا یا گیا۔ اس نے بے شمار غزلیں اور قصائد کہے چنانچہ وہ خود کہتا ہے :-

پسر نا کر آفاق ہر اک طرف تھے جما شعر کا بھوت دفتر کیا ہوں

قصیدہ نگاری میں قطب شاہی سلطنت میں اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے اس کو "فصاحت آثار" کا خطاب عطا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کا ذکر وہ ایک قصیدہ میں اس طرح کرتا ہے

ہزار شکر جو خوش ہو کے یو شہ عارف خطاب منج کوں دیا ہے "فصاحت آثاری"

اس نے اپنی پہلی مثنوی سیف الملوک ۱۰۳۵ھ میں لکھی اور اسی نے اس کو آسمان شہرت پر پہنچایا۔ جب عبداللہ قطب شاہ کی بہن خدیجہ سلطانہ کے شوہر محمد عادل شاہ والی بیجاپور نے ملک خوشنود کو اپنا سفیر بنا کر گولکنڈہ بھیجا تو اس کے جواب میں سلطان عبداللہ قطب شاہ نے غواصی کو ۱۰۴۵ھ میں بیجاپور بھجوایا جہاں اس نے اپنی شاعری کا لوہا منوایا اور زر و جواہر ہاتھی اور گھوڑوں کے تحفوں کے ساتھ گولکنڈہ واپس ہوا۔ اس نے کئی قصائد عبداللہ قطب شاہ اور پیر حیدر شاہ حسینی قادری کی مدح میں لکھے ہیں۔ غزلوں میں اس نے جگہ جگہ بادشاہ کی مدح کی ہے۔ ایک غزل سے اس کا ثبوت

ملتا ہے کہ وہ ہر سفر میں بادشاہ کے ہم رکاب رہتا۔ اس نے عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں ریختی بھی کہی ہے اور کئی اپنی غزلیں بھی اس کے دیوان میں شامل ہیں۔ سنہ ۱۰۴۹ھ میں اس نے ایک اور مثنوی "طوطی نامہ" لکھی جس میں بینتالیس ۴۵ کہانیاں ہیں۔ یہ مثنوی ضیاء الدین نخشبی کے طوطی نامہ کا ترجمہ ہے۔ اس مثنوی میں اس نے اپنے ضعیف ہونے، دل کے مرجھانے اور گوشہ نشینی اختیار کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے اور غالباً اس نے طوطی نامے کے بعد گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس لئے کہ پھر کسی کتاب کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ ایک مثنوی "چندا اور لورک" اس کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں دو مقامات پر لفظ غواصی معنًا استعمال ہوا ہے ابھی تحقیق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اسی کی ہے۔ اس مثنوی میں وہ زور بیان اور کیفیتیں جو "سیف الملوک" یا پھر کچھ طوطی نامہ میں پایا جاتا ہے۔

غواصی کی شہرت اور اس کے کلام کی بے ساختگی، روانی، جدت آفرینی اور کیف انگیزی نے ولی جیسے شاعر کو اس کا مقلد بنایا اور ولی نے غواصی کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ غالباً ولی اور اس کے ساتھیوں آزاد اور فراقی نے اس کی شہرت دہلی تک پہنچائی اس لئے کہ میر حسن نے اپنے تذکرہ "شعرائے اردو" میں غواصی کا ذکر کیا ہے۔ ولی کی وفات سے کم از کم پچاس سال قبل غواصی نے رحلت کی۔ اس کی تصانیف میں اس کا ایک ناقص کلیات کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے اور مثنویاں سیف الملوک، طوطی نامہ اور چندا اور لورک کتب خانۂ آصفیہ اور کتب خانۂ سالار جنگ میں موجود ہیں۔

غواصی فطری شاعر تھا اس نے محمد قلی قطب شاہ کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں اور بعض غزلیں تو دونوں کے دیوان میں ملتی ہیں صرف تخلص بدلا ہوا ہے۔

"سیف الملوک" اور طوطی نامے کو میر سعادت علی صاحب رضوی نے اردو رسم خط میں "سیف الملوک" کو راقم نے ہندی رسم خط میں مرتب کر کے مجلس دکنی مخطوطات و ہندی پرکاشن سمیتی کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔ اس نے بلند پایہ مراثی بھی لکھے ہیں۔ لیکن غزل گوئی کی حد تک عشق و عاشقی، معاملہ بندی اور جذبات نگاری میں اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

غزل

(۱)

توں اچھوں کو نلی ہے بالی سرو جیوں تیرا ہے بالا
گال تیرے اس پہ دستے عین جیوں آچھے گلا لا

چاند کے چوندھیر حلقا چھا لو تیرے زلف کا ہے
لوگ ابو جاک ناسمج اس کار کھے ہیں ناؤں بالا

جھلجھلاتا جو ہے چوتھے آسماں اپرال سورج
سو ترے مکھ حسن کا ہے وہ کمینا اک اجالا

تج گلے کے ہار ہو جھلنے یدل سینے پہ تیرے
آئے ہیں عاشق ہو دریا تھے نکل لولوئے لالا

لطف تیرا منج پھر وسابی نہایت دے رکھیا دیکھ
عشق تیرا منج پہ سوائے موہنی پایا ہے جالا

آج اس رنگا رنگی عشرت بھری مجلس کے میلنے
ہے ہوس منج دل منے تج ہات کا پینا کہ پیالا

صد ہزاراں شکر جو غواصی کی آنکھیاں کوں تازا
ہر گھڑی دیوے صفا بے مثل یو تیرا اجالا

(۲)

پیا سو مد عشق کا پیاس کسے نہ کہہ سوں پیا پیا کر
دیا سو دل سائیں کوں دیا منج بول سوں کس دیا دیا کر

گھڑی گھڑی کوں مری زباں تھے نکل پیا کا ج ناؤں آتا
کہ منج زباں کوں قدیم عادت ہے بولنے کا پیا پیا کر

سجن کی دولت تھے ہیں جیا کر جسے کہوں گا تو کیا عجب ہے
جنو کی دولت تھے میں جیا ہوں سو کیوں نہ کوں میں جیا جیا کر

بندا تو کچ کام نیں کیا ہوں دے تو کیا فیض ہے نہ جانو
جو خلق کہتا ہے منج مکرر توں کام اپنا کیا کیا کر

بلند آواز سوں ملایک نوا نبراں کے پکارتے ہیں
زباں کی شمشیر سوں غواصی ملک بچن کا لیا لیا کر

(۳)

ہمن عاشق دیوانیاں کوں چھبیلے کسوتاں کیا کام
ہمن دبلے فقیراں کوں دنیا صور دولتاں کیا کام

ہمن سر کوں چنڈ وٹی بس بلنش بھر اک لنگوٹی بس
سکھی کھانے کوں روٹی بس قبولیاں نعمتاں کیا کام

نہ دھرتے خوہش قربت ہم جنم پکڑے ہے غربت ہم
پھرن ہارے ہیں پربت ہم گھراں عمارتاں کیا کام

دنیا سوں کام نیں ہمنا یہاں آرام نیں ہمنا
ہمارا کام نیں ہمنا کسی سوں صحبتاں کیا کام

صبوری خوش کئے ہے سیج کہ جیتے جیو موئے ہے سیج
پیرایاں لٹ دئے ہے سیج بھی ہمنا حرمتاں کیا کام

ہمے دایم جلن ہارے پیا بن تلملن ہارے
دکھاریاں سوں طن ہارے ہمن کوں عشرتاں کیا کام

غواصی توں خبر یارے تماشا دیکھ دنیا کا رے
اندیش اپنا اندیشہ رے کسی سوں منتاں کیا کام

سلطان عبداللہ قطب شاہ

عبداللہ قطب شاہ اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ کی طرح علم و ادب کا بڑا سرپرست اور خود بھی اردو کا بڑا شاعر تھا۔ وہ ۱۰۲۳ھ م ۱۶۱۴ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوا اور چونکہ محمد قلی کی اکلوتی شہزادی اور سلطان محمد قطب شاہ کی چہیتی ملکہ حیات بخشی بیگم کا سب سے بڑا فرزند تھا اسلئے اسکی تعلیم و تربیت بڑے خاص اہتمام سے ہوئی ۱۰۳۵ھ م ۱۶۲۶ء کو اپنے باپ کی جگہ تخت نشین ہوا اس نے تقریباً پچاس سال حکومت کی اور قطب شاہی تاریخ میں سب سے بڑا دور حکومت اسی بادشاہ کا ہے مغلوں کی وجہ سے اس کو بہت سی سیاسی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا اس کے باوجود اس نے اپنے عہد میں گولکنڈے کی شہری ترقیوں اور ادبی ذوق کی پرورش میں کوتاہی نہ کی۔ اسکا عہد حکومت گولکنڈے کے اردو ادب کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں دکنی زبان میں متعدد ادبی کارنامے ملتے ہیں جن سے دکھنی مستند زبان بن گئی۔ اردو شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ عیدوں اور تہواروں کے موقعوں پر اسکی خدمت میں دکھنی زبان میں تہنیت اور مبارکبادیاں پیش کی جاتی تھیں عبداللہ عالم اور مذہبی آدمی تھا۔

غواصی، قطبی، جنیدی، ابن نشاطی اس کے عہد کے بڑے شاعر گزرے ہیں۔

اگرچہ عبداللہ قطب شاہ کی شاعری محمد قلی کی شاعری کی تقلید میں شروع ہوئی تھی لیکن اسکا کلام بتاتا ہے کہ اس کا رنگ تغزل محمد قلی سے زیادہ نکھرا ہوا ہے اس کے کلام جذبات کی گہرائی اور زبان کی سلاست نسبتاً زیادہ ہے۔ محمد قلی کی طرح جذبۂ محبت کا محرک بہت اعلیٰ نہیں ہے لیکن اس کے کلام میں عریانی نہیں جو محمد قلی کے ہاں ملتی ہے۔ وہ جذبات کے تند و تیز رو دھارے میں بہہ نہیں جاتا بلکہ ہر مقام کے بیان میں اپنی وضعداری اور آن بان کو برقرار رکھتا ہے۔ غزل گو شعرا میں جو اظہار عجز و انکسار عاشق کی نمایاں خصوصیت کے طور پر نظر آتا ہے، وہ عبداللہ قطب شاہ کے ہاں نہیں ہے بلکہ اعلیٰ درجے کے انسان کی فروتنی کے ساتھ خود داری بھی موجود ہے۔ اس کے کلام میں محمد قلی سے زیادہ ہم آہنگی ہے۔

ذیل میں نمونہ کلام درج ہے :-

بھلایا من میرا موہن پیارا — تو سنیڑ یا من کرے کیا من بچارا (بچارہ)

حسن جیوں نیوں کنی دل کوں کھینچ لیتا چ (جس طرح بھی بن پڑے، کھینچ لیتا ہی ہے) — نہیں چلتا ہے (دل گرفتار) کچ اس ٹھار چارا (چارہ)

عشق لگ (لگتے ہی) تیج سب میں فاش ہوتا — چھپیا (چھپا) کیوں روئی میں رہیگا انگارا

سجن مکھ دیکھتے دل سوز (شوق) پکڑیا (پکڑا) — پرت (محبت) آگے تیرا روپ ہے سوبارا

کھیا ہوں (کہا ہوں) نیہ (عشق) کے گن (خوبیاں) نیہ سوں میں — کہ نیہ کوں فام تا (فہم کرتا) نیہ لا نہیارا (مبتلائے عشق)

عشق کہتے سو دو (وہ) ٹونا (جادو) اہے (ہے) کچ (کچھ) — کہ جس ٹونے کوں ہرگز نیں (نہیں) اتارا (توڑ)

نبی کے صدقے عبداللہ عاشق — عشق میں سب ہیں آدھے تو ہے سارا

(۲)

کیسے پیار کرنا کہاں ہے پیارا — ہمیچ ہیں ہمارے نہیں کیچکر ہمارا
ہمیں دل لگاتے وو دل نیں لگاتے — تو اس دل لگا لے کوں کیا ہے پتیارا
عشق کا لذت وو جو معشوق منگتیا — نہیں تو عشق نیں یو محنت ہے سارا
ایکس کے بدل ایک تپنا مزا ہے — جو یوں ہوئے تو دل لائے ول لا نہارا
جو عاشق کو معشوق منگنا چ نہ ہوے — تو کیوں جیوے حیران عاشق بچارا
وو آئے تھے پر بات دل کی کہا نہیں — مبادا کرے کام پھر کر دو بارا
نبی صدقے عبداللہ بولیا یو بولاں — کہ جیوں پھول چن چن گند تا پھلارا

(۳)

کاں ہے وو قدرت جو دیکھے تج کدھن گھور آفتاب
گرچہ اپنے حسن میں ہے آج مغرور آفتاب

روپ تج اپروپ دے پیدا کیا ہے کر خدا
یا پیا جانو خبر تو چار صیا دور آفتاب

خیر تو ہے جو ادھر بیٹھ ہے ادھر موں پن تو آج
دیکھ تیرا نور ہوتا سرمہ جیوں طور آفتاب

گرم تیرے حسن کا بازار ایسا ہے جو آج
اس انگے دستا ہے منج جیوں سرد کافور آفتاب

فی الحقیقت یا گدا تیرا ہے جانو تو اس
دن کے عالم کا کہایا آج فغفور آفتاب

سچ کہو تج گل منے یا جوہراں کی ہے پدک
یا نکل پڑا آسماں پر تھے ہوا چور آفتاب

شاہ عبداللہ نبی کے صدقے تیرے عشق میں
یوں ہوا مشہور جگ میں جیوں ہے مشہور آفتاب

جناب ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب
ریڈر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ

ہاشمی بیجاپوری

وفات ۱۱۰۹ھ

ہاشمی کے دیوان کا ایک نسخہ نواب میر سعادت علی خاں رضوی ام۔اے (عثمانیہ) نے نواب سالار جنگ بہادر کے مملوکہ مخطوطہ سے بغرض اشاعت نقل کیا ہے جو (۲۹۵) غزلوں اور (۱۸ ۲) اشعار پر مشتمل ہے مرتب نے دیگر نسخوں سے ردیف (الف) میں ۳ غزلیں (ر) میں ایک غزل اور ردیف (ن) میں چار غزلیں اضافہ کی ہیں اور صرف ردیف (الف) کی ایک غزل کے متعلق اپنے ماخذ کی صراحت کی ہے۔ اضافہ کی ہوئی غزلوں کے اشعار کی تعداد (۴۸) ہے

ریختی گوئی:۔ ہاشمی کی ریختی کو تین حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) عورت کا تخاطب مرد سے (۲) مرد کا تخاطب عورت سے لیکن اس کی زبان بھی عورتوں ہی کی ہے۔ صرف فاعل اور فعل مذکر ہیں (۳) عورت کا تخاطب عورت سے۔ اس نوع کی غزلوں میں بالعموم ایک مشاطہ مرد کی طرف سے اس کی محبوبہ کو ملانے یا عورت کی طرف سے اس کے محبوب مرد کو ملانے کا کام انجام دیتی ہے۔ اکثر غزلوں میں تسلسل خیال اور تسلسل بیان پایا جاتا ہے۔ جن کی حیثیت غزل سے زیادہ ایک نظم کی ہے۔

ہاشمی نے کسی ایک طبقہ یا کسی مخصوص مزاج کی عورت ہی کے احساسات کی پیش کشی نہیں کی بلکہ شریف، غیر شریف، بازاری، مشاطہ، بیاہتا، ان بیاہی غرض ہر قماش کی عورت کی نفسیات اور کردار کو موضوع بنایا ہے۔ اور حتی الامکان ہر نوع کے کردار کے پورے خط و خال نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

صنف نازک کی داخلی اور خارجی زندگی کا کوئی رخ ایسا نہیں جس پر ہاشمی کی نظر نہیں ہے وہ مرد کی نظر سے عورت کا جائزہ لیتے ہیں۔ عورت کی نظر سے عورت کے ظاہر و باطن کو ٹٹول لیتے ہیں۔ عورت کے بطون میں داخل ہو کر اس کی زبان سے اس کے جذبہ و احساس کا اظہار کرتے ہیں۔

تشبیہات

دکن کے شعراء کے یہاں اکثر تازہ اور اچھی تشبیہیں نظر آتی ہیں اور ان تشبیہوں کا بڑا وصف یہ ہوتا ہے کہ شعرا مشبہ بہ خود اپنے ماحول اور تہذیب سے لیتے ہیں۔ ہاشمی کے پاس بھی نئی نئی تشبیہیں ہیں۔ کہیں کہیں انھوں نے کیفیات اور واقعات سے بھی تشبیہیں دی ہیں جن سے ان کی قوت تخیل کا اندازہ ہوتا ہے۔ تشبیہ کا یہ ترقی یافتہ اسلوب سوائے ولی کے بہت کم کسی دکنی شاعر نے اختیار کیا ہے۔

کالی دھڑی میں دھن تری بیٹھا ہے میرا جیو سو یوں
بیٹھا ہے کرناٹک میں جیوں سکہ جو عالمگیر کا

ہاشمی نے اپنے دیوان میں قدیم دکھنی گھرانوں کی زبان کو محفوظ کرلیا ہے۔ دیگر دکنی شعراء کے ساتھ ہاشمی کی زبان کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو دکنی عورتوں کی مخصوص لفظیات محاورات اور ضرب الامثال کی ایک طویل فہرست تیار ہوسکتی ہے۔ سوائے ان الفاظ اور محاورات کے جو اس زمانہ اور ماحول کے ساتھ مخصوص تھے اب بھی دکن کی ٹھیٹ دیہاتی عورتوں اور بالخصوص بڈھیوں کی زبان کم و بیش وہی ہے جو ہاشمی نے استعمال کی ہے۔

ہاشمی کا طرز بیان بالکل بول چال کا ہے وہ شعر اس طرح کہتے ہیں جیسے دکنی عورت باتیں کر رہی ہے۔ اس لئے ان کے اشعار کی زبان نہایت سادہ اور بے ساختہ ہے۔ لیکن ایسی سادگی نہیں جس سے زبان کا عامیانہ پن اور خیال کی سطحیت جھلکتی ہو۔ بالخصوص جو زبان وہ استعمال کرتے ہیں اس میں تو ان معائب کے پیدا ہوجانے کا بہت زیادہ امکان ہے مگر ہاشمی کا معنی خیز لب و لہجہ اور طرز بیان کے جذباتی تیور معمولی سے معمولی خیال اور سادہ سے سادہ زبان میں بھی شاعرانہ نکیلا پن پیدا کردیتے ہیں۔ اس بول چال کی زبان میں وہ جب ذرا شوخی کی پٹ دیدیتے ہیں تو ایک ڈرامائی فضا پیدا ہوجاتی ہے۔

بسا اوقات وہ کسی فرضی کردار کے نام یا کسی مقام کے ذکر سے خیال میں واقعیت اور اثر پیدا کردیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنی روزمرہ زندگی پیش کر رہا ہے۔ بیان کا یہ طرز بعد کو رنگین اور جان صاحب نے بھی اختیار کیا ہے۔

نصرتی

جناب پروفیسر سید محمد صاحب
شعبۂ اردو - جامعہ عثمانیہ

نصرتی قدیم اردو یا دکنی کے شعراء میں سب سے زیادہ مشہور اور بلند مرتبہ شاعر سمجھا جاتا ہے وہ غزل، قصیدہ، مثنوی ہر صنف سخن میں یکساں قدرت رکھتا تھا۔ اس کی دو مثنویاں "گلشن عشق" اور "علی نامہ" خاص طور پر بہت ہی مشہور ہیں اور "علی نامہ" تو اردو میں واحد رزمیہ مثنوی ہے جو فنی اعتبار سے نہایت اعلیٰ پایہ ہے۔ قصیدہ گوئی میں بھی نصرتی ایک لاجواب شاعر تھا۔ اس کے قصیدے فارسی اور اردو کے معرکۃ الآرا قصیدوں کے مقابلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

اگرچہ اردو کے کئی قدیم تذکروں میں نصرتی کا ذکر ملتا ہے مگر اس کے عہد کے اور شاعروں کی طرح اس کے حالات بھی بہت کچھ تاریکی میں ہیں۔ اس کے اپنے کلام سے بھی کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں ضمنی طور پر اشارے ملتے ہیں۔ عام طور پر وہ اپنے عہد کے دوسرے شاعروں کی طرح صرف ملا نصرتی کے نام سے معروف ہے۔ تذکرۂ شعرائے دکن میں اس کا نام محمد نصرت بتایا گیا ہے۔ روضۃ الاولیائے بیجاپور میں مذکور ہے کہ یہ تین بھائی تھے۔ شیخ منصور علم و عرفان میں، شیخ عبدالرحمن فن سپاہ گری میں اور شیخ محمد نصرت نصرتی شاعری میں صاحب کمال اور مشہور زمانہ تھے۔ نصرتی کے والد بھی سپاہی پیشہ اور بیجاپور کی فوج میں معزز خدمت پر مامور تھے انھوں نے نصرتی کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا تھا اور نصرتی علوم مروجہ میں اچھی مہارت رکھتا تھا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد نصرتی نے اپنا خاندانی پیشہ سپہ گری اختیار کیا مگر اس کی شاعرانہ صلاحیتوں نے بہت جلد اس کو علی عادل شاہ ثانی کے دربار میں اس کی شہزادگی کے زمانے میں باریاب کرایا۔ شہزادہ کی قدر افزائی نے نصرتی کے جوہر کو چار چاند لگا دئے اور اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

نصرتی کے سنہ پیدائش کا علم تو نہیں ہو سکا لیکن اس کی تصانیف سے یہ بات ثابت ہے کہ اس کا نشو و نما محمد عادل شاہ کے (یعنے ۱۶۲۶ تا ۱۶۶۰ء) میں ہوا اس کی پہلی مثنوی گلشن عشق ۱۶۵۷ء میں علی عادل شاہ ثانی کے عہد حکومت کے پہلے سال لکھی گئی۔ دوسری مثنوی ۱۶۶۵ء میں اس بادشاہ کے عہد میں در

تیسری مثنوی ۱۰۷۲ میں بعہد سکندر عادل شاہ تصنیف ہوئی۔ اس طرح نصرتی نے بیجاپور کے تین بادشاہوں کا عہد پایا ہے۔ نصرتی نے ۱۰۸۵ھ میں وفات پائی۔ ایک مسلسل غزل یہاں نقل کی جاتی ہے جو خاص لطف رکھتی ہے۔

چندر بدن کہیا تو کہی سوں سنبھال بول
سورج کہیا تو کہی یوں نہ گھال بول

دونوں بھی تجھ نہ کہو سکے تو تجھ کوں کیا کہا
کہی اہے بہشت حسن کوں جسم جگ جمال بول

بولیا نشاں ہے عشق کے رادت کا قد ترا
بولی کہ فوج فتنہ اُٹھانے کی ڈھال بول

بولیا رہنے منگے ترے مس چوک کوں بلال
بولی کہ وہ ولی ہیں ہے گہ تجھ سوں نال بول

بولیا کہ تجھ فراق نے کئے عاشقاں خراب
بولی کہ میرے وصل منے کیا تجھ پہ حال بول

بولیا کہ کعبہ دل ہے تو دل توڑنا حرام
بولی بتاں کے ہتے تو ٹوٹے تو حلال بول

بولیا کہ کئی دنوں تے تری بندگی میں ہوں
بولی کہ خیر یو پچھ کیتک ماہ و سال بول

بولیا کہ کیا ہے جلوہ جان بخش بیدلاں
بولی شکر لباں کے ادھر کا کمال بول

تجھ مدمتی کی چال کہیا میں کہ کج کو سیکھ
ہنس کر کہی کوے کوں کو ہنس کی چال بول

بولیا کہ سرو قد ترا لایا نظر میں دل
بولی کہ خوب اس کو اچھوں دیکھ بھال بول

بولیا کہ دیکھنے میں تجھے طبع تازہ ہوئی
کہی نصرتی تو ویسے نازک خیال بول

ایک اور غزل ملاحظہ ہو جس سے اسکے کلام کی روانی اور فصاحت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مغرور بے خبر ہے مد سوں مدن کی بالی
عالم کے جیو لینے لوچن میں ہے سوالی

اس خام سن میں دیکھو کیا پختگی کے فن ہیں
دینے کو وصل کا پل لینے کو جیو اتالی

برہ کے نسک میں غم سوں جلتا ہوں شمع منے
دکھلا صبح درس کا اے خاور جمالی

مجھ من کرا کبوتر ہے تجھ ہوا میں حیران
پھر پھر نکو اڑا دے پلکاں کی مار تالی

مجھ تجھ میں آ کھڑیا ہے احوال شہ گدا کا
کہتا گھٹا یو سر تے اچھتا اگر ہلالی

سنتے سبب عجب کیا ہو تلخ طبع شیریں
نا بات سو نہیں کم شکر لباں کی گالی

کڑوے بچن ہنسی میں یوں وہ چھپالے جاوے
کرتے ہیں مکھ میٹھا جیوں دارو پلا کسالی

سو فن ترسے نہ ہو ویں مجھ یک ہنر برابر
جیو کھیلنا کبل ہے اے بلہوس خیالی

رندی کے فن ریا کی باتاں ہیں کیوں چھپیں غرض
جو ہے سو عکس دل کا دستا ہے جگ میں خالی

سرمست نصرتی سوں چل سے نہ تجھ حریفی
خوبوں کی بزم کا ہے وہ رند لاابالی

علی عادل شاہ ثانی شاہی

جناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری
صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ

(یہ مضمون پروفیسر سروری نے ہمارے پاس غزل نمبر کے لئے مرحمت فرمایا ہے اصل میں پروفیسر سروری صاحب نے شاہی کے کلیات کو بڑی تحقیق اور تنقید کے ساتھ مرتب کیا ہے اُسے وہ چھپوا رہے ہیں اور عنقریب اسکی اشاعت عمل میں آئیگی یہ مضمون اُسی کلیات کے دیباچہ سے ماخوذ ہے —— مدیر)

گولکنڈہ کے حکمرانوں کی طرح، بیجاپور کے حکمرانوں میں بھی شعر و ادب کا ذوق مبدا و فیاض کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ گولکنڈہ میں محمد قلی کو اسکے طویل عرصہ حکمرانی اور اس کی حکومت میں عام طور پر امن و امان کے سبب شعر و ادب کی دلچسپیوں کو نشو و نما دینے کے خاطر خواہ مواقع ملے جس کا نتیجہ محمد قلی کا ضخیم کلیات ہے۔ محمد قلی کے بعد عبداللہ نے بھی شعر و ادب سے دلچسپی لی۔ گولکنڈہ کے آخری حکمران ابوالحسن تطب شاہ کو بھی شاعری سے دلچسپی رہی۔ لیکن محمد قلی سا شعرہ سخن کا رسیا اس خاندان میں پھر نہ پیدا ہو سکا۔

معاصر اور متصل سلطنتیں ہونے کے سبب شعر و ادب کے ذوق کی روایتیں، گولکنڈہ اور بیجاپور میں ان سلطنتوں کے باہمی صلح و آشتی اور رزم و بزم کے تعلقات کے درمیان ادل بدل ہوتی رہتی تھیں اور ایک مرکز کا اثر دوسرے مرکز پر پڑتا تھا۔ بہمنیوں نے تہذیب و شائستگی کے دو ورثے چھوڑے تھے۔ اس کا ایک جزء اردو زبان ادب اور شاعری بھی تھا۔ یہ ورثہ بیجاپور کو براہ راست ملا، لیکن گولکنڈہ نے اپنی روایتیں کسی حد تک آپ نشو و نما دیں۔ اس وجہ سے، ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی دور میں جہاں، بیجاپور میں شاہ میراں جی، شاہ برہان الدین، جانم، اور شاہ امین الدین اعلیٰ کا مذہبی اور متصوفانہ موضوعات پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا جس کی داغ بیل سید یوسف الملقب بہ شاہ راجو، اوران کے فرزند گیسو دراز نے ڈالی تھی۔ اس کے برخلاف، گولکنڈہ میں ابتدا ہی سے شعر و ادب کی وہ روایات نشو و نما پائی رہیں، جنھیں مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور تصوف سے ان کا تعلق بہ واسطہ تھا۔

بیجاپور کے حکمرانوں میں ابراہیم عادل شاہ ثانی سب سے پہلا شاعر ہوا ہے۔ ابراہیم نہ صرف محمد قلی کا معاصر تھا، بلکہ محمد قلی کا بہنوئی بھی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی حکمرانی کی طویل مدت، محمد قلی کے برخلاف فتنوں اور آشوب سے پُر رہی، تاہم اس کی طبیعت کی شائستگی نے ایسے احول میں بھی اپنے جوہر دکھائے اور اس کے مخترع ذہن نے "نورس" کے معنوی اور صوتی تصور کو نشو و نما دیا جس کا مظہر ایک گیتوں کی کتاب بھی ہے، ایک عید اور ایک شہر بھی۔ بیجاپور کے حکمرانوں کو موسیقی سے بہت دلچسپی تھی، اور یہ دلچسپی غالباً ابراہیم کے زمانے ہی سے شروع ہوئی تھی۔

علی عادل شاہ ثانی کو بھی کافی پُرآشوب زمانہ ملا تھا۔ ایک طرف مرکز گریز قوتیں اندرونِ ملک شورش برپا کر رہی تھیں تو باہر سے دہلی کی فوجوں کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور مرہٹوں کے عزائم ملک گیری بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے تھے۔

ایسے ماحول میں حکمرانی کرتے ہوئے، علی نے شعر و سخن سے جو دلچسپی لی، اور فکر کا جو سرمایہ چھوڑا، وہ یقیناً قابلِ قدر ہے۔

ہاشمی مادرزاد اندھا تھا، لیکن اس کی چشم بصیرت وا تھی۔ زبیری نے ایک عجیب واقعہ ہاشمی کے سلسلے میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سیدی مسعود خاں کو ہاشمی سے ربط اور اخلاص اس درجہ تھا کہ اعتقاد کی حد کو پہنچتا تھا۔ ایک دن سیدی اپنے محل میں بیٹھا ہوا تھا کہ ہاشمی کے آنے کی اطلاع ہوئی اس خیال سے کہ وہ اندھا ہے، پردہ کرائے بغیر اسے اندر بلوالیا۔ کہتے ہیں کہ ہاشمی نے جوں ہی محل کے اندر قدم رکھا، اس نے شعر کہنے شروع کئے، جن میں سیدی کے حرم کی شکل و شمائل اور اس وقت جو لباس اور زیور زیب تن تھا ان کی من و عن تفصیل تھی، جب اہلِ حرم نے یہ شعر سنے تو گمان ہوا کہ یہ اندھا نہیں ہو سکتا۔ دوڑ کر پردہ میں ہو گئیں یہ واقعہ محمد حسین آزاد کے شیخ قلندر بخش جرات کے بارے میں لکھے ہوئے واقعے سے کتنا ملتا جلتا ہے!

لیکن "واقعات مملکت بیجاپور" کے مصنف نے اس واقعہ کو علی عادل شاہ سے منسوب

علی کو شعر و سخن سے ذاتی طور پر بہت دلچسپی تھی اور خود اس کا ذوقِ سخن نکھرا ہوا تھا۔ ابراہیم کے بیان سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس کے دربار کے شعرا بھی اس کے لئے شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ لیکن علی کے کلیات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کی فکر میں ایک انفرادیت

تھی جس کی جھلک بھی اس کے زمانے کے شعرا کے یہاں نہیں نظر آتی۔ اس نے اُردو میں قصیدے بھی لکھے ہیں، مثنویاں بھی۔ اس کے کلیات میں غزلوں کا بھی سرمایہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس نے کچھ مخمس مثمن جھولنے، اور دوہرے بھی لکھے ہیں۔ ابراہیم ثانی کی طرح اس نے "نورس" کے انداز کے گیت بھی مرتب کئے ہیں۔ علی کو بھی موسیقی سے گہرا لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسا دکھائی دیتا ہے کہ موسیقی کا ذوق اس حکمراں خاندان میں حکومت کے ساتھ منتقل ہوتا رہا ہے علی پر موقوف نہیں بلکہ یہ ذوق عوام اور دوسرے شاعروں تک بھی پھیل گیا تھا چنانچہ اس زمانے کے اکثر شاعر، اور خاص طور پر مرثیہ خواں، مرزا وغیرہ مرثیے موسیقی کے لحن پر موزوں کرتے تھے اور انھیں قلمبند کرتے ہوئے لحن بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ مرزا کے مرثیوں میں اس بات کا خاص طور پر التزام کیا گیا ہے۔

علی کے قصیدے حمد، نعت اور منقبت میں ہیں ایک قصیدہ علی داد محل اور اسکے باغ اور حوض کی تعریف میں لکھا ہوا ہے۔ ایک قصیدہ چار در چار ہے۔ کلیات میں پہلا قصیدہ جو دستیاب ہوتا ہے وہ ناقص الاول ہے مخطوطے کے دو ورق غائب ہو گئے ہیں۔

علی نے کچھ غزلیں بھی کہی ہیں۔ غزلوں کی زبان میں بڑی صفائی اور مٹھاس ہے۔ اسکی ہر غزل ایک گیت ہے۔ اکثر غزلیں کسی خاص واقعہ سے متعلق اور مسلسل ہیں۔ بحروں اور الفاظ کا ترنم، علی کی غزل کی خصوصیت ہے مثلاً ایک غزل کے کچھ شعر ہیں:۔

جس دن تے تمن ساتھ لگیا من رہا ہمارا   اُس دن تے پرت کا ہوا جگ تن میں رکاوا
پھاندے کرے دو زلف گھنگروال کھیلے   مج نین بکھر دے بدل تل رکھے چارا
لے ہات میں پھول مال گلے لال پہنائے   جو سار چنچل نار کرے پیار آپارا
چیت جور پیا سات بھری نیہ پیالے   شاہی سینے مے پی کر لگا نین نظارا

ایک اور غزل کے کچھ شعر ہیں، پہلے شعر میں شاہی نے محبوب کے گال پر ناخن کے نشان سے جو حسن پیدا ہو گیا تھا اس کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے:۔

مج گال پر نکھ کا نشاں دستا ہے مج اس دھات کا   روشن شفق میں جگمگے، جیوں چاند پہلی رات کا

آگے محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کی ہے۔ کہتا ہے ؎

تج زلف مشکیں دیکھ کر سانپاں تجے اپنان سب تج لب کری لالی لگے لال لال سیٹے سُدکات کا
ابرو کماناں کھینچ کر ماری پلک کے تیر سوں زخمی ہوا دل کا ہرن، لاگیا نشاں تج ہات کا
مکھ دا سکھی کا عید سا دستا اچھنبا روپ سوں تس کیس پر زر کا انچل جھلکات ہے شبرات کا
تیرے بچن شیریں انگے شکر دیکھو کھاری لگے مکھ میں اچا کاڑی لیا ڈر کر چھپا ناپات کا

شاہی کی غزلوں میں کئی غزلیں ایسی ہیں جو کسی خاص موقع یا موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ مثلاً ایک غزل میں اس نے تیر اور کمان کی تعریف اس طرح کی ہے :۔

چلیا تیر ایسا کماں سے تے سلک پون کوں فنا پر لگی ہے تلک
اچھے گور مندان برابر کمان مگر کس تے لے کھینچ دینا کمان
پریاں ہے دسے شہ کے ہت تیر سب قندیل دار ہو کر کھڑا ہے فلک
چلا خوش سہادے کماں کے اوپر کماں ید منی سی چلا ہے الگ
جھمکتے ہیں پولاد کے بھال یو سُرج تجی کون تے آ دھکے ہے جھلک
عجب تیر پر کر چنگل بھال تے چلیا باز سُرخاب پر جوں ڈھلک
مظفر علی شاہ کے ہات کا اچک تیر لاگیا نشانے کے پلک

ایک اور مسلسل غزل میں اس نے محبوب کی چھب اور حسن و جمال کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :۔

جس زلف و گال کے اگیں شام و سحر گذر تس روپ کے پر کھنے کوں عنبر گذر
سندر بھلک یہ چاند کے ٹیکے کی دیکھ جوت تارے بتوار دار دے بھرنا چندر گذر
گلنار سے جو گال کوں دیکھیا شرف کے روز رٹ دے شفق کوں آنکھ چلیا سور پر گذر
کلوا جنیو ہے پیک میں رنگ لے پول کا سب امرت بھرے ادھر انگے مصری شکر گذر
ہنس چال نے چلیا ہے سکھی جب گماں کر پوچھے سکھی سکھی کون سکھی کی نظر گذر
النک کرے ہے لال رنگیلے سوں پریت کر کیسر بھنی ہے آنکھ میں تیری عذر گذر
شاہی نے سیج میں ہوے لٹ پٹ موہن عجب پار کے کمر تے کھس گیا ہے زر کمر گذر

قاضی محمود بحری

جناب محمد اکبرالدین صاحب صدیقی
لکچرار اردو سٹی کالج

گوگی تعلقہ شاہ پور ضلع گلبرگہ کا ایک قصبہ ہے جو واڑی جنکشن سنٹرل ریلوے سے قریب واقع ہے۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں یہ علاقہ بیجاپور کی عملداری میں شامل تھا اور یہاں کی قضاۃ کے فرائض بحرالدین کے تفویض تھے جو عالم فاضل تھے اور برہان الدین حسینی کے مرید۔ یہ قاضی دریا کے نام سے معروف تھے قاضی محمود بحری انھیں کے فرزند ہیں۔ انھوں نے ہوش میں آکر علمی اور صوفیانہ ماحول دیکھا اور اسی رنگ میں رنگ گئے اور شاہ محمد باقر کے مرید ہوئے عشق نے بھی ان کے دل میں گھر کر لیا۔ اور اس آگ کو وہ اپنی شاعری سے بجھاتے رہے۔ انھوں نے فن شعر کے اکتساب کیلئے کسی کی شاگردی نہ کی بلکہ اپنے ذوق کو امام بنایا اور اسی کی اقتدا کی چالیس سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ اسی دھن میں رہے اشعار کے دفتر کے دفتر لکھتے اور جمع کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک دفعہ حیدرآباد آرہے تھے کہ راہزنوں نے لوٹ لیا اور ان کی متاع عزیز رہزنوں کے لئے ردی بن گئی۔ انھوں نے اپنا زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں گذارا اور اس سے فرصت ملی تو شعر کہہ لئے۔ تزکیہ نفس کیلئے ہمیشہ کوشاں رہے اور عالم بیخودی میں رہنے کی تمنا کرنے لگے اور اپنی محنت سے یہ مرتبہ بھی حاصل کرلیا۔

انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ گوگی میں بسر کیا۔ کچھ دن کے لئے حیدرآباد آئے تھے اور دو سال یعنی ۱۰۹۷ھ اور ۱۰۹۸ھ میں بیجاپور میں رہے جہاں سکندر عادل شاہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی لیکن جب عادل شاہی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تو پھر گوگی واپس چلے آئے اورنگ زیب عالمگیر چونکہ متقی اور دیندار تھا اس لئے وہ اس کے مداح تھے۔ نوے سال کی عمر کو پہنچ کر ۱۰ شوال ۱۱۳۰ھ م ۱۷۱۸ء کو گوگی میں انتقال کیا۔ جہاں ان کا مزار مرجع خلائق ہے اور ہر سال اہتمام سے عرس منایا جاتا ہے۔

بحری بہت پرگو شاعر تھے تقریباً پچاس ہزار شعر کہے تھے جو ایک کلیات کی شکل میں تھے۔ جس کو رہزنوں نے اچک لیا۔ ان کی صوفیانہ مثنویوں میں "من لگن" (۱۱۱۲ھ) عروس عرفان (۱۱۱۲ھ) اور بنگاب نامہ نے بڑا نام پایا۔

"من لگن" ایک صوفیانہ مثنوی ہے جس میں جستجوئے حق، ابطال خودی، فضیلت انسان، عشق

اور نغمہ پر خیالات کا اظہار کیا اور تزکیہ نفس و اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔ اسی مثنوی کے بعض مضامین کو فارسی کا لباس پہنا کر اس کا نام "عروس عرفان" رکھا۔ "بنگاب نامہ" بھی صوفیانہ مثنوی ہے کرناٹک کے علاقہ میں بھنگ کو مقدس سمجھا جاتا ہے بھنگ کو شراب وحدت سمجھ کر صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

بحری کی دو غزلیں بطور نمونہ پیش کیجاتی ہیں۔

غزل

(۱)

اب دل پہ یہی ہے جو دکھن چھوڑ نہ جانا
جو تی یو دکھن کھن کے رتن چھوڑ نہ جانا

یو گن بھرے دلبر، یو نظر باز، یو مجلس
یو پھول، یو ملبل، یو چمن چھوڑ نہ جانا

جے دوست جو ہے جوت ہو دیدے کوں دکھن کے
سو یوں کہیں ہر دم جو سمن چھوڑ نہ جانا

گر کوئی بخشتا ہے بلا کر ارم انعام
بلبل کے اچھے من میں یو بن چھوڑ نہ جانا

مت کھن نہ کہ جیوں لال ہر یک ملک نہ پھکنا
جیوں سور گگن یعنی وطن چھوڑ نہ جانا

تقدیر کہاں کھینچ بجا کی سو نہ جانو
پن جیو کے گل کوت جو تن چھوڑ نہ جانا

بحری کو دکھن یوں ہے کہ جیوں نل کو دمن ہے
پس نل کوں ہے لازم جو دمن چھوڑ نہ جانا

(۲)

اب جاؤں کاں پو چھوں کسے منج پر کیل بچھیراٹ ہے
یک باٹ گئے ہوں گے سجن پن جیو بارا باٹ ہے
(سخت جدائی) (راستہ) منتشر

جان بیقراری برہ کی تاں کیا گدا کیا بادشہ
جو ہر سوں جڑیا تخت جیوں کھٹ سوں بھریا کھاٹ ہے

میں کوں میرا سر سو کیا اس عشق کی شمشیر تے
دن عید اضحیٰ کے منن سب ٹھار کاٹا کاٹ ہے

یارب رھنا کیوں ہوے گا اب اس دل او عشق سوں
مغرب میں للکارے تو جن مشرق میں ٹھاٹا ٹھاٹ ہے

بحری بہت سنبال تو اپنا پرانا پیرہن
یعنی گلی یو برہ کی بھو لوگ ڈاٹا ڈاٹ ہے

سراج اورنگ آبادی

جناب محمد اکبرالدین صاحب صدیقی
لکچرار اردو سٹی کالج

سراج سادات کے ایک مقدس گھرانے کے چشم و چراغ تھے ان کے جد اعلیٰ سید محمد کا تعلق سادات کاظمیہ موسویہ سے تھا۔ ان کا قیام مدینہ منورہ میں تھا۔ سید محمد تلاش معاش میں ہندوستان آئے اور جائس (نواح دہلی) میں قیام کیا۔ ایک سجع سے سراج کے شجرہ نسب پر روشنی پڑتی ہے۔ ؎

درویش گوہر سیت ز دریائے اولیاء

سید محمد کے لڑکے سید اولیا تھے ان کے لڑکے سید دریا اور پوتے سید گوہر تھے۔ سید گوہر سراج کے دادا یعنے سید درویش کے والد تھے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان میں کون بزرگ اورنگ آباد آئے۔ سید درویش اورنگ آباد ہی میں قیام پذیر تھے کہ سراج ۱۳ صفر روز دوشنبہ سنہ ۱۱۲۴ھ کو پیدا ہوئے اور اپنے والد کے زیر سایہ تعلیم و تربیت پائی جب بارہ سال کی عمر کو پہنچے تو ان پر جذب کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ اکثر آبادی سے دور نکل جاتے اور صحرا نوردی کرتے رہتے۔ کبھی حضرت برہان الدین غریبؒ کے مزار پر جا بیٹھتے ان کے والد انھیں پکڑ پکڑ لاتے، باندھ دیتے۔ کمرہ میں مقفل کر دیتے۔ لیکن یہ پھر موقع پا کر نکل جاتے۔ سات سال اسی حالت میں گذرے اور اس کے بعد سکون ہوا۔ انھوں نے مولانا عبدالرحمٰن چشتی کے ہاتھ پر بیعت کی اور عرصہ دراز تک ان کی خدمت میں رہے۔ جب سنہ ۱۱۶۱ھ میں شاہ عبدالرحمٰن چشتی نے رحلت کی تو سراج نے لباس ترک کیا اور فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔

سراج نے لڑکپن ہی سے شعر گوئی شروع کی اور مرید ہونے سے پہلے تک پانچ ہزار شعر کا دیوان مکمل کر دیا۔ عالم از خود رفتگی میں بھی ان کی زبان سے اشعار نکل جاتے لیکن یہ جمع نہ ہو سکے اگر یہ بھی محفوظ رہتے تو کلام کی مقدار بہت بڑھ جاتی مرید ہونے کے بعد مرشد نے شعر گوئی کی ممانعت کر دی اور شاعری کی طبیعت نے تسکین ذوق کیلئے ایک نئی راہ نکالی۔ سراج نے متعدد شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا اور ان سے اشعار منتخب کر کے ایک ضخیم بیاض تیار کی۔ اس کا تاریخی نام "منتخب دیوان ہا" رکھا۔ عبدالرسول خاں ان کے ایک برادر طریقت تھے جنھوں نے سراج کا کلام جمع کیا اور ان کے مرید

ضیاء الدین پروانہ نے اس کو سراج کے انتقال کے بعد "انوار سراج" کے نام سے مرتب کیا۔ سراج نے ۵۳ سال کی عمر میں ۱۱۷۷ھ میں انتقال کیا اولاد محمد خاں ذکا نے تاریخ وفات کہی۔

قطعہ

چراغ دودۂ آل عبا سراج الدین | کہ بود روشن از و محفل سخندانی
نمود چارم شوال صبح آدینہ | بہ شمع انجمن عمر دامن افشانی
ز تیرہ بزم جہاں فنا بدار بقا | فروغ ناصیہ خویشش کرد ارزانی
کشید شعلۂ تاریخ سرز طبع ذکا | سراج بزم ارم را نمود نورانی

سراج نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن غزل اور مثنوی ان کا خاص موضوع رہا۔ سراج کی زندگی زیادہ تر عزلت میں بسر ہوئی تاہم اورنگ آباد اس دور میں شعر و سخن کا ملجا و ماوٰی رہا۔ مشاعرے اور علمی محفلوں سے فضا گونج رہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ سراج بھی ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور عالم وجد و جذب میں بھی ان کی زبان سے شعر ٹپک پڑتے تھے۔ ولی کے بعد ان کے پایہ کا کوئی شاعر پیدا نہ ہوا۔ اور ولی سراج نے اپنا معنوی استاد تسلیم کیا۔ سراج کی شہرت ان کی زندگی ہی میں شمالی ہند تک پہنچ چکی تھی۔ سراج کی غزل میں جو درد و اثر اور سوز و گداز ملتا ہے وہ ولی کے کلام میں کم نظر آتا ہے۔ سراج کا کلام ان کے دل کی آواز ہے۔ سادگی اور بے ساختگی میں ان کا کوئی جواب نہیں۔

سراج نے اپنی شاعری میں مقامی رنگ بھی بھر دیا۔ اپنے رسم و رواج اور سادہ تلمیحات کو اپنی شاعری میں جگہ دے کر قبولیت عامہ کے حصول کے لئے چھوڑ دیا۔ ادائے خیال کی خاطر زبان کو گرانبار نہیں بلکہ سبک بنا کر روانی پیدا کر دی۔

ان کی تصنیفات میں کلیات کے علاوہ "منتخب دیوانہا" اور ایک طویل مثنوی بوستان خیال ہے جس میں شعری اور ادبی خوبیاں بے شمار ہیں۔ جذبات کی ہمہ گیری اور منظر نگاری کے مرقعے جا بجا ملتے ہیں۔ کلام اتنا سلیس ہے کہ آج بھی اس کے مطالعہ میں کوئی وقت نہیں ہوتی۔ یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ سراج قدیم اور جدید دور کو ملانے والی کڑی کا کام کر رہے ہیں۔ کلام میں بعض جگہ قواعد کی غلطیوں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن ابھی زبان گہوارہ میں تھی اور نہ اس کے اصول مدون ہوئے تھے اور نہ قواعد یہ سب بعد کی چیزیں ہیں۔ غرضکہ سراج نے جو نغمہ چھیڑا وہ اتنا ہمہ گیر تھا کہ جنوب سے شمال تک سارے

علاقے کو متاثر کر دیا۔

قد ترا رہ درداں تھا مجھے معلوم نہ تھا
گلشنِ دل میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

دھوپ میں غم کی عبث جی کوں جلایا افسوس!
اس کے سایہ میں اماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

یار نے ابرو و مژگاں سیں مجھے صید کیا
صاحب تیر و کماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

خاک تیرے قدمِ پاک کی اے نورِ نگاہ!
سرمۂ دیدہ و جاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

روزہ دارانِ جدائی کو خمِ ابروئے یار
ماہ عیدِ رمضاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

نگہ شوق نے دل ایک کرشمے میں لیا
کیا بلا سیف زباں تھا مجھے معلوم نہ تھا

شبِ ہجراں کی نہ تھی تاب مجھے مثلِ سراج
رخ ترا نور فشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

خبرِ تحیرِ عشق سُن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سیں کیا ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہو سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں
کہ شراب حسرت و آرزو خمِ دل میں تھی سو بھری رہی

ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سیں یہاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں رہی جلا نہ پری کوں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

اگر کچھ ہوش ہم رکھتے تو مستانے ہوئے ہوتے
پہنچتے جا لب ساقی کوں پیمانے ہوئے ہوتے

عبث ان شہریوں سے وقت اپنا ہم کئے ضایع
کسی مجنوں کی صحبت بیٹھ دیوانے ہوئے ہوتے

اگر ہم آشنا ہوتے تری بے گانہ خوئی سیں
برائے مصلحت ظاہر میں بیگانے ہوئے ہوتے

زمیں کا فرادایوں نے چلائے سنگ بے رحمی
اگر سب جمع کرتا میں تو بتخانے ہوئے ہوتے

محبت کے نشے ہیں خاص انساں واسطے ورنہ
فرشتے یہ شرابیں پی کے مستانے ہوئے ہوتے

مزہ جو عاشقی میں ہے سو معشوقی میں ہر گز نیں
سراج اب ہو چکے افسوس پروانے ہوئے ہوتے

مرزا داؤد اورنگ آبادی

جناب اکبرالدین صاحب صدیقی
لکچرار اردو سٹی کالج

مرزا داؤد کے آباواجداد کا تعلق بلخ سے تھا۔ ان کے والد اورنگ زیب کے عہد میں اورنگ آباد آئے اور منصب سے سرفراز ہوئے۔ اورنگ آباد اس زمانہ میں علما و فضلا اور شعرا کا ملجا و ماویٰ تھا۔ علی آزاد بلگرامی ملا عبدالقادر، شاہ غلام قادر ساجی اور دیگر علما و شعرا اپنے چشمۂ علم سے عوام کو سیراب کر رہے تھے ولی اور سراج نے اپنے زورِ طبع سے زمینِ شعر کو آسمان کر دیا تھا۔ داؤد نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی۔ کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی سے زیادہ واقف نہ تھے البتہ فارسی میں مہارت حاصل کر لی تھی اور شعر گوئی سے فطری لگاؤ تھا۔ کسی تذکرہ سے اس امر کی شہادت نہیں ملتی کہ انھوں نے ولی کی شاگردی کی ہو۔ ولی کم و بیش سنہ ۱۱۰۰ھ کے قریب اورنگ آباد چھوڑ چکے تھے اور سنہ ۱۱۵۷ھ یا سنہ ۱۱۶۸ھ میں داؤد نے وفات پائی اس لئے ان کی شاگردی مشتبہ ہے۔ البتہ ولی کے تتبع کا ذکر انھوں نے اکثر مقامات پر کیا ہے اور ولی کے بعض مصرعوں پر تضمین بھی کی ہے۔ لچھمی نارائن شفیق اور دیگر تذکرہ نگاروں نے ان کے دیوان میں پانچ سو اشعار کا ہونا ظاہر کیا ہے۔ لیکن کتب خانہ آصفیہ میں داؤد کا جو دیوان ہے وہ (۱۴۲) صفحات کا ہے اس میں ۱۹۸ غزلیں (۳۲) ابیات اور (۳۹) اشعار صنعت ایہام میں ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو میں جو دیوان ہے وہ کسی ناقص نسخے کی نقل ہے

مرزا داؤد کی تاریخ وفات کا اشتباہ اس وجہ سے ہوا کہ شفیق نے چمنستان شعرا میں لکھا ہے

"بزبانی مرزا جمال اللہ "عشق" تخلص کہ خلف الصدق او می شود معلوم شد کہ مرزا داؤد در سنہ سبع و خمسین و مایۃ والف وفات یافت راقم سطور می گوید۔ تاریخ

بلبل گلزار معنی طوطی رنگیں بیاں — از غم آباد جہاں بگذشت چوں تیر از کماں
مصرع تاریخ فوتش گفت از من اے شفیق — کہ "برفتہ مرزا داؤد از فانی جہاں"

اس طرح شفیق نے عبارت میں ۱۱۵۷ اور تاریخ میں ۱۱۶۸ ظاہر کیا ہے مرزا جمال اللہ عشق کا ذکر ہم دوسری جگہ کر رہے ہیں۔

(۱)

مست ہوں مست ہوں خراب خراب — ساقیا! ساقیا! شراب!! شراب!!
آتش عشق سوں ترے جل جل — دل ہوا، دل ہوا کباب کباب
دود مکھ سوں عرق نہ کر گل رو — دے مجھے دے گلاب گلاب
کہہ اپس چشم باحیا کوں صنم — رفع کر رفع کر حجاب حجاب
دیکھ چھپتا ہے ابر میں خورشید — دور کر دور کر نقاب نقاب
منتظر دل ہے یار کے خط کا — قاصدا، قاصدا آ شتاب شتاب

شیوۂ گل رخاں ہے اے داؤد
غمزہ و غمزہ و عتاب عتاب

(۲)

دل عشاق تاب کیا جانے — چشم مشتاق خواب کیا جانے
دام زلف صنم میں جو کہ پھنسا — عشق کا پیچ و تاب کیا جانے
جس کوں تحصیل علم عشق نہیں — تجہ درس کی کتاب کیا جانے
جو شمار نفس سوں واقف نہیں — معرفت کا حساب کیا جانے
نشۂ عشق کا جو مست نہیں — تجہ نگہ کی شراب کیا جانے
مے شراب شباب سوں بدمست — شوق میرا حجاب کیا جانے
بے گزک پی رہا ہے بادۂ ناز — میرے دل کا کباب کیا جانے
کرہ تا رہے نہ چین جبیں — سادہ گل رو عتاب کیا جانے

عرق گل رخاں بن اے داؤد
گرمئ دل گلاب کیا جانے

مرزا جمال اللہ عشقؔ

جناب محمد اکبر الدین صاحب صدیقی
لکچرار اردو جامعہ عثمانیہ

عشقؔ مرزا داؤد اورنگ آبادی کے بیٹے تھے۔ کم سنی ہی سے شعر کہتے غلام قادر "ساحر" سے اصلاح لیتے اور احسن تخلص کرتے تھے۔ جب نواب نظام علیخاں آصفجاہ ثانی نے اورنگ آباد کو چھوڑ کر حیدرآباد کو پایۂ تخت بنایا تو یہ بھی حیدرآباد آ گئے اور اپنا کلام سید عبدالولی عزلت کو بتلاتے رہے اور عشقؔ تخلص اختیار کر لیا عزلت کی علمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ صائب تبریزی نے عزلت کے متعلق لکھا ہے۔

دریں زماں کہ عقیم است جملہ صحبت ہا
کنارہ گیر و غنیمت شمار "عزلت" را

عزلت غزلوں، قصائد اور مثنوی کے علاوہ کبت، دوہے، چوپائیاں بھی کہتے تھے اور ایک بارہ ماسہ بھی لکھا ہے۔ ایسے شخص کی شاگردی نے عشق کے توسنِ طبع کو مہمیز کیا اور شعر کو بلند معیار تک پہنچا دیا۔ چنانچہ شفیق اپنے تذکرہ میں عشق پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

دیدیم کتب خانہ ہفتاد و دو ملت — غیر سخن عشق نہ شد منتخب ما

ان کا دیوان مولوی سید محمد صاحب کے کتب خانہ میں ہے اور ڈیمی کے سائز کے ۱۹۱ صفحات ہیں اور سطر ۱۲ سطری ہے۔ دیوان میں چار اور پانچ اشعار کی بھی غزلیں ہیں، اور بارہ چودہ شعر کی بھی کچھ رباعیات ہیں۔ فردیات ہیں یقیں درد اور سودا کی غزلوں پر تضمین کی گئی ہے ایک مثنوی بھی ہے جس کی ابتدا بارہ اماموںؑ کی مدح سے کی ہے۔ ان کی غزلوں میں سلاست بیان، روانی اور تغزل کی پوری شان پائی جاتی ہے اور کلام سے پختگی اور کہنہ مشقی کا اظہار ہوتا ہے۔ مرزا جمال اللہ عشقؔ نے حیدرآباد میں ۱۱۹۵ھ میں انتقال کیا ان کی دو غزلیں بطور نمونہ پیش کیجاتی ہیں:-

(۱)

جو دل کہ خاک راہ ہوا کوئے یار کا — پہنچا دماغ عرش پر اوس کے غبار کا

گل کی شگفتگی ستی یہ عقدہ وا ہوا
کھلتا ہے صبح دم دل رنگیں بہار کا

ہنستے ہیں اور رنگ و لطافت میں دیکھ تو
کئی وجہ سے نمونہ ہے گل روئے یار کا

اے آتشیں عذار تری میکشی ستی
یک لخت ہے کباب کلیجہ ہزار کا

اب تک بھی میرے دل میں کھٹکتے ہیں خار خار
سہواً اگرچہ ٹوٹا ہے دل مجھ سے خار کا

یارو نہیں ہے خلعت دل سوز بعد مرگ
مجھ پر جلے گا دل مرے شمع مزار کا

گلرو کو لکھیو تو ورق برگ لالہ پر
مطلب ہمارے عشق دل داغ دار کا

(۲)

سبھی اہل چمن میں شاد اور تو چشم تر شبنم
مگر بلبل کے نالوں نے کیا تجھ میں اثر شبنم

سحر اس غنچۂ گل کے گریباں پھاڑ لینے پر
اگر تیری جگہ ہم ہوں رویں لخت جگر شبنم

دلا مت یاد اس کے ہاتھ کا پیمانۂ رنگیں
چمن کے صحن میں ہر صبح گل کا جام بھر شبنم

نہ ہو نمناک اسے اہل نظر کب آنکھ کہتے ہیں
نہ دیویں چشم سے نسبت ہو نرگس کو گر شبنم

تبھی وہ پھول سے نرگس کے بہ جا آپ خجلت ہو
اگر دیکھے مری آنکھوں میں آنسو کے گہر شبنم

صبا بھرتی ہے آہیں گل گریباں چاک کرتے ہیں
جو دیکھے صبح سنبل سے ترے مژگاں تر شبنم

بعزم سیر ہم نے بارہا جا موسم گل میں
جو دیکھے عشق گریاں ہے چمن میں ہر سحر شبنم

لچھمی نرائن شفیق

جناب سید حمید شطاری
لکچرار اردو جامعہ عثمانیہ

(۱۱۵۸ھ تا ۱۲۱۵ھ)

رائے لچھمی نرائن المتخلص بہ شفیق و صاحب نے ۱۱۵۸ھ میں سرزمین اورنگ آباد کے ایسے گھرانے میں جنم لیا جو علم و ادب کے اعتبار سے قابل قدر خانوادہ ایسے زمانہ میں پروان چڑھے جبکہ اورنگ آباد کی فضا شعر و شاعری کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ گھرانے کے اثر نے انھیں مورخ بنایا تو ماحول نے شاعر۔

شفیق کے آبا و اجداد لاہور کے کھتری خاندان سے تھے۔ ان کے دادا لالہ بھوانی داس اورنگ زیب کی فوج کے ساتھ دکن آئے اور اورنگ آباد میں سکونت پذیر ہو گئے۔ شفیق کے والد رائے منسارام اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ انھیں تاریخ و انشا سے خاص شغف تھا۔ "مآثر نظامی"، "قانون دربار آصفی" ان کی قابل قدر تاریخی کتابیں ہیں۔ یہی ذوق انشا شفیق کو وراثت میں ملا۔ اس پر میر غلام علی آزاد بلگرامی جیسے جید عالم، بلند پایہ شاعر اور مورخ کے تلمذ نے شفیق کے ذوق تاریخ و انشا کو جلا دی چنانچہ انھوں نے متعدد تاریخی کتابیں اور شعراء کے تذکرے لکھے ہیں جن میں "تمنیق شگرف"، "حقیقت ہائے ہندوستان"، "مآثر نظامی"، "بساط الغنائم" اور "حالات حیدرآباد" تاریخی کتابیں ہیں اور "چمنستان شعراء"، "گل رعنا" اور "شام غریباں" اردو اور فارسی شعراء کے تذکرے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ شفیق کی شہرت اس کے ان تحقیقی اور علمی کارناموں کی وجہ سے اس قدر نہیں ہوئی جس قدر کہ اس کی شاعری کی وجہ سے۔

ویسے شفیق نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور وہ پرگو شاعر تھے لیکن جو زور کلام اور قادر کلامی مثنوی "تصویر جاناں" میں دکھائی ہے وہ کسی دوسری صنف میں پائی نہیں جاتی۔ شفیق کا تذکرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گیارہ برس کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے یعنی آج سے ایک سو اکاسی سال پہلے کے ماحول میں اس کے شعور شعری نے آنکھ کھولی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر کے ساتھ جو بالغ نظری پیدا ہوتی ہے اس نے شفیق کو اپنی غزلیات کے ایک دیوان کو جو تقریباً دو ہزار اشعار پر مشتمل تھا تلف کر دینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد غزلیات کے جس اثاثہ کو اس نے قابلِ اشاعت سمجھا اس کا معتد بہ حصہ اب بھی اسی کسوٹی پر کسا جا سکتا ہے جس کسوٹی کے تحت دو ہزار اشعار کا دیوان تلف کر دیا گیا تھا۔

شفیق کی زبان ان کے پیش روؤں کی طرح گنگا جمنی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ دکنی شعراء شمالی ہند کے شعراء کا تتبع باعثِ فخر خیال کرنے لگے تھے۔ اس طرح دو علاقوں کی زبانوں کے میل اور اختلاط سے نہ تو دکنی زبان ٹھیٹ دکنی زبان رہی تھی اور نہ تو شمالی ہند کا محاورہ ہی بالکلیہ اختیار کیا گیا تھا۔

شفیق اور ان کے معاصر شعراء عشق، ایمان، شاداں، تمنا، سالم، آشفتہ وغیرہم میں سے بعضوں نے یقین کا تتبع کیا اور شفیق نے تو ہر طرح اس کی متابعت کی کوشش کی ہے۔ یقین کی زمینوں اور بحروں میں پانچ پانچ شعر کی غزلیں کہی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ یقین کا بڑا مداح ہے اور اس کی تقلید کو فخر سمجھتا ہے بلکہ اس کو اردو کا سب سے بڑا شاعر خیال کرتا ہے۔

میر عبدالقادر مہربان، میر غلام علی آزاد بلگرامی کے شاگرد اور شفیق کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ مہربان نے شفیق کا تخلص صاحب رکھا اور یہی تخلص اردو غزلوں میں استعمال ہوا ہے۔ شفیق، آزاد بلگرامی کا عنایت کیا ہوا تخلص ہے اور یہ فارسی شاعری کے ساتھ مختص ہے۔ لچھمی نراین، شفیق تخلص ہی سے زیادہ مشہور ہے۔ شفیق کو آزاد بلگرامی سے کمال عقیدتمندی تھی۔ ان کی مدح میں ایک پُر زور قصیدہ لکھا ہے اور ایک غزل بھی ان کی شان میں لکھی ہے جس سے اس کی عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔

شفیق کے کلام میں اسلامی تلمیحات کثرت سے ہیں۔ یہ تعلیم، ماحول اور صحبت کا اثر تھا کہ اس نے جہاں کہیں بزرگانِ دینِ اسلام کا ذکر کیا ہے ایک سچے اور پکے مسلمان کی طرح نہایت عقیدت اور ارادت سے کیا ہے۔ چنانچہ حضرت سیدنا علیؓ کی شان میں متعدد قصیدے کہے ہیں۔ حضرت سیدنا غوث الاعظم جیلانی رضؓ کی مدح میں، حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی تعریف میں اور امام آخر الزمانؑ کی منقبت میں بھی متعدد قصائد نظم کئے ہیں۔

شفیق اردو کا اعلیٰ درجہ کا شاعر نہیں ہے تاہم اپنے دور کے اوسط درجے کے شعراء میں اس کی شاعری بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ غزلیں چھوٹی بڑی دونوں بحروں میں ہیں اور مشکل زمینوں میں بھی تشبیہ اور استعارے بھی اپنی جگہ خوب ہیں۔

شفیق کی شاعری میں اگرچہ الفاظ کی میناکاری نہیں تاہم وہ صنعت کاری اور جذبات نگاری سے معرّی نہیں۔

غزل کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

غزل

اس وفاؤں کا یہ بدلہ ہے جفا یا قسمت
ہم چلے تم کو تو اب کر کے دعا یا قسمت

ہم ترستے ہی مرے لوٹے مزہ لوں پرویز
کوہکن چیر کے سر کو یہ کہا یا قسمت

مہر اور لطف و تسلی ہے رقیبوں کے نصیب
ہم پہ یہ جور و ستم اور بلا یا قسمت

قتل پر کس کے چلا ہے یہ ستمگار کہ بس
آستینوں کو چڑھا کھینچ کے تلوار کہ بس

آخری دم ہے تک ایک دیکھ بھلا اے قاتل
بے طرح آج تڑپتا ہے یہ بیمار کہ بس

حق تعالیٰ نہ کرے کس کو کسی پر مائل
میں نے دیکھا ہوں گرفتار رہو آزار کہ بس

بہار آئی جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ
نسیم صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

ہمارے قتل کرنے کو نگہ قاتل کی کیا کم تھی
جو اس نے تیغ بھی ساتھ لایا ہے خدا حافظ

مزاج باغباں معلوم ہوتی ہے کہ بلبل نے
چمن میں شاخ گل پہ گھر بنایا ہے خدا حافظ

بہار آنے سے اب کے باغ میں اے ناصح شفیق
دوانے دل نے کچھ سن گن تو پایا ہے خدا حافظ

دل الجھتا ہے مرا جیوں کہ سلجھے ہیں وہ بال
کیا مچے گی دیکھئے کاکل کے کھل جانے میں دھوم

کس طرح بیمار دل کی ہم شفا چاہیں کہ آج
پڑ گئی ہے اس کی آنکھوں سے میخانے میں دھوم

ہم بغل ہوتے سجن کے ہو گئی آنسو کی بھیڑ
جیوں مچاتے طفل ہیں لگے عید کے آنے میں دھوم

کوئی گریباں چاک بیدل کہاں بسے گا مدعا
کوہ میں فرہاد و مجنوں کی ہے ویرانے میں دھوم

ماہ لقا بائی چندا

زینت ساجدہ
لکچرار اردو کلیہ اناث

حیدرآباد سے کچھ میل پرے مولاعلی پہاڑی کے دامن میں ایک باغ کے ماحول میں دو قبریں بنی ہیں کبھی کبھی چڑھائی کی تھکن اتارنے کے لئے لوگ یہاں آبیٹھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس شکستہ ماحول میں کونسی ہنگامہ پرور ذات محو خواب ہے؟ ریاست و امارت، دربار کی سازشیں امراء و بادشاہ کی دربارداری، شعر و سخن کی محفلیں، ناچ رنگ کے ساز و آہنگ اس ایک ذات نے کیا کیا ہنگامے نہیں دیکھے تھے؟ معلوم ہوتا ہے زندگی بھر کی اسی تھکن سے چور ہوکر یہ خاموش اور پرسکون جگہ اس نے اپنی ابدی آرامگاہ کے لئے چنی ہے۔ ان دو قبروں میں سے ایک چندا کی ہے اور دوسری اس کی ماں راج کنور بائی کی۔

شعر و ادب، رقص و موسیقی، حسن و جمال اور ذہانت و فطانت نے چندا کے روپ میں جنم لیا تھا۔ چندا کا نانا میر غلام حسین ایک شریف ترک خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور یہ مشہور قصبہ بارہہ کا رہنے والا تھا۔ جہاں کے سادات بادشاہ گر کہلاتے ہیں۔ غلام حسین ملازمت کے سلسلہ میں گھومتا گھامتا سورت پہنچا۔ سورت اس زمانے میں حسن و جمال کی آماجگاہ تھا۔ خود اس کی طبیعت حسن پرست تھی اس لئے گجرات کے ایک شریف خاندان میں شادی کرلی اور وہیں بس گیا۔ اس کی طبیعت میں اسراف بہت تھا۔ اس لئے جب قرض زیادہ ہوگیا تو کہیں روپوش ہوگیا۔ گھر بار کی بیوی کے علاوہ تین لڑکیاں اور دو لڑکے موجود تھے لیکن ظاہر ہے سرپرست نہ ہونے پران چھوٹے چھوٹے بچوں کا پرسان حال کوئی نہ رہا۔ آخر تباہی اور مفلسی سے ناچار ہوکر انھوں نے بھی وطن چھوڑا۔ اسی عالم میں دونوں بھائی جو سب سے کمسن تھے گم ہوگئے اور ماں کے ساتھ تینوں چندے آفتاب و چندے ماہتاب یہ لڑکیاں رہ گئیں حسن اور مفلسی جب یکجا ہوتے ہیں تو انجام تباہی ہوتا ہے اتفاق سے انھیں ماحول رقص و موسیقی کا ملا۔ ماں نے انکو یہی تعلیم دلائی تاکہ دربار میں رسائی حاصل ہو۔ ماں کی موت کے بعد تو انھیں بھلائی اور برائی کی بات کہنے والا بھی کوئی نہ رہا۔

یہ تینوں بہنیں مختلف رجواڑوں میں اپنے رقص و موسیقی کا کمال دکھاتی رہیں۔ اور اسی طرح ایک دن حیدرآباد آپہنچیں اُن دنوں کے حیدرآباد کا کیا پوچھنا! امراء کے ہاں نہ روپیہ کی کمی تھی نہ قدردانی کی

یہ تینوں یہاں آئیں تو یہیں کی ہو رہیں۔

چندا کی ماں راج کنور بائی اپنے زمانے کی حسین ترین عورت سمجھی جاتی تھی۔ اس کا باپ بخشی بہالت حیدرآباد کے خطاب یافتہ جاگیردار امراء میں شمار ہوتا تھا۔ اس کا دادا مرزا سلطان نظر بالت خاں بھی ریاست کے اہم عہدوں پر مامور رہ چکا تھا چندا کی خالہ مہتاب کنور بائی سے حیدرآباد ریاست کے مدار المہام نواب رکن الدولہ ارسطوجنگ نے شادی کی تھی۔ اور والدہ صاحب جی صاحبہ کا خطاب دیا تھا۔ چونکہ مہتاب کنور بائی کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اسی لئے اس نے چندا کو گود لے لیا اور اس طرح چندا کی پرورش وزیر اعلیٰ کے محل میں ہوئی اور وہیں اس نے تعلیم و تربیت حاصل کی۔

چندا کی صورت جنھوں نے اسے جیتا جاگتا دیکھا ہے وہ کہتے ہیں قیامت تھی۔ لیکن مصور نے اسے جیسا دکھایا ہے اسی کو سچ مان لیا جائے تو چندا سچ مچ چاند تھی۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں ستواں ناک کھنچی ہوئی اصفہانی تلوار دل جیسی بھویں اور چھوٹا سا دہانہ وہ شاعرانہ سراپا ہے۔ پھر جیسی اچھی صورت تھی ویسا ہی دماغ اور حوصلہ بھی قدرت سے عطا ہوا تھا۔ وہ عالم، شاعر، فیاض اور نکتہ سنج عورت گزری ہے۔ حاضر جوابی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں اس وقت کوئی اسکا جواب نہیں تھا۔ دربار داری اور فصاحت کا سلیقہ ایسا تھا کہ بڑے بڑے امراء اور صاحب ذوق اسکی ہم جلیسی کے خواہاں تھے۔ اس کے قدردانوں میں میر عالم، راؤ رنبھا اور راجہ چندو لال جیسے لوگوں کا نام آتا ہے۔ میر عالم حیدرآباد کے مشہور وزیر گزرے ہیں۔ انھوں نے چندا پر ایک فارسی مثنوی لکھی تھی اور خوب خوب سراپا کھینچا تھا۔

آصف جاہ ثانی اور ان کے بعد بھی مصاحبت کیوجہ سے چندا کا دربار میں بہت رسوخ تھا۔ اسکی عقلمندی اور ہوشیاری کے سبب مشیر کی حیثیت سے بادشاہ وقت اور امراء اکثر مہموں اور سفارتی کاموں میں اسے ساتھ رکھا کرتے تھے چنانچہ قلعہ نرل اور پانگل کی تسخیر کے وقت یہ بھی ساتھ تھی اور انھیں خدمات کے صلے میں اسے ایک بڑی جاگیر اور خطاب ماہ لقا بائی سے نوازا گیا تھا۔

مرہٹوں کے پیشوا کے دربار میں حیدرآباد سے امراء کا ایک وفد گیا تھا تاکہ نظام اور پیشوا کے تعلقات بہتر ہو سکیں۔ اس وفد کے ہمراہیوں میں چندا بھی شامل تھی۔ کہتے ہیں پیشوا کے دربار میں ایک دن چندا کے گلے کی بدھی ٹوٹ گئی اور موتی فرش پر بکھر گئے۔ پیشوا نے سمیٹ کر چندا کو لوٹانا چاہا۔ چندا نے منع کر دیا۔ کیونکہ حیدرآباد زمین پر گری ہوئی قیمتی چیز کو بھی اٹھانا معیوب سمجھتے تھے۔ پیشوا حیران بھی ہوا اور مرعوب بھی۔ رخصت کے

وقت چندا نے بیش قیمت جواہرات دوشالوں اور ساز و سامان کے علاوہ بہترین گھوڑے بھی نذر کے طور پر پیشوا کی خدمت میں گزرانے جو ایک امیر کبیر کے شایان شان تھے۔ پیشوا نے بھی تحائف دئیے۔

چندا عالموں اور فن کاروں کی بڑی قدر داں تھی۔ اس کے پاس نہایت عمدہ کتاب خانہ موجود تھا۔ اسکی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جاتا ہے کہ دکن کی مشہور تاریخ "ماہ نامہ" اسی کتب خانہ سے استفادہ کر کے لکھی گئی۔ اور اسی کے نام پر ماہ نامہ کہلائی۔

موسیقی کی تعلیم چندا نے خوش حال خاں کلاونت سے حاصل کی۔ عمر بھر اسکی خدمت کی اور آخر عمر تک نہایت آرام سے رکھا۔ مولا کی پہاڑی پر خوش حال خاں کی کمان جو اب تک موجود ہے وہ اسی کے نام پر بنوائی گئی تھی۔ خوش حال خاں کا سلسلہ تان سین سے ملتا تھا۔ اس نے آخر وقت تک اپنے اُستاد کو اپنے پاس آرام سے رکھا اور ہر طرح اُسکی خدمت کی۔ موسیقی اور رقص میں تو وہ یکتائے زمانہ تھی ہی لیکن شعر گوئی سے بھی اُسے لگاؤ تھا۔ اپنے زمانہ کے مشہور اُستاد آیان سے وہ اصلاح لیا کرتی تھی۔ یوں تو اس کا مشرب وسیع تھا لیکن اُسے خاص عقیدت حضرت علیؑ کی ذات سے تھی۔ اسی لئے اس کے دیوان میں ہر غزل کے پانچ شعر ہیں۔ اور ہر مقطع میں وہ حضرت علیؓ سے اپنی نسبت کا اظہار کرتی ہے اور اپنے آپ کو مولا کی باندی، داسی، کنیز کہتی ہے۔ نذر کے طور پر اُس نے مولا کی پہاڑی پر بارہ دری، مسافر خانہ اور حوض تعمیر کئے تھے۔ اپنی زندگی میں اس نے اپنا مقبرہ وہیں پہاڑی کے دامن میں بنالیا۔ وصیت کے مطابق وہیں دفن ہوئی۔

چندا کی وفات کے بعد لاولد ہونے کے باعث اُسکا مال و اسباب اور املاک حکومت کے تصرف میں آ گئے۔ البتہ اس کی پرورده لڑکیوں اور خانہ زادیوں کو معقول وظائف اور مناصب مقرر کر دیئے۔ ہر سال اس کے عرس کے موقع پر سرکاری انتظام سے کافی رقم خرچ کی جاتی ہے۔ اسکی ذاتی حویلی ایلچی بیگ کی کمان کے پاس واقع تھی۔ وہیں اس نے ایک عاشور خانہ بھی تعمیر کروایا تھا جسکو خاص طور پر آراستہ کیا گیا تھا۔ جب موجودہ نظام کے دادا نواب افضل الدولہ آصف جاہ پنجم نے اسکی پروردہ لڑکیوں حسین افزا اور حسین لقا کو محل میں داخل کر لیا۔ تو یہ عالیشان حویلی بھی ایرانی حویلی میں محصور کر لی گئی۔ البتہ عاشور خانہ ہر سال عوام کے لئے کھلا رہتا ہے اور ہر سال تعزیہ داری ہوتی ہے۔

درباروں میں رسائی، امیروں کی قدر دانی کے باوجود چندا الگ تھلگ رہنا زیادہ پسند کرتی تھی۔ جو وقت اسکے پاس بچ رہتا وہ زیادہ عالموں اور شاعروں کے ساتھ گزارتی اس کا دسترخوان

مشہور تھا۔ اور ہر کھانے پر عالم اور اہلِ کمال اور باہر کے مہمان شریک رہتے۔ لوگ دور دور سے اُنکا نام سُن کر آتے تھے۔ اور وہ اُن کی خاطر خواہ مدد بھی کیا کرتی۔ کئی طالب علموں اور عالموں کو اُسکی سرکار سے وظائف مقرر تھے۔ اپنی جاگیر کا انتظام وہ خود کیا کرتی تھی اور معتمدین اور اہلکاروں کو حساب کتاب سمجھاتی رہتی۔ اسی لئے یہ بھی دیکھ بھال ہوتی رہتی کہ مستحقوں کو امداد برابر ملتی رہتی ہے یا نہیں۔

ہر سال وہ ایک میلہ منعقد کرتی تھی۔ جسے "کھٹ درسن" کا میلہ کہا جاتا۔ پورا ہفتہ یہ میلہ منایا جاتا۔ راگ رنگ اور کمالات کا مظاہرہ ہوتا چار دن اس میں گزرتے۔ یہ چار دن ضیافتوں اور مدارات کا سلسلہ چلتا۔ پہلے دن تمام مشائخین اور علما کی دعوت ہوتی۔ دوسرے دن ہر مسلک کے فقرا کی تیسرے دن مساکین اور غربا، کو کھانا کھلایا جاتا اور چوتھے دن جوگی اور بیراگیوں کو ہندو دھرم کے مطابق بھوج دیا جاتا۔ اب بھی ہر سال رجب کے مہینے میں ایک میلہ لگتا ہے۔ جسے مولا علی کا میلہ یا لنگم پلی کا میلہ کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اسی "کھٹ درسن" میلے کی یادگار ہے۔

یوں تو وہ شروع ہی سے مذہب پرست تھی لیکن آخر دنوں میں زیادہ سے زیادہ وہ اسی طرف کھنچتی گئی۔ ظاہر ہے اس دنیاداری کے سارے جھمیلوں کے بعد بھی وہ اکیلی تھی اور بے سہارا۔

حالِ دل کس سے یہ چندا کہے ہر مشکل میں؟
یا علیؑ تیرے سوا کوئی مددگار بھی ہے؟

نمونۂ کلام

؎ چشم پُر آب و آہِ شرربار سے ہے کام — خواہش نہ ابر کی ہے مجھے نے ہوائے برق
؎ سب میکدہ میں مست ہیں پر ایک تجھ سوا — دیکھا نہ ایسے دور میں ہشیار اب تلک
؎ ملتے ہیں توقع یہ تری غیر سے کم ہم — رکھتے ہیں ترے دور میں یہ چشمِ کرم ہم
؎ جوں شمع تری ایک نگہِ گرم سے ظالم! — رہتے ہیں یہاں عمر سے با دیدۂ نم ہم
؎ ہر چند دل دکھانا کسی کا بُرا ہے پر — رنجیدہ خاطروں کو تو رنجور مت کرو
؎ ہماری چشم نے ایسا کمال پایا ہے — جدھر کو دیکھئے آتا ہے تو نظر ہم کو
؎ ناشادگیِ دل ہیں نہ ملنے سے تمہارے — ایسا کبھی ہوگا جو اُنھیں شاد کروگے
؎ ادا شرطِ عبادت ہو سکے ہے کب ادا اُسکی؟ — خودی کو اپنی جب بھولے خدا کی یاد کو پہنچے

شمس الدین فیض

مس رشید موسوی صاحبہ

میر امیر الدین خاں کے فرزند میر شمس الدین فیض ۱۱۹۵ھ میں ایلچپور (برار) میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے ہمراہ ۲، ۳ برس کی عمر میں حیدرآباد آ گئے۔ اور آخر عمر تک یہیں رہ پڑے ابتدائی تعلیم کے علاوہ علوم متداولہ کی تکمیل عالم شباب میں کی۔ عربی و فارسی میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ شعر و شاعری کی طرف نوجوانی کے زمانے میں راغب ہوئے۔ خواجہ میر درد کے شاگرد مشتاق دہلوی سے اصلاح سخن لیا کرتے تھے بڑے پرگو شاعر تھے۔ اڑسٹھ سال کے لگ بھگ انھوں نے اردو شعر و شاعری کی خدمت کی۔ اس طویل عرصہ میں میر کی طرح فیض نے معمولی اور اعلیٰ دونوں قسم کے شعر موزوں کئے بائیس برس کی عمر میں فیض نے اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا۔ ان کے کلام سے ان کی زندگی کے حالات بہت کچھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ ایک شعر سے ان کے دہلوی الاصل ہونیکا پتہ چلتا ہے۔ ؎

اے فیض میں ہوں دہلوی الاصل کبھی یاد
بھولے ہوئے ہیں پوربیئے تو امودیر

جس زمانے میں فیض نے شاعری شروع کی دہلی اور لکھنؤ میں شاہ نصیر، غالب، مومن ذوق، آتش، ناسخ جیسے استاد سخن موجود تھے۔ اور خود حیدرآباد کے درباروں میں شمالی ہند کے حفیظ دہلوی، تاج الدین مشتاق، شاہ نصیر وغیرہ نے اپنا رنگ جما رکھا تھا۔ ان اہل زبان شاعروں کے درمیان فیض کا اپنے لئے جگہ پیدا کر لینا آسان نہ تھا۔ اپنی غیر معمولی قابلیت اور قادر الکلامی کے ذریعہ انھوں نے ان شاعروں میں بھی اپنا مقام بنا لیا۔ مشکل زمینوں اور مشکل قافیوں اور ردیفوں کے استعمال سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ نصیر سے بہت زیادہ متاثر تھے لیکن یہ رنگ فیض کو اتنا مقبول عام نہ بنا سکا جتنا کہ وہ میر کے طرز کو اپنا کر مقبول ہو سکے۔

فیض کی شاہ نصیر کے رنگ کو اپنانے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ شمالی ہند کے شعرا کے مقابلے میں جو اسوقت حیدرآباد میں موجود تھے، یہاں کے مقامی شاعروں کو اہل زبان تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ فیض نے محض یہ ثابت کرنے کے لئے کہ حیدرآبادی شاعر بھی شمالی ہند والوں

کی طرح زبان ومحاورہ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں، خیال کے مقابلہ میں شعر کی ظاہر بناوٹ، محاورہ، روزمرہ اور زبان کی خوبیوں کی طرف زیادہ توجہ کی۔ اور انھیں اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی لیکن کلام مقبول عام ہو سکا۔

کہا جاتا ہے کہ عالم شباب میں فیض اپنے علم وفضل اور معلومات کی بنا پر پیری مریدی اور تصوف کے قائل نہ تھے پڑھا لکھا شعر وسخن سے دلچسپی رکھنے والا نوجوان دل و دماغ عموماً ان چیزوں سے دور ہی رہتا ہے۔ لیکن تذکروں سے ہمیں اس سلسلہ میں کسی قسم کا اشارہ نہیں ملتا کہ نوجوانی میں فیض نے کوچۂ عشق مجازی کی بھی سیر کی تھی۔ تذکرہ نویسوں نے ان کی شخصیت کے صرف ایک ہی پہلو پر روشنی ڈالی ہے انھیں صرف ایک صوفی منش اور پہنچے ہوئے بزرگ کے روپ میں پیش کیا ہے۔ تذکروں میں صرف اتنا مبہم اشارہ ضرور ملتا ہے کہ نوجوانی میں تصوف وغیرہ کے قائل نہ تھے اور بعد میں پیر شاہ ابراہیم سے ملاقات پر خیالات میں زبردست تبدیلی پیدا ہوگئی اور تصوف کو اپنا لیا تھا۔

فیض کے یہاں مجازی اور حقیقی دونوں قسم کا عشق ملتا ہے۔ شاگردوں اور معتقدوں نے جو حالات زندگی قلمبند کئے ہیں۔ ان کو سامنے رکھکر یہی کہا جا سکتا ہے کہ فیض ابتدا ہی سے فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن کلام کو دیکھکر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ خانقاہ کے صوفی بننے سے پہلے ہماری اس عام دنیا سے پورا پورا تعلق رکھتے تھے۔ عام احساسات وجذبات کے مالک تھے ان کا کلام درد کی طرح صرف صوفیانہ نہیں بلکہ ان کے پاس عام حالات، تجربات تلخ وشیریں گلا شکوہ سب کچھ موجود ہے لیکن اس کے ساتھ تصوف وعرفان بھی اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

غزل گو شعرا کی طرح فیض کی شاعری کے بھی دو اہم موضوع ہیں محبت اور زندگی۔ عام شاعروں کی طرح فیض نے بھی اپنے اشعار میں محبوب کا سراپا کھینچا ہے۔ اسکی خوشامدیں کی ہیں۔ کہیں ہونٹوں کے معدوم ہونیکا ذکر ہے تو کہیں کمر کی گمشدگی پر افسوس کہیں نگاہوں کے گھائل ہیں تو کہیں زلفوں کے سائے تلے زندگی بسر کردینکا فیصلہ کرتے ہیں۔

محبت کی ابتدائی حالت میں عاشق کو اپنی ذات کا بھی بے حد خیال رہتا ہے۔

اکثر صورتوں میں یہ خیال اگلے مدارج میں ختم ہو جاتا ہے۔ اور عاشق بذاتِ خود کچھ نہیں رہتا۔ غالب کی طرح فیض بھی اپنے محبوب سے محبت نہ سہی عداوت ہی سہی کے طلب گار نظر آتے ہیں۔ فیض کی غزلوں کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

غزل

(۱)

کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چندن ہم
صنم ہم، دیر ہم، بتخانہ ہم، بت ہم، برہمن ہم
محبت ہے تو اپنے سے عداوت ہے تو اپنے سے
ہیں آپ ہی دوست اپنے ہم ہیں آپ ہی اپنے دشمن ہم
ہدایت ہم سے ہے پیدا، ضلالت ہم پہ ہے شیدا
کبھی ہیں رہنما اپنے کبھی ہیں اپنے رہزن ہم
ہوا اے فیض معلوم ایک مدت میں ہمیں تھے وہ
جپا کرتے تھے جس کے نام کی دن رات سمرن ہم

(۲)

کعبہ میں کیا ہے اور شوالے میں کیا نہیں
پر چشم حق شناس تجھے واعظا نہیں
ہیں مبتلا دوئی میں یہ سب زاہدانِ شہر
ان احولوں کو ایک کبھی سوجھتا نہیں
کیا کفر ہے مقیم جو ہم دیر میں ہوئے
وہ کونسا مقام ہے جس میں خدا نہیں
بتلاؤ گا خدا کا پتہ کیا کسی کو میں
معلوم آج تک مجھے میرا پتا نہیں

(۳)

جلوہ گر جب وہ نونہال ہوا
ہر شجر باغ میں نہال ہوا
اس گلستاں میں وہ ہوا سرسبز
مثل سبزہ جو پائمال ہوا
جمع بیمار چشم ہیں صدہا
کوچہ یار اسپتال ہوا
دیر سے بھی گئے نکالے ہم
قہر بت، قہر ذوالجلال ہوا
معنی وحدت الوجود یہ ہے
ایک ہی اپنا حال و قال ہوا
تھا جو درباں قدیم فیض ان کا
برطرف ہو کے پھر بحال ہوا

امیر مینائی

جناب محمد اکبر الدین صاحب صدیقی
لکچرار اردو سٹی کالج

امیر کے مورث اعلیٰ شیخ عثمان عرب سے ہندوستان آئے اور دہلی میں قیام کیا۔ دلی سے نکل کر وہ جونپور اور رسولپور ہوتے ہوئے لکھنؤ آکر مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔ انھیں کے پڑپوتے حضرت قطب الاقطاب مخدوم شیخ محمد شاہ مینا ہیں جن کا مزار لکھنؤ میں آصف الدولہ فردوس منزل کے امام باڑے کے سامنے مرجع خلائق و زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

امیر مینائی کا سلسلہ سترہ واسطوں سے حضرت شیخ عثمان تک پہنچتا ہے جو حضرت ابابکر صدیقؓ کی اولاد میں تھے امیر کے والد شیخ کرم محمد مینائی نے مسند علم و فضل اور زہد و تقویٰ آراستہ کی تھی۔ امیران کے چھوٹے فرزند تھے جو ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے منجھلے بھائی عنایت حسین سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ابھی دسواں سال تھا کہ یتیم ہو گئے اور اپنے بڑے بھائی مفتی طالب حسن کی سرپرستی میں علمی منازل طے کئے جامع العلوم ہوکر آپ نے طب کی تعلیم حاصل کی اور علم جفر میں دو کتابیں رمز الغیب اور رموز غیبیہ تصنیف کیں بیس سال کی عمر میں آپ جید علما کی صف میں شامل ہو گئے۔

حضرت امیر شاہ رامپوری کے ہاتھ پر بیعت کی اور سلوک کے مدارج طے کئے اور خلافت حاصل کی والد کی زندگی ہی میں نو برس کی عمر سے شعر گوئی شروع کی اور کچھ عرصہ بعد تدبیر الدولہ مدبر الملک سید مظفر علیخاں اسیر کے شاگرد ہو گئے۔ شاگرد کو ہونہار پا کر اسیر نے بھی فن شعر کی تعلیم میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا اور بہت جلد امیر نے اعلیٰ مدارج طے کر لئے اور واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے دربار میں رسائی حاصل کی اور شاہی عنایات سے نوازے گئے ۱۲۷۳ھ میں اودھ کی سلطنت ختم ہوئی اور اس کے بعد حالات غدر نے امیر کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا اور کاکوری میں جا ٹھیرے جہاں محمد محسن کاکوروی سے ملاقاتیں رہیں۔ شہیدی کے قصیدے ع "عجب ڈھب یاد تھا روح الامیں کو بھی خوشامد کا" پر محسن کاکوروی نے بھی قصیدہ کہا تھا۔ اس کو امیر نے مخمس کیا اور پھر اسی زمین میں (۱۲۸) شعر کا قصیدہ اور ایک دو غزلہ لکھ کر خاص و عام سے داد حاصل کی اور نعت گوئی میں اپنا سکہ جما لیا۔

نواب یوسف علیخاں والئ رامپور نے اپنے استاد زادے کو طلب کیا اور امیر ستیس سال

کی عمر میں رامپور پہنچے اور مفتی کی خدمت پر فائز ہوئے۔ مفتی رامپور میں عدالت کا اعلیٰ حاکم ہوتا تھا۔ امیر نے اس فرض کو نہایت دیانت داری اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ کچھ عرصہ بعد امیر نے اپنے استاد اسیر کو بھی رام پور میں بلا لیا اور شعر و شاعری کے گلستاں میں بہار آگئی۔ نواب یوسف علیخاں نے ۱۲۸۲ھ ۱۸۶۵ء میں رحلت کی اور کلب علیخاں مسند نشیں ہوئے اور اہل علم و فضل کو دہلی اور لکھنؤ سے بلا کر دارالسرور رامپور میں جمع کر لیا اور مصاحب منزل میں شعر و سخن کی محفلیں آراستہ ہونے لگیں ان میں اسیر، امیر، جلال، بحر، عروج، قلق، تسلیم، ذکی، شرف، بینظیر، حیا اور داغ قابل ذکر ہیں۔ نواب صاحب نے امیر کی شاگردی اختیار کی اور امیر کو عہدہ مفتی سے سبکدوش کر کے استادالسلطان مقرر کر لیا۔ اور مفتی کا عہدہ امیر کے بھائی مفتی طالب حسن کے سپرد ہوا۔ کلب علیخاں کی رحلت کے بعد مشتاق علیخاں اور حامد علیخاں کے دور حکمرانی میں بھی امیر کے اعزازات میں کوئی فرق نہ ہوا۔ گو کلب علیخاں کی رحلت نے مصاحب منزل کی صحبتیں ختم کر دیں شعراء منتشر ہو گئے داغ حیدرآباد آگئے اور ان کی وجہ سے امیر کا کلام بھی حیدرآباد پہنچا۔ اور آصف جاہ سادس نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن وہ امیراللغات کی تیاری میں مصروف تھے اس لئے نہ آسکے۔

۱۳۱۷ھ میں جب آصفجاہ سادس کلکتہ سے ہوتے ہوئے بنارس پہنچے تو امیر مینائی نے یہاں حاضر دربار ہو کر قصیدہ گذرانا اور ساتھ چلنے کی دعوت پائی لیکن تیار ہو کر نہ آئے تھے اس لئے معذرت کی بعد میں اپنے فرزندوں کو روزگار سے لگانے کے خیال سے حیدرآباد کا سفر کیا۔ حافظ جلیل حسن جلیل بھی ہمرکاب تھے امیر گلبرگہ شریف میں زیارت سے مشرف ہو کر حیدرآباد آئے اور داغ کے مہمان رہے، حیدرآباد پہنچنے کے بعد دوسرے دن سے اسہال و پیچش کا سلسلہ شروع ہوا اور دربار محبوبی میں رسائی سے محروم رہے۔ شاہی طبیبوں نے معالجہ پر پوری توجہ کی لیکن طبیعت نہ سنبھلی اور پانچ ہفتہ مسلسل علیل رہ کر ۱۳۱۸ھ میں اس جہان فانی کو خیرباد کہا اور درگاہ یوسفینؒ کے مشرقی قبرستان میں دفن ہوئے۔

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر
چشم محفل میں ہے اب تک کیف صہبائے امیر

امیر مینائی ہر صنف کلام پر قدرت رکھتے تھے ایک دیوان نعتیہ ہے اور دو عاشقانہ۔ قصائد مواسوخت کا مجموعہ، مسدس، مخمس، قطعات تاریخیں غرض ہر صنف سخن میں دفتر کے دفتر

ہیں۔ اور پُرگوئی کا یہ عالم کہ طویل طویل قصیدے ہیں۔ دو غزلہ اور سہ غزلہ بھی ہیں

"امیر کے تغزل میں ناسخ و اسیر کی بلند خیالی، آتش کی گرم بیانی، درد کا سوز و گداز، میر و مصحفی کے نشتر، سودا کا فخر سبھی کچھ نظر آتا ہے۔"

غرض امیر یگانۂ روزگار شاعر اور ادیب تھے زندگی کا بڑا حصہ رامپور میں گذرا اور دکن کی خاک میں آسودہ ہوئے۔

نمونۂ کلام درجِ ذیل ہے:-

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا — کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا
گردن تنِ بسمل سے جدا ہو گئی کب کی — گردن سے جدا خنجرِ قاتل نہیں ہوتا
دنیا میں پری زاد دیئے خلد میں حوریں — بندوں سے وہ اپنے کبھی غافل نہیں ہوتا
بسمل تو ہوئے سینکڑوں ہی تڑپ کر — ٹھنڈا مرے قاتل کا مگر دل نہیں ہوتا
دھبا نہیں دیتا ہے لہو حسرتِ دل کا — اس خون سے تر دامنِ قاتل نہیں ہوتا
دل مجھ سے لیا ہے تو ذرا بولیے ہنسیے — چٹکی میں مسلنے کیلئے دل نہیں ہوتا
کہتے ہیں ہم آئینہ میں حسن اپنا نہ دیکھیں — اچھی کہی، معشوق کے کیا دل نہیں ہوتا
جس بزم میں وہ رخ سے اٹھا دیتے ہیں پردہ — پروانہ وہاں شمع پہ مائل نہیں ہوتا

یہ شعر وہ فن ہے کہ امیر اس کو جو برتو
حاصل یہی ہوتا ہے کہ حاصل نہیں ہوتا

عمر برق و شرار ہے دنیا — کتنی بے اعتبار ہے دنیا
داغ سے کوئی دل نہیں خالی — کیا کوئی لالہ زار ہے دنیا
نشۂ عیش یاں نصیب کسے — کہ سراپا خمار ہے دنیا
اہل رغبت سے کرتی ہے نفرت — بڑی پرہیزگار ہے دنیا
آنے جانے پہ سانس کے ہے مدار — سخت ناپائدار ہے دنیا
ایک جھونکے میں ہے ادھر سے ادھر — چار دن کی بہار ہے دنیا
بدتر اس کو سمجھ خزاں سے امیر — دیکھنے کو بہار ہے دنیا

جناب تمکین کاظمی صاحب

فصیح الملک داغ دہلوی

اٹھارہویں صدی کے اوائل میں بخارا کا ایک خاندان ترک وطن کر کے سمرقند پہنچا، یہ خاندان قاسم جان، عارف جان، اور عالم جان تین بھائیوں پر مشتمل تھا۔ سمرقند میں ایک بھائی کو مدار المہامی ملی اور دو بھائی ساتھ رہنے لگے مگر جلد ہی ان لوگوں کو سمرقند چھوڑنا پڑا کیونکہ والیٔ سمرقند نے انتقال کیا اور یہ تینوں بھائی پھر آوارہ وطن ہو کر اٹک پہنچے چنانچہ اٹک کے صوبہ دار مرزا محمد بیگ نے انہیں مہمان رکھا اور اپنی بیٹی کی شادی عارف جان سے کر دی۔

عارف جان کو چار بیٹے نبی بخش خاں، احمد بخش خاں، الٰہی بخش خاں اور محمد علی خاں ہوئے اور مرزا محمد بیگ خاں صوبہ دار اٹک کے انتقال کے بعد انہیں اٹک چھوڑنا پڑا اور یہ لوگ دہلی پہنچ کر مستقل طور پر مقیم ہو گئے چنانچہ محلہ بلی ماراں کے پاس ان لوگوں نے گھر بنا لئے اور ان کی گلی قاسم خاں کی گلی کے نام سے مشہور ہوئی اسوقت یہ لوگ خاصے متمول تھے کیونکہ علاوہ مال و اسباب کے تیرہ ہزار اشرفیاں نقد ان کے پاس تھیں۔

احمد بخش خاں نے ابتداً ریاست گوالیار میں نوکری کر لی مگر پھر نوکری چھوڑ کر گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے اور اسی سلسلہ میں راجہ راؤ بختاور سنگھ سے تعلقات پیدا ہو گئے تو ان کے وکیل ریاست بھی بن گئے، اتفاق سے اسی زمانے میں انگریزوں نے ریاست بھرت پور پر چڑھائی کی اور ڈیک پر حملہ کر دیا تو بختاور سنگھ نے بھی اپنے سواروں کا ایک دستہ انگریزوں کی مدد کیلئے بھجوایا جس کے ساتھ احمد بخش خاں بھی گئے، اس مقابلہ میں انگریزی سپہ سالار گولی سے زخمی ہو گیا اور گھوڑے سے گرنے لگا تو احمد بخش خاں نے اپنے گھوڑے سے اُچک کر اس کے گھوڑے پر سوار ہو کر اسے سنبھالا اور میدان جنگ سے نکال لائے چنانچہ اس نے مرتے مرتے ایک تحریر لکھدی کہ اسطرح احمد بخش خاں نے مری حفاظت کی ہے ان کو اسکا صلہ دیا جائے۔ احمد بخش خاں نے چونکہ سپہ سالار کو میدان سے ہٹا لیا تھا اور فوج یہ سمجھ کر کہ وہ زندہ اور سلامت ہے اطمینان سے لڑ رہی تھی اس لئے فتح ہوئی اور اس کا سہرا احمد بخش خاں کے سر رہا۔ جب فتح کا دربار ہوا تو لارڈ لیک نے احمد بخش خاں کو

فیروز پور جھرکا، پونا ہانا، بچھوڑ اور سانگرس کے علاقے بطور جاگیر عطا کئے اور فخر الدولۂ دلاور الملک رستم جنگ خطاب کے ساتھ سند دی۔ اس سے متاثر ہوکر راجہ بختاور سنگھ نے بھی اسی دربار میں اپنی طرف سے پرگنۂ لوہارو عنایت کیا اور احمد بخش خاں نواب اور جاگیردار ہی نہیں والی ریاست بن گئے

احمد بخش خاں کو دو لڑکے شمس الدین خاں اور ابراہیم خاں اور دو لڑکیاں نواب بیگم اور جہانگیرا بیگم تھیں۔ والیٔ ریاست بننے کے بعد احمد بخش خاں نے نیاز محمد بیگ خاں مغل برلاس کی بیٹی سے شادی کی جن کے بطن سے امین الدین خاں اور ضیاءالدین احمد خاں اور دو بیٹیاں ماہ رخ بیگم اور بادشاہ بیگم تولد ہوئیں۔

احمد بخش خاں نے شمس الدین خاں کو فیروز پور جھرکا دیا اور لوہارو وغیرہ امین الدین خاں و ضیاءالدین احمد خاں کو دے کر ۱۸۲۲ء میں اس کی منظوری بھی انگریزی حکومت سے لے لی اور اس تقسیم نامے پر جنرل اختر لونی اور سرجان مٹکاف کے دستخط بھی لے لئے۔

۱۸۲۶ء میں احمد بخش خاں خانہ نشیں ہوگئے اور ۱۸۲۷ء میں انہوں نے انتقال کیا اس وقت شمس الدین کی عمر اٹھارہ انیس سال کی تھی نئی نئی ریاست ملی تھی دوست احباب نے جرکا دیا اور انھوں نے اپنے علاتی بھائیوں کو محروم کرنا چاہا چنانچہ بڑی کوشش سے لوہارو پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے چند ہی سال کے بعد ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء کو چہار شنبہ کے روز دن کے دو بجے شمس الدین خاں کے گھر ایک لڑکا تولد ہوا جسکا نام نواب مرزا رکھا گیا۔

۱۸۳۱ء میں سر ولیم فریزر دہلی کا رزیڈنٹ ہوکر آیا جو احمد بخش خاں کا دوست تھا۔ اس نے امین الدین خاں اور ضیاءالدین خاں کی حمایت کی اور دونوں کو کلکتہ بھجوایا اور ۱۸۳۳ء میں پرگنۂ لوہاروان دونوں کو واپس مل گیا۔

یہ فیصلہ چونکہ شمس الدین خاں کے خلاف ہوا تھا اور شمس الدین خاں کی یہ ناکامی سر ولیم فریزر کی کوشش کا نتیجہ تھی اس لئے انھوں نے اپنے دو آدمیوں کریم خاں اور انیا کو فریزر کے قتل کے لئے اکسایا اور ان دونوں نے ۲۲/ مارچ ۱۸۳۵ء کو فریزر کا کام تمام کر دیا۔

مقدمہ چلا۔ ابتدا کریم خاں ۲۸/ اگست ۱۸۳۵ء کو پھانسی پا گیا اور پھر ۸/ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو شمس الدین خاں کو پھانسی دی گئی۔ اسوقت شمس الدین خاں کے فرزند نواب مرزا کی عمر چار سال چار مہینے

کی ہوئی تھی اور عین تسمیہ خوانی یعنی بسم اللہ کے زمانے میں قدرت نے باپ کا سایہ سر سے اٹھا لیا والدہ بے سہارا ہو گئیں اور اس یتیم کو خالہ نے اپنے آغوش میں لے لیا اور دہلی ہی میں پرورش ہونے لگی چونکہ نواب مرزا کی خالہ عمدہ خانم نواب یوسف علی خاں (جو بعد کو نواب رام پور ہوئے) سے متعلق تھیں اس لئے ۱۸۴۰ء میں نواب محمد سعید خاں کی تخت نشینی کے بعد یوسف علی خاں کے ساتھ رام پور چلی گئیں اس لئے نواب مرزا بھی رام پور پہنچ گئے اور وہیں انکی تعلیم و تربیت ہوتی رہی۔

نواب مرزا کی والدہ چھ سال تک در در کی ٹھوکریں کھاتی رہیں مگر پھر قسمت چمک اٹھی اور ۱۸۴۴ء میں مرزا فخرو ولیعہد سلطنت دہلی نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور انھوں نے لال قلعہ پہنچ کر نواب مرزا کو بھی رامپور سے بلا لیا اور قلعہ معلی میں باقاعدہ تعلیم و تربیت ہونے لگی سلطنت مغلیہ کا آخری دور تھا شمشیر و سنان زینت دیوار بن گئے تھے طاؤس و رباب کا دور دورہ تھا، رقص و موسیقی شاعری اور لہو و لعب عروج پر تھے اس فضا نے نواب مرزا کو بھی متاثر کیا اور انھوں نے ماحول سے متاثر ہو کر شاعری شروع کر دی قلعہ میں شاعری کا خوب چرچا تھا استاد ذوق بادشاہ اور شاہزادوں کے استاد تھے نواب مرزا بھی ذوق کے شاگرد ہو گئے اور مرزا فخرو نے داغ تخلص دیا اس کے بعد داغ شاعری ہی کے ہو رہے اور اس دنیا میں کھو گئے چنانچہ قلعہ کے مشاعروں اور باہر کے مشاعروں میں باقاعدہ شریک ہونے لگے، آزردہ، صہبائی، مومن و غالب، شیفتہ و ذوق اس ابھرنے والے نوجوان کی تعریف و توصیف بڑی فراخ دلی سے کرنے لگے نتیجہ یہ نکلا کہ داغ کی شاعری نکھرتی گئی اور ۱۸۵۴ء تک داغ نہایت ہی عیش و فراغت سے داد شعر و شاعری دیتے رہے اس سنہ میں استاد ذوق اللہ کو پیارے ہو گئے اور شاہ ظفر اور دوسرے شاہزادے غالب کے شاگرد ہو گئے مگر داغ نے غالب کی باقاعدہ شاگردی تو نہیں کی البتہ ان کی صحبت سے فائدہ بہت اٹھایا روزانہ گھنٹوں غالب کے پاس بیٹھ کر نکات شاعری سے واقفیت حاصل کی ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو ولیعہد دہلی اللہ کو پیارے ہو گئے اور داغ کو قلعۂ معلی سے نکلنا پڑا۔

داغ کی شادی شاہزادگان مغلیہ ہی کے خاندان میں ہوئی تھی اور خالہ بھی دہلی ہی میں تھیں قلعہ سے نکل کر داغ نے اپنی خالہ کے گھر یا اپنی سسرال میں قیام کیا ہوگا کہ نو مہینے کے بعد

ہی ۱۸۵۷ء کا غدر ہوگیا اور داغ کا گھر بھی لٹا اور داغ اپنی بیوی اور والدہ وغیرہ کو ساتھ لے کر رام پور پہنچ گئے جہاں نواب یوسف علی خاں نے ابتداً مہمان بنا کر رکھا اور پھر ۱۴/اپریل ۱۸۶۶ء سے اصطبل اور دوسرے کارخانہ جات داغ کے تفویض کردیئے اور داغ نے اطمینان سے بیٹھ کر شاعری شروع کر دی، غدر تک کا کہا ہوا کلام تلف ہو چکا تھا، حافظہ پر بار ڈالا کہ جسقدر شعر یاد آتے گئے لکھ لئے اور بعد کے کہے ہوئے شعر بھی شریک کر کے پہلا دیوان "گلزار داغ" مرتب کر کے چھپوا دیا، ۱۸۶۶ء میں نواب صاحب کے ساتھ کلکتہ کا سفر کیا ۱۸۷۲ء میں بھی نواب صاحب ہی کے ساتھ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔

غدر کے بعد رام پور میں اسیر، امیر، جلال، نیر، بحر، حیا، تسلیم جیسے اساتذۂ وقت جمع ہو گئے تھے ان سبھوں سے داغ نے مقابلے کئے اور ہمیشہ میدان انھیں کے ہاتھ رہا واقعہ یہ ہے کہ انھیں معرکوں نے داغ کو استاد بنا دیا اور ان کی طبیعت منجھ گئی۔

۱۸۷۹ء میں رام پور ہی میں داغ کی والدہ نے انتقال کیا اور اسی سال بے نظیر کے میلے میں داغ کی ملاقات کلکتہ کی مشہور طوائف منی بائی حجاب سے ہوئی جسے انھوں نے دوبارہ مجبور کر کے ۱۸۸۰ء میں پھر رام پور بلایا اور ۱۸۸۲ء میں خود بھی عظیم آباد ہوتے ہوئے کلکتہ گئے اور ۱۶/ جولائی ۱۸۸۲ء کو کلکتہ سے رام پور واپس ہو کر مشہور مثنوی فریاد داغ کہی اور ۱۸۸۳ء میں اسے طبع بھی کرا دیا اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنا دوسرا دیوان آفتاب داغ بھی جو قیام رامپور ہی کے زمانے کے کلام پر مشتمل ہے چھپوایا،

نوابان رام پور نے داغ سے عزیزانہ سلوک کیا اور داغ رامپور میں نہایت ہی مطمئین اور مسرور رہے مگر ۲۳/مارچ ۱۸۸۷ء کو نواب کلب علیخاں نے انتقال کیا اور داغ گوناگوں پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے چنانچہ ۲۸/ڈسمبر ۱۸۸۷ء کو انھیں مجبوراً رام پور چھوڑنا پڑا اور وہ لاہور، اجمیر، کشن کوٹ، آگرہ، علیگڈھ، متھرا، جے پور اور مانگرول ہوتے ہوئے دہلی پہنچ گئے مگر سوا سال گزر بسر کا تھا رام پور میں داغ کو تنخواہ کے نام سے ساٹھ ستر روپئے ملتے تھے مگر نوابان وقت کی داد و دہش الگ تھی جس پر داغ کی خوش گزرانی تھی ورنہ اس معمولی تنخواہ میں داغ اور ان کے دس پندرہ متعلقین کی بسر بردشکل تھی، بہر حال داغ نے کچھ اندوختہ بھی نہیں رکھا تھا اس لئے دہلی میں رہ کر کھانے کا

سوال اہم تھا مجبوراً وطن کا رخ کیا اور راستہ ہی میں قصیدہ کہہ کر ۷/اپریل ۱۸۸۸ء کو حیدرآباد پہنچ گئے، سدی عنبر کے بازار میں آجکل ململ بار اور کیفے جہاں ہے اس کے بازو کے بنگلے پر جس میں سیف الحق ادیب رہتے تھے قیام کیا۔ راجہ گردھاری پرشاد باقی اور حاجی محمد ابراہیم خاں خاناں نے حضور میر محبوب علیخاں بہادر شاہ دکن سے داغ کی تقریب کی اور راجہ باقی نے داغ کا قصیدہ پیش کیا اور داغ نے حیدرآباد کے امراء اور عہدہ داروں سے خاصے مراسم پیدا کر لئے جن دنوں داغ حیدرآباد آئے ہیں مشاعروں کا زور و شور تھا ہر مہینے ایک دو مشاعرے ہوتے تھے داغ نے بھی مشاعروں میں شرکت کی اور حیدرآبادیوں نے ان کی خاصی آؤبھگت کی، چنانچہ سوا سال تک حیدرآباد میں رہ کر داغ نے ۱۲/جولائی ۱۸۸۹ء کو دہلی کا رخ کیا اور نو مہینے دہلی میں رہ کر ۲۹/مارچ سنہ ۱۸۹۰ء کو پھر حیدرآباد کا قصد کیا اور حیدرآباد آکر افضل گنج میں محبوب گنج کی کمان کے بازو مولوی ظہور علی وکیل کے مکان کے برابر دارالامکان کرایہ پر لے کر مستقلاً قیام کیا اور ۲/فروری ۱۸۹۱ء کو حضور نے اپنی پہلی غزل بغرض اصلاح سرفراز فرمائی اور دوسرے ہی روز داغ نے حاضر دربار ہو کر نذر پیش کی۔

جنوری سنہ ۱۹۰۳ء میں اڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کا دربار دہلی میں ہوا تو حضور نظام نے بھی شرکت کی اور داغ بھی ہم رکاب دہلی گئے۔ ۱۸۹۰ء میں داغ نے دہلی چھوڑی تھی اس کے بعد سے دہلی جانے کا اتفاق ہی نہ ہوا تھا حیدرآباد کی ملازمت کے بعد یہ پہلا سفر دہلی کا تھا اس سفر میں داغ نے اپنے شاگردوں معتقدوں اور دوستوں عزیزوں سے ملاقاتیں کیں جو آخری تھیں کیونکہ اس سفر سے واپس آنے کے بعد ہی سے داغ کی صحت خراب ہونے لگی خون کا دباؤ گیا بواسیر بھی شدت اختیار کر گئی گٹھیا میں بھی اضافہ ہو گیا اور معدہ بھی خراب ہو گیا اس سے پہلے ان پر فالج کا ایک حملہ ہو چکا تھا جسے انھوں نے سنبھال لیا اس کے بعد دوسرا حملہ بھی ہوا اور وہ بھی خیر خوبی سے ٹل گیا مگر صحت ہوتے ہی تیسرا حملہ بھی ہوا جو بڑا شدید تھا اور بلبل ہندوستان ۱۶/فروری ۱۹۰۵ء کو خاموش ہو گیا، بحساب قمری (۷۶) سال اور بحساب شمسی (۷۴) سال عمر تھی حضور نظام نے اپنی جیب خاص سے مصارف تجہیز و تکفین عنایت فرمائے اور نماز جنازہ مکہ مسجد میں بعد عید کی نماز کے بعد پڑھی گئی اور درگاہ یوسفین میں اپنی بیوی کے برابر داغ آسودہ ہو گئے۔

داغ کے کلام کا انتخاب بے معنی سی بات ہے۔ ان کا ہر شعر منتخب ہے پھر بھی انکی تین غزلیں بطور نمونہ درج ذیل ہیں:۔

غزل

(۱)

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں
الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

ڈرتا ہوں دیکھ کر دل بے آرزو کو میں
سنسان گھر یہ کیوں نہ ہو مہمان تو گیا

افشائے راز عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا جان تو گیا

گو نامہ بر سے خوش نہ ہوا پر ہزار شکر
مجھ کو وہ میرے نام سے پہچان تو گیا

بزم عدو میں صورت پروانہ دل مرا
گو رشک سے جلا ترے قربان تو گیا

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

(۲)

بتان ماہ وش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
کہ جس کی جان جاتی ہے اسی کے دل میں رہتے ہیں

محبت میں مزہ ہے چھیڑ کا لیکن مزے کی ہو
ہزاروں لطف ہر اک شکوۂ باطل میں رہتے ہیں

ہزاروں حسرتیں وہ ہیں کہ روکے سے نہیں رکتیں
بہت ارمان ایسے ہیں کہ دل کے دل میں رہتے ہیں

خدا رکھے محبت نے کیے آباد دونوں گھر
میں ان کے دل میں رہتا ہوں وہ میرے دل میں رہتے ہیں

بتوں کو محرم اسرار تو نے کیوں کیا یا رب
کہ یہ کافر ہر اک طرح سرائے دل میں رہتے ہیں

تن آسانی کہاں تقدیر میں ہم دل گرفتوں کے
خدا پر خوب روشن ہے کہ جس مشکل میں رہتے ہیں

کوئی نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد بتا دینا
تخلص داغ ہے وہ عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

(۳)

حضرت دل آپ ہیں جس دھیان میں
مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

عشق! جس کشتی کا ہو تو ناخدا
وہ نہ آئے کس طرح طوفان میں

گر فرشتہ وش ہوا کوئی تو کیا
آدمیت چاہیے انسان میں

دل کی قیمت اک نگہ ہے اے صنم
آ گئے جو آئے ترے ایمان میں

جس نے دل کھویا اسی کو کچھ ملا
فائدہ دیکھا اسی نقصان میں

کس نے ملنے کا کیا وعدہ کہ داغ
آج ہو تم اور ہی سامان میں

ڈاکٹر احمد حسین مائل

جناب خواجہ حمید الدین صاحب شاہد
لکچرار اردو چادر گھاٹ کالج

ڈاکٹر احمد حسین مائل سنہ ۱۲۷۴ھ میں پیدا ہوئے اپنی عمر کا زیادہ حصہ حیدرآباد کے اضلاع میں بحیثیت سیول سرجن بسر کیا۔ شعر و شاعری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ دکن کے ان تمام شاعروں میں سے ہیں جن کا کلام ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا۔ وہ ایک قادر الکلام اور پُرگو شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں شوخی، رندی و مستی اور معرفت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے تقریباً ۱۵ ہزار اشعار کہے ہیں۔ ان کے کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان کا دیوان "تحفۂ دکن" سنہ ۱۸۹۷ء میں مطبع مفید عام آگرہ میں چھپا تھا۔ وظیفہ کے بعد حیدرآباد میں اپنے مرشد حضرت آغا داؤد صاحب قبلہ کی درگاہ کے قریب محلہ آغا پورہ میں رہتے تھے۔
۲۲ رمضان سنہ ۱۳۳۲ھ کو وفات پائی اور اپنے مرشد کی درگاہ کی سیڑھیوں کے سامنے مغربی گوشے میں دفن ہوئے۔ غزلوں کا نمونہ حسب ذیل ہے:

ہوش میں آنا ہی برا ہو گیا ‏ ‏ سر ترے زانو سے جدا ہو گیا
مجھ سے جو وہ مل کے جدا ہو گیا ‏ ‏ شوق فزوں ذوق سوا ہو گیا
یوں بھی لڑکپن ترا کچھ کم نہ تھا ‏ ‏ عہد جوانی تو بلا ہو گیا
خود کو جو کھویا تو مٹی بندگی ‏ ‏ خود کو جو پایا تو خدا ہو گیا

کہتے ہیں مائل سے شب وصل وہ
کیوں نہیں سوتے تمھیں کیا ہو گیا

یہ بیکار وہ بے اثر ہو گئی ‏ ‏ پلک کو نظر کو نظر ہو گئی
کہا سن کے افسانۂ برق طور ‏ ‏ وہ تجلی ہماری نظر ہو گئی
کہیں کیا خدا بھی ہمارا نہیں ‏ ‏ کریں کیا خدائی ادھر ہو گئی
نہ ٹھکراؤ تم لاش کو بعد قتل ‏ ‏ دوبارہ یہ زندہ اگر ہو گئی
پھرا جستجو میں تری عمر بھر ‏ ‏ مری عمر یوں ہی بسر ہو گئی
تن خدا ‏ ‏ مرحبا بے خودی راہبر ہو گئی

صدیق احمد سید محمد منیظر شاہ وارثی

جناب محمد اکبرالدین صاحب صدیقی
لکچرار اُردو سٹی کالج

کرٹہ مانک پور الہ آباد کا ایک مشہور اور مردم خیز خطہ ہے بڑے بڑے علمائے عظام اور صوفیائے کرام یہاں کی خاک سے اُٹھے اور ملک کی ظلمت و جہالت کے خلاف جہاد کیا۔

حضرت عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے ایک خلیفہ سید احسان علیشاہ حضرت شہاب الدین گردیزی کے خاندان کے چشم و چراغ تھے اور اپنے علم و فضل اور رُشد و ہدایت کی وجہ سے شمالی ہند میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ سید صدیق احمد (سید محمد منیظر شاہ وارثی) آپ کے فرزند تھے۔ آپ ۱۸۶۳ء میں کرٹہ مانکپور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کے زیر سایہ تعلیم حاصل کی اور ابتدائے شباب میں حضرت وارث علیشاہ متوطن قصبہ دیوہ شریف ضلع بارہ بنکی سے بیعت کی احرام شریف اور خطاب منیظر شاہ سے نوازے گئے۔ زندگی بھر ان کا یہی لباس رہا کہ ایک چادر باندھتے اور ایک چادر اوڑھے رہتے کم سنی ہی میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا اور وحید الہ آبادی سے کلام پر اصلاح لی۔ عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ تقاضائے زمانہ کی بنا پر انگریزی پڑھی اور اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ اس میں شعر کہنے لگے فن طب میں بھی بڑی مہارت حاصل کی اکثر پیچیدہ امراض کا علاج کرتے لیکن کبھی کوئی باقاعدہ مطب نہیں چلایا۔ ہمیشہ گردش پرکار پاؤں میں رہتی۔ اپنے مرشد کے عرس میں باقاعدہ حاضر ہوتے محفل شعر و سخن گرم کرتے کچھ عرصے کے لئے دربار رام پور سے بھی وابستہ رہے جہاں سے وظیفہ ملا اور بطور مہمان مقیم رہے۔ مصاحب منزل کی صحبتوں میں بھی شرکت کی لیکن جب برداشتہ خاطر ہوگئے تو حیدرآباد آگئے رسالہ عبداللہ میں قیام کیا مگر یہ قیام بھی مستقل نہ رہا بلکہ کبھی بمبئی میں کبھی گیا (بہار) میں کبھی دیوہ شریف کبھی مانک پور الہ آباد رام پور اور کبھی علی گڈھ میں مقیم رہے۔ باؤن تریں سال کی عمر میں ششش کے مرض میں مبتلا ہوئے اور ایک ششش نکال دیا گیا جس سے پوری کاٹھی میں ایک سمت میں کجی پیدا ہوگئی تھی اس کے بعد بھی وہ تقریباً بیس سال تک زندہ رہے اور آخری ایام حیدرآباد ہی میں بسر کیے۔

قیام حیدرآباد کے زمانہ میں فن طب پر ایک کتاب گنجینۂ عثمانیہ لکھ کر آصفجاہ سابع کے ملاحظے میں گذرانی لیکن اس پر انھیں نہ تو اشاعت کیلئے کوئی امداد ملی نہ وظیفہ میں اضافہ ہوا اور نہ کتاب

بھی واپس ملی۔

حضرت بینظیر کے ایک لڑکی اور تین لڑکے تھے۔ لڑکی گیا (بہار) میں بیاہی گئی تھیں جن سے تین بچے ہوئے اور وہ بیوہ بھی ہوئیں اور مولانا کی زندگی ہی میں انتقال بھی کیا۔ ایک لڑکا حیدرآباد ہی میں انتقال کر گیا۔ اب دو لڑکے موجود ہیں۔ بڑے سید اقبال حسن پاکستان میں مقیم ہیں اور چھوٹے سید حامد بینظیر شاہ ایم ایس سی علیگ ہیں جو سائنس کالج سیف آباد میں لکچرار ہیں۔

نواب مسعود جنگ بہادر سے بینظیر کے گہرے تعلقات تھے اور اسی بناء پر نواب صاحب موصوف نے اپنی نظامت تعلیمات کے دور میں ان ہر دو لڑکوں کو مسلم یونیورسٹی میں شریک کرواکر تا ختم تعلیم وظیفہ جاری کر دیا تھا۔ جب نواب صاحب نے اپنی کتاب "انتخاب زریں" شائع کی تو اس میں بینظیر شاہ کا بھی ذکر کیا اور ان کی غزلیں اپنے انتخاب میں شامل کیں۔ ایک دیوان بھی اشاعت کے لئے حاصل کیا لیکن ریل میں کہیں گم کر دیا جو کبھی مل نہ سکا۔ اس طرح ایک دیوان کی غزلیں ضائع ہوگئیں جس کا بینظیر سے زیادہ نواب صاحب موصوف کو افسوس رہا۔ نواب صاحب موصوف کے متعلق بینظیر کے جو خیالات تھے وہ ان کے دو خطوط سے ظاہر ہوں گے جو "نقوش" کے مکاتیب نمبر میں شائع ہوئے ہیں۔

بینظیر کے تقدس، علم و فضل اور شعر و شاعری کے مداحوں کی فہرست کافی طویل ہے لیکن نواب لطف الدولہ بہادر امیر پائیگاہ کو قلبی تعلق تھا۔ بینظیر شاہ اکثر ان کے دربار میں جاتے، اپنے اشعار سناتے علمی مباحثے میں حصہ لیتے۔ نواب صاحب موصوف ان کے بے حد معتقد تھے۔

بینظیر جب آخر وقت بیمار ہوئے تو عثمانیہ دواخانہ عثمانیہ میں شریک کیا گیا۔ حالت دن بدن بگڑتی گئی۔ نواب لطف الدولہ بہادر دورہ پر اورنگ آباد میں تھے اور ابھی پروگرام میں تین دن باقی تھے کہ انھوں نے پروگرام منسوخ کر دیا اور بروز جمعہ ۳۰ ربیع الثانی ۱۳۸۱ھ م ۲۱ ستمبر کو حیدرآباد آگئے اور بینظیر کی کیفیت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ علم کا آفتاب آج صبح غروب ہو گیا۔ آپ فوراً دواخانہ پہنچے اور اپنے صرفہ سے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور تدفین کے لئے اپنے ہی خاندانی قبرستان میں جگہ دی۔

بینظیر بہت پرگو اور زود گو شاعر تھے عربی، فارسی، انگریزی اور اردو چار زبانوں میں شعر کہتے تھے اردو اور فارسی میں بہت کچھ کہا اور بہت سارا کلام اب ناپید ہے اس لئے کہ انھیں کبھی محفوظ کرنے کا خیال نہ رہا۔ حافظہ اس بلا کا تھا کہ کبھی کسی مشاعرہ میں کوئی نظم یا غزل کاغذ دیکھ کر نہیں پڑھی۔ کلام ہمیشہ

پرزوں پر لکھا جاتا۔ اور یہ پرزے لپیٹ کر پان کے بٹوے میں رکھ دئے جاتے جب بٹوا بھر دیا جاتا تو کسی دوسرے بٹوے میں منتقل کرکے صندوق میں ڈال دیئے جاتے۔ بینظیر نے ہر صنف میں شعر کہے غزل، رباعی، قصیدہ، مخمس، مسدس اور مثنوی سب ہی مجموعہ کلام کی زینت ہیں۔ مثنوی میں الکلام کتاب مبین جواہر بینظیر، الصحف الاخری تین تین دفعہ شائع ہوکر بھی ناپید ہو چکی ہیں۔ بینظیر نے قصاید بھی اتنی ہی سلاست اور روانی کے ساتھ کہے جیسے مثنوی لکھ رہے ہوں خصوصًا فارسی قصائد بڑے معرکہ کے ہیں اور قاآنی، خاقانی، مرزا جلال اسیر اور عرفی کی زمینوں میں لکھے گئے ہیں۔ بینظیر نے قاآنی اور خاقانی کی زمین میں ایک نعتیہ قصیدہ لکھا ہے جس کے متعلق مولانا حسن امام صاحب وارثی نے صحیح فرمایا ہے کہ قاآنی نے نعتیہ قصیدہ کی جہاں انتہا کی ہے بینظیر وہاں سے ابتدا کرتے ہیں۔" یہی حال دوسرے قصاید کا بھی ہے۔ ایک مسدس چہل بند ہے جس میں فلسفہ کے دقیق مسائل کا بیان ہے جس کی وجہ سے وہ عام فہم نہ رہ سکا

ہوا ہے پی کے وہ گل اور بھی شباب میں آگ — بھری تھی پھول کہ کتنی شیشۂ شراب میں آگ
اگر نہیں نہ سہی ساغر شراب میں آگ — مجھے ہے برف بھی ساقی ترے عتاب میں آگ
غضب کی آتش تر میں ہے بوئے گل کی لپٹ — شراب ہے کہ بسائی ہوئی گلاب میں آگ
ہٹی جو گرد الم سوز دل بھڑک اٹھا — دبی ہوئی تھی یہ کب کی دل خراب میں آگ
نہا رہا ہے وہ شعلہ عذار دریا میں — کہ جل رہی ہے یہ دامان موج آب میں آگ
وہ دل برشتہ ہوں جو ذکر صبح حشر سنا — لگا دی رات ہی کو دفتر حساب میں آگ
تپ فراق میں جلتا ہوں بینظیر مگر — بجھے گی جا کے یہ درگاہ بوتراب میں آگ

(۲)

نہ رہا حجاب نیاز بھی جو نگاہ اہل نیاز میں — تو رہا نہ تیرے سوا کوئی پس پردہ حسن مجاز میں
مرے سجدے مل گئے خاک میں تو ملی یہ دولت سرمدی — تری خاک راہ چمک رہی ہے مری جبین نیاز میں
نہ ہوا اپنی آنکھ جو حسن بیں تو جہاں میں کوئی حسیں نہیں — جو وہ غزنوی کی نگاہ ہو وہی خم ہیں زلف ایاز میں
تجھے دیکھتے ہی یہ کھل گیا کہ نہیں جہاں میں دوسرا — نہ صنم رہے نہ حرم رہا تو ہی تو ہے عالم ناز میں
تو چراغ دیر و حرم رہے تجھے کیا پڑی ہے جو تو نے — کہ تمام رات بسر ہوئی ہے کسی کی سوز و گداز میں
پس مرگ داد وفا ملی یہ مراد دست دعا ملی — کہ تری وفا نے اٹھا لئے مرے پھول دامن ناز میں

علامہ حیرت بدایونی

یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد شاد

(مشرقی تہذیب کی بساط کا آخری مہرا)

دکن کی یہ مایہ ناز، عظیم المرتبت شخصیت، اپنے پیچھے صدیوں کی شاہانہ عظمت رکھتی ہے شاد کھتری نسل کی چندر بنسی شاخ "مہرا" کے چشم و چراغ اور شہنشاہ اکبر کے وزیر اعظم راجہ ٹوڈرمل کے سچے سپوت اور وارث تھے مشرقی علوم و فنون میں کوئی علم و فن ایسا نہ تھا جس پر انھیں ماہرانہ قدرت و عبور حاصل نہ ہو۔ انکی ہمہ گیری و جامعیت نے انکو امراء معاصرین میں بھی ممتاز رکھا اُن کی زندگی کے بیشمار پہلو ہیں، اور ہر پہلو ایک مستقل بحث چاہتا ہے۔ یہاں مختصر طور پر انکی شاعری کے متعلق کچھ لکھنا ہے۔ وہ فارسی اُردو اور ہندی میں بڑی روانی سے شعر کہتے تھے۔

فارسی میں علامہ شوستری، نواب ضیا یار جنگ اور مولانا عمادی و مولوی مسعود علی صاحب محوی اور ترکی صاحب سے مشورہ فرماتے تھے۔ ہندی شاعری میں غالباً کسی سے مشورہ نہیں کیا البتہ اردو میں جب کوئی تیرہ چودہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا تو چند سال طالب علمی کے زمانے میں بحیثیت شاعر روشناس نہیں ہوئے سن شعور کو پہونچنے کے بعد جب محبوب دکن حضرت آصف سادس کے دربار میں مقبول ہوئے تو حضور مرحوم نے شاد صوفی کو جہاں مدارالمہامی وغیرہ کی نعمتوں سے سرفراز کیا وہاں اپنی شاگردی کا بھی شرف بخشا۔ دربار شاہی میں فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی مرحوم کی جب باریابی ہوئی تو حضور مرحوم خود بھی داغ کے شاگرد ہوئے اور اپنے وزیر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد کو بھی داغ کا شاگرد کرادیا۔

داغ مرحوم کے بعد جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل کو بھی کلام دکھایا۔

اصناف سخن میں سے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی مگر غزل انکی محبوب ترین صنف سخن تھی فطرتاً فقیر منش و صوفی تھے اور عملاً امور دنیوی وزیر و امیر۔ اس لئے ان کے کلام میں اگر ایک طرف حسن و محبت کی رنگینی ہے تو دوسری طرف وجود و شہود کی شیرینی تقریباً اپنی اسی برس کی عمر میں لگ بھگ ساٹھ سال تک مشق سخن کی اور کسی موضوع سخن کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ ۲۸ جنوری ۱۸۶۴ء

کو راجہ نرندر پرشاد اور راجہ چندو لال کی ڈیوڑھی میں جنم لیا۔ اور ۳ مئی سنہ ۱۹۳۹ء کو اسی ڈیوڑھی میں اپنے محبوب حقیقی سے مل گئے۔

رہے نام اللہ کا!

ہندی کلام کا نمونہ خواجہ غریب نواز کی منقبت میں ایک ٹھمری کے چند بول ملاحظہ ہوں۔

خواجہ معین الدین میں تورے واری

شاد کو تم ہی جیتاؤ تو جیئے

سارے جگت میں تو کرپاری

شاد کی غزلوں کے منتخب اشعار درج ذیل ہیں:-

ہر قطرے میں اک بہتا دریا نظر آتا ہے — ہر ذرہ میں تابندہ صحرا نظر آتا ہے
گر آنکھ تو بند اپنی اور مجھ تصور ہو — پھر تجھکو دکھاؤں میں کیا کیا نظر آتا ہے

دربار محبت کا قانون ہی ایسا ہے — دیوانہ ہے فرزانہ۔ فرزانہ ہے دیوانہ
کیا خوب گزرتی ہے ہم دونوں کی آپس میں — وہ میرا ہے دیوانہ میں اسکا ہوں دیوانہ
ہاں سیر کرو دل کی اور اسکی ہوا کھاؤ — آبادی کی آبادی ویرانے کا ویرانہ

خاک کا تو ذرہ تھا ذات میں فنا ہو کر — کیا سے کیا ہوا آخر بندۂ خدا ہو کر
نام تھا فقط میرا۔ میں نہ تھا تو تو ہی تھا — اسطرح نہاں مجھ میں تو ہوا خدا ہو کر
درد سے اماں پائی عمر جاوداں پائی — شاد کو ستانا اسکا لگ گیا دعا ہو کر

ہجوم غم وفور ناتوانی دیکھتے جاؤ — مری حالت براہ مہربانی دیکھتے جاؤ
اسے دیکھو گے تم کیا۔ ہوش میں آؤ کلیم اللہ — تجلی میں بھی شان لن ترانی دیکھتے جاؤ

ہائے رعبِ حسن سے کہنے نہ پایا حالِ دل — اس نے پوچھا مجھ سے۔ میں نے کہدیا کچھ بھی نہیں
گلرخوں کو پھول سے تشبیہ دینا ہے غلط — رنگ اچھا ہے۔ مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں

اٹھ گیا شیوۂ انسانیت، انسانوں سے — لاکھ انسانوں میں بھی ایک نہ انساں نکلا
شادؔ کہتے ہیں جسے سب۔ وہ ہے صوفی لاریب — نہ تو ہندو ہی رہا وہ نہ مسلماں نکلا

جو واقف ہے طریقِ امتحاں سے — الٰہی ایسا دل لاؤں کہاں سے
عدم کو دیکھو اور ہستی کو دیکھو۔ — چلے آئے کہاں تک ہم کہاں سے
نشاں ہے بے نشانی ہی ہمارا — مکاں کی حد ملی ہے لامکاں سے
یہ کیا آنکھوں سے چھپکر دل میں رہنا — اٹھا بھی دو۔ یہ پردہ درمیاں سے

فصاحت جنگ جلیل

از جناب علی احمد جلیلی

سنہ پیدائش ۱۲۸۰ھ   سنہ وفات ۱۳۶۵ھ

جلیل اپنے زمانے کے سب سے بڑے غزل گو تھے۔ کلام میں ایک انفرادیت اور ایک مخصوص قسم کی طرز فکر ہے۔ سلاست زبان، حلاوتِ الفاظ، لطیف جذبات، سادگی خیال، رعنائی بیان اور پابندی محاورہ کی خصوصیت خاص ہے۔ محاورات و امثال کے استعمال میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اردو زبان پر ان کی حیرت انگیز قدرت سب تسلیم کرتے ہیں۔ وہ زبان و شاعری دونوں کے استاد تھے۔ روایتی غزل گوئی میں ایسا ممتاز و منفرد مقام رکھتے ہیں جس کے بلا شرکتِ غیرے خود مالک تھے۔ جلیل کا رنگ تغزل یا جلیل کی غزل کا عام آہنگ وہی ہے جو پرانی غزلوں کا تھا۔ جلیل نے ان تمام رسمیات کی نمود قائم رکھی ہے جن پر غزل کی بنیاد رکھی گئی لیکن ان پر ذاتی احساس اور جذبات نگاری کی تند سے چھڑک کر ان میں ایک چاشنی بھر دی۔ جلیل نے اپنے رنگ سخن سے اپنی غزلوں کو اتنا نکھار دیا ہے اور اتنا رس سمو دیا ہے کہ ان میں ایک خاص قسم کی لذتیت آ گئی ہے۔

جلیل کا تعلق لکھنؤ اسکول سے ہے اور وہ خالص لکھنوی شاعر ہیں۔ وہ قدیم و جدید رنگِ تغزل کے جھگڑوں میں نہیں پڑے انہوں نے اپنے رنگ ہی سے واسطہ رکھا اور یہی رنگ ان کے تغزل کی جان ہے۔ جلیل کا کلام پڑھئے آپ دیکھیں گے کہ ان کی دنیا بہت ہی سیدھی سادی ہے۔ جذبات بھی سادے ہیں۔ جلیل کی نفسیات اور انہیں کے دور کے دوسرے شعراء کی نفسیات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جلیل نے اپنی شاعری کو نہ تو مقصد حیات کا ذریعہ بنایا اور نہ اپنی غزلوں میں نفسیاتی تجزیئے کئے اور نہ نفسیاتی پیچیدگیوں اور زندگی کے جدلیاتی پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کبھی کوشش کی بلکہ غزل کے پیمانے میں حیاتی اور آفاقی رنگ کی شراب بھرنے کو خلاف اصول سمجھا۔ حیات و کائنات کی گتھیاں نہیں سلجھائیں بلکہ ان گتھیوں میں الجھنے والوں کو "گہے طفلے شو د مستانہ می رقصد" کی دعوت دیتے ہیں اور یہی ان کا آرٹ ہے انہیں خصوصیات نے ان سے ایسے اشعار کہلوائے جنہوں نے مقبولیت عام بخشی اور جو مدتوں بعد آج بھی تکل نو

کی طرح تازہ ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی کے دور کے لئے کہے گئے ہیں۔ لوگ آج بھی انہیں گنگنانے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔

محبت رنگ دے جاتی ہے جب دل دل سے ملتا ہے
مگر مشکل تو یہ ہے دل بڑی مشکل سے ملتا ہے

دیکھا جو حسن یار طبیعت مچل گئی
آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال
اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

جاتے ہو خدا حافظ ہاں اتنی گزارش ہے
جب یاد ہم آجائیں ملنے کی دعا کرنا

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

جلیل آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

خشن دیکھا جو بتوں کا تو خدا یاد آیا
راہ کعبے کی ملی ہے مجھے بتخانے سے

جلیل کی زندگی کے آخری دور میں جب شعری رجحانات میں انقلاب آیا اور سبھی نے اپنی اصلیتوں پر رنگوں کی تہیں چڑھالیں اس وقت بھی جلیل اپنے مقام پر پہاڑ کی طرح اٹل رہے نئی روشنی کے طوفان برق میں بھی جلیل کی موم بتی والی شمع جلتی رہی۔ جلیل کی شاعری پر کچھ اور لکھنے کے بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معاصر ادیبوں اور تنقید نگاروں کے وہ خیالات یہاں درج کر دیئے جائیں جو انہوں نے جلیل کی شاعری کے بارے میں ظاہر فرمائے ہیں :-

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں :-

"جلیل کے یہاں سلاست بیان کا یہ عالم ہے کہ گویا ایک نرم اور سبک روشمہ ہے

جو ہلکے ترنم کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ ان کا لکھنوی رنگ تغزل اتنا نکھرا ہوا اور اسقدر دلنشین ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے انسان اس کے سامنے سب کچھ بھلا دینے کو مجبور ہو جاتا ہے۔"

سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں :-

"جلیل کی شاعری کے خاص خصوصیات کلام کی فصاحت، زبان کی صحت، محاورات کی پیروی، بندش کی چستی، فن کے اصول و فروع کی پوری پابندی اور جملہ کلام کا حشو و زوائد سے یکسر پاک ہونا ہے۔ جس کا اندازہ ان کے ہر شعر سے ہوتا ہے۔"

قاضی محمد عبدالغفار رقمطراز ہیں :-

"مرحوم (جلیل) کی عجیب خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے اپنی ذات اور اپنی شاعری میں انیسویں صدی کے نصف آخر کے دو مکاتیب کی خصوصیات یکجا کر لی تھیں۔ وہ امیر مینائی کے بھی جانشین تھے اور استاد داغ کے بھی۔ داغ کی زبان اور بے ساختگی اور امیر مینائی کے تفکر دونوں سے جلیل کی شاعرانہ فطرت نے اپنا حصہ حاصل کیا تھا۔"

مرزا فرحت اللہ بیگ تبصرہ کرتے ہیں :-

"شاعری میں انہوں (جلیل) نے دہلی اور لکھنؤ کے رنگوں کو سمو دیا تھا۔ ان کے کلام میں رعایت لفظی کا استعمال اسطرح کیا گیا ہے کہ اسکی وجہ سے شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ انکے اشعار میں ہمہ گیری ہے انکے اشعار میں بلند پروازی ہے۔ مگر ایسی نہیں جسکو دیکھنے کے لئے دوربین کی ضرورت ہو۔ انکے کلام میں فصاحت ہے اور کیوں نہ ہو جب ان کا خطاب فصاحت جنگ تھا۔"

علی اختر کا خیال ہے :-

"جلیل مرحوم کی شاعری میں خیالات کی لطافت، مضمون آفرینی اور بندش کی چستی کا اسقدر اہتمام ہوتا تھا جو ناسخ اور امیر کے یہاں بھی نہیں پایا جاتا۔"

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے
فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے

اپنی ادا سے نیم نگاہی کا واسطہ
لے بے خبر خبر کہ ترے نیم جاں چلے

اٹھتا ہوں میں جو دشت سے جانب کوئے جنوں
کہتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے

آنکھوں میں کون آکے الٰہی نکل گیا
کس کی تلاش میں مرے اشکِ رواں چلے

جس جا گرے وہیں کے ہوئے تیرے ناتواں
نقشِ قدم کی چال ہیں کارواں چلے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

ذکرِ حبیب سے نہ ہو غفلت کبھی جلیل
چلتا رہے یہ کام بھی جب تک زباں چلے

ادا ادا تری موجِ شراب ہو کے رہی
نگاہِ مست سے دنیا خراب ہو کے رہی

غضب تھا ان کا تلوّن کہ چار ہی دن میں
نگاہِ لطف نگاہِ عتاب ہو کے رہی

تری گلی کی ہوا دل کو راس کیا آتی
ہوا یہ حال کہ مٹی خراب ہو کے رہی

ہماری کشتیِ توبہ کا یہ ہوا انجام
بہار آتے ہی غرقِ شراب ہو کے رہی

کسی میں تاب کہاں تھی کہ دیکھتا اس کو
اٹھی نقاب تو حیرت نقاب ہو کے رہی

جلیل فصلِ بہاری کی دیکھیے تاثیر
گری جو بوند گھٹا سے شراب ہو کے رہی

خوشی کی روشنی میں بھی سوادِ غم نمایاں ہے
مری صبحِ وطن پر دورۂ شامِ غریباں ہے

دوبالا رنگِ مستی ہو گیا رنگینیِ مے سے
کہ میں ساغر بکف ہوں اور ساغر گل بداماں ہے

بہارِ گل کا ہوں مرہونِ منت میں بھی اے گلچیں
ترے دامن میں گل ہیں میرے دامن میں گریباں ہے

نگاہِ ناز کو یارب دلِ بیتاب کیا سمجھے
تپش کہتی ہے بجلی ہے خلش کہتی ہے پیکاں ہے

صبا سرگوشیاں کیا کر رہی ہے غنچہ و گل سے
الٰہی خیر ہو کیوں بوئے گل اتنی پریشاں ہے

ہمارے قتل میں بحث آ پڑی ہے سخت جانی سے
قضا کہتی ہے مشکل ہے ادا کہتی ہے آساں ہے

صنم سب توڑ لیکن محتسب ٹوٹے نہ دل میرا
اسی شیشے میں سارے میکدے کا راز پنہاں ہے

جلیل الطافِ شاہانہ کی ہے تفسیر یہ مصرع
مقدر پر مجھے نازش مقدر مجھ پہ نازاں ہے

جناب محمد اکبرالدین صاحب صدیقی
لکچرار اردو دسٹی کالج

نواب عزیز یار جنگؒ

عزیزالدین خاں عزیز جنیر شریف (پونا) کے بزرگوں کی اولاد میں ہیں ان کے جدِ اعلیٰ سلطان الدین خاں اور ان کے فرزند محمد ابراہیم الدین خاں کو نواب آصفجاہ اول و ثانی کی ہمرکابی کا شرف حاصل رہا۔ چنانچہ نواب نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے ساتھ وہ حیدرآباد آئے اور اکثر مہموں میں شریک رہے۔ اور ہمیشہ آصفجاہی سلاطین سے اعزازات و مناصب پاتے رہے انکے فرزندوں میں قائم الدین خاں اور دائم الدین خاں کو صوبہ برار میں جاگیرات عطا ہوئیں۔ قائم الدین خاں کے پوتے نواب فیاض الدین خاں مشرف جنگ فیاض تھے ان کے والد نواب عزیزالدین خاں عرصہ دراز تک دوآبہ رائچور کے تعلقدار رہے۔ اور اپنی علمی اور عملی زندگی کی وجہ سے نہ صرف اپنے سلاطین کی نظر میں باوقار رہے بلکہ عوام میں بھی ہر دل عزیزی حاصل کی ان کا ذکر دکن کی تمام تاریخوں میں موجود ہے۔

مشرف جنگ فیاض حضرت میر شمس الدین فیض کے ارشد تلامذہ میں تھے اور شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے فیض کے انتقال پر انھوں نے اپنے استاد کا دیوان مرتب کیا ہر سال فیض کے عرس کے موقع پر مشاعرہ منعقد ہوتا اور گلدستہ شائع کیا جاتا۔ اس کا اہتمام فیاض ہی کرتے۔

عزیز سنہ ۱۲۹۰ھ میں پیدا ہوئے اور چونکہ انتہائی متمول اور بڑے گھرانے میں آنکھ کھولی اس لئے ماحول بھی بہت اچھا ملا۔ فیض کے تلامذہ مظفرالدین خاں مزاج، میر احمد علی عصر، بہاری لال رمز اور حفیظ الدین یاس کا شمار بلند مرتبت شعرا میں تھا۔ اور مزاج عزیز کے قریبی عزیز تھے اور عصر اتالیق اسطرح عزیز کو ابتدا ہی سے شعر و سخن کا ذوق ہوا اور مزاج سے اصلاح لینی شروع کی۔ اپنے والد سے بھی مشورۂ سخن کیا اور عصر سے بھی جب نواب فصیح الملک مرزا خاں داغ دہلوی رام پور سے حیدرآباد آئے تو عزیز نے مستقل طور پر ان کو کلام دکھانا شروع کیا اور اپنے آپ کو ان کا اتنا زیادہ مقلد بنا لیا کہ نہ صرف زبان بلکہ داغ کی خصوصیات شاعری پر بھی قادر ہوگئے وہ ابتداً ناظم عطیات علاقہ صرفخاص رہے اور پھر تعلقدار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اسی جائداد سے وظیفہ لیا سرکاری عہدہ اور فرائض کی انجام دہی اور دربار آصفی کا تقرب بہت کم دوسری مصروفیتوں کی اجازت دیتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ مبداء فیاض سے طبع رسا

لے آئے تھے اسلئے شعر گوئی ہی کو اپنا دلچسپ مشغلہ بنا لیا۔ ۱۳۱۶ھ میں اعلیٰ حضرت غفران مکان نے عزیز یار جنگ کا خطاب دیا۔ اور وہ بار آصفی سے قربت اور زیادہ ہو گئی لیکن اس کے باوجود شعر گوئی میں کمی نہ ہوئی بلکہ زبان پر قدرت حاصل کرنے اور تغزل کی شان پیدا کرنے کے لیے انھوں نے کافی محنت کی اور بڑے بڑے مشاعروں میں اپنے کلام کی داد حاصل کی۔

داغ کی قربت نے ان کی شاعری کو چمکایا۔ اس کے چند اسباب بھی تھے۔ داغ کا نام عزیز کی کوٹھی سے بہت قریب تھا۔ اور عزیز کے فرصت کے اوقات داغ کے پاس گذرتے اصلاح کے لئے آنے والی غزلیں عزیز ہی داغ کو سناتے اور اصلاح ہوتی، اس طرح بحث مباحثہ اور کلام کے حسن و قبح کو جانچنے کا موقع ملتا۔ رفتہ رفتہ عزیز بھی داغ سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھیں میں رنگ گئے۔ چنانچہ داغ کے دیگر ممتاز تلامذہ جنھوں نے استادی کا درجہ حاصل کیا۔ عزیز کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکے۔ مولانا احسن مارہروی اور نوح ناروی نے اپنی کتابوں اور مضامین میں اس کا ذکر کیا ہے دیگر متعدد کتابوں اور رسائل میں عزیز کی شاعری پر مضمون شائع ہوئے ہیں ۔ عزیز کے دو دیوان شائع ہوئے اور ایک انتخاب ڈاکٹر زور صاحب نے ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا ہے۔

عزیز نے فانی کے کلام پر بھی تنقید کی ہے یہ تنقید بہت سخت ہے۔ لیکن مطالعے کے بعد واضح ہوگا کہ وہ کتنے باریک بین اور دقیقہ رس تھے۔ آخری دور میں ان کی سماعت اور بصارت بہت متاثر ہو گئی تھی۔ مشاعروں کی فضا سے وہ کچھ بیزار سے معلوم ہوتے تھے۔ ترنم سے پڑھنے والے شعرا کو انشاء کا مقلد یعنی مصحفی کے الفاظ میں واللہ کہ شاعر نہیں۔۔۔۔۔ سمجھتے۔ اس کا اصل سبب یہ کہ وہ اسے کہ شاعر اپنے عروضی اور شعری معائب کو ترنم میں دبا دینے کی کوشش کرتا ہے اور سامعین کو شعر فہمی کی اجازت نہیں دینا چاہتا۔

آپ نے ۱۹۴۸ء / ۱۳۶۸ھ میں انتقال کیا۔

نواب عزیز یار جنگ کی غزل کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

غزل

(۱)

"محبت تیری کیا؟ میری وفا کیا؟ ذرا پھر تو کہو! تم نے کہا کیا

گئی گذری ہوئی باتوں سے حاصل — اب ان کا شکوہ کیا ان کا گلا کیا
شب غم اشک میرے تھم گئے کیوں — یہ ہے آخر الٰہی ماجرا کیا
یونہیں کہتا رہوں میں قصۂ غم — یونہیں کہتے رہیں گے آپ کیا؟ کیا؟
انھیں سے کر رہا ہوں انکے شکوے — الٰہی خیر ہو، مجھ کو ہوا کیا؟
کھڑا ہوں حشر میں خاموش دیکھوں — گناہوں کی ملے مجھ کو سزا کیا؟
یہاں دنیا میں خالی ہاتھ ہوں میں — خدا جانے ملے روز جزا کیا

مصیبت میں عزیزؔ انساں کرے صبر
خبر کس کو، کرے آخر خدا کیا

(۲)

روگ جی کا فراق ہے گویا — سانس لینا بھی شاق ہے گویا
تم سے کب تھی وصال کی امید — یہ بھی اک اتفاق ہے گویا
آنکھیں ملتی ہیں دل نہیں ملتے — دونوں جانب نفاق ہے گویا
دل لگانا ہے کھیل غیروں کو — جان دینا مذاق ہے گویا
چشم و ابرو کا حسن کیا کہئے — جام مئے زیب طاق ہے گویا
شاعری کا مذاق تھا پہلے — شاعری اب مذاق ہے گویا

آیئے جلد آیئے کہ عزیزؔ
ہمہ تن اشتیاق ہے گویا

(۳)

یہ شیوۂ وفا یہ عنایت غلط غلط — تم اور تم کو مجھ سے محبت غلط غلط
قاصد مجھے تو شبہ ہے ایک ایک حرف پر — ہے ان کے ہاتھ کی یہ عبارت غلط غلط
تم کان رکھ کے سنتے ہو مجھ کو یقیں نہیں — افسانۂ وفا و محبت غلط غلط
یوں جھوٹ موٹ باتیں بنانے سے فائدہ — ملنے کی آپ کو نہیں فرصت غلط غلط
اس چشم سرمگیں کے اشارے کچھ اور ہیں — کیسی حیا کہاں کی مروت غلط غلط

مٹ جائے دل سے لذتِ آزار جھوٹ جھوٹ | ٹل جائے سر سے ہجر کی آفت غلط غلط
ہم جاں نثار ہیں یہ ہمارا شعار ہے | اغیار اور تیری اطاعت غلط غلط
یہ افترا ہے جھوٹی اڑائی رقیب نے | کیوں ہوتی ان کو مجھ سے عداوت غلط غلط

جاتی ہے جانِ عشق میں یہ جھوٹ ہے عزیز
آتی ہے دل کے ساتھ مصیبت غلط غلط

(۴)

ہوسِ دولتِ دنیا بھی بلا ہوتی ہے | جتنا کم کیجیے اتنی یہ سوا ہوتی ہے
ان کی تصویر مرے غم کی دوا ہوتی ہے | دیکھ لیتا ہوں تو تسکین ذرا ہوتی ہے
تھام لیتا ہے وہیں بڑھ کے مجھے دستِ سبو | بے خودی میں جو ذرا لغزشِ پا ہوتی ہے
خلشِ الفتِ اغیار نکالوں کیوں کر | کہیں یہ پھانس کلیجے سے جدا ہوتی ہے
روز چلتا ہے پیالہ پہ پیالہ ساقی | روز میخانہ پہ گھنگھور گھٹا ہوتی ہے
پاؤں رہ جاتے ہیں جب راہِ طلب میں تھک کر | ہاتھ اٹھاتا ہوں تو مقبول دعا ہوتی ہے

نیند آ جاتی ہے آنکھوں میں دمِ ذبح عزیز
دامنِ تیغ کی کیا خوب ہوا ہوتی ہے

نواب عزیز جنگ ولاؔ

جناب محمد سعادت اللہ خاں صاحب
ایم-اے

وہ کون ہے جو نہیں چاہتا کہ دنیا میں اس کی شہرت ہو، نام ہو، نمود ہو، قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے، اس کے ہر کام کی تعریف کی جائے ـــــــ مگر حیدرآباد میں کچھ ایسی شخصیتیں بھی گزری ہیں، جو نام و نمود سے کوسوں دور رہکر بے لوث اور ٹھوس علمی خدمات کر گئی ہیں، انھیں میں سے ایک احمد عبدالعزیز ولاؔ بھی گزرے ہیں ـــــ

ولاؔ ۲۸ ستمبر ۱۸۶۲ء کی صبح کو قصبۂ نلور (صوبہ مدراس) میں پیدا ہوئے۔ اپنے نانا غازی الدین کے سایۂ عاطفت میں ابتدائی تعلیم حاصل کی نو برس کی عمر میں اپنے والد حاجی محمد نظام الدین کے ساتھ حیدرآباد آئے۔ فارسی عربی علوم کی تکمیل کی۔ فارسی شاعری میں ذکاؔ، معنیؔ، راقمؔ، اور سنجر طہرانی سے تلمذ رہا۔ سیدنا ابوبکر ابن شہاب کو عربی شعر دکھائے اور کامل لکھنوی، قدرؔ بلگرامی، سالکؔ، داغؔ، جلیلؔ اور اخترؔ مینائی کو اپنی اردو شاعری کا استاد بنایا۔ اختر اور جلیل نے تقریباً پورے کلام پر اصلاح دی

بلند اختر، جلیل الشاں میرے استاد ہیں دونوں
کسی شاگرد خوش طالع کی قسمت ہو تو ایسی ہو

ولاؔ کے تبحر علمی کے بارے میں محمد عمر مہاجر "مرقع سخن" جلد دوم میں لکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کے ربع اول میں ہر قسم کی معلومات بہم پہنچانے کا واحد ذریعہ حیدرآباد میں صرف نواب عزیز جنگ کی ذات تھی، اس زمانے کے مصنفیں اور مولفین کو ان کے وجود سے گراں قدر مدد ملتی رہی، ان کی زندگی حیدرآباد کی ایک ایسی زندہ تاریخ تھی جس میں یہاں کی معاشرت یہاں کے رسم و رواج اور یہاں کے علمی کارناموں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

ولاؔ نے سب سے پہلے "عزیز الاخبار" نکالا، پھر ماہنامہ لسان الہند والعجم" شائع کیا پانچ قانونی کتابیں ترتیب دیں، پندرہ کتابیں تصنیف و تالیف کیں اور خاموش عوامی خدمات انجام دیتے رہے۔ جن کے صلے میں سلطنت آصفیہ سے "نواب عزیز جنگ" اور وایسرائے ہند سے

"شمس العلماء" اور "خان بہادر" کے خطابات پائے۔

"کلیاتِ نظمِ ولاؔ" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ولاؔ نے اساتذۂ سخن کی غزلوں پر اکثر غزلیں لکھی ہیں، جو شعری عیوب سے پاک ہیں اور کہنہ مشقی کی غماز ہیں ـــــ اس میں کہیں کہیں دلی اسکول کی جھلکیاں ہیں مگر اکثر و بیشتر حصے پر لکھنؤ اسکول کا اثر نمایاں ہے اور متقدمین و متاخرین کا رنگ جھلکتا ہے۔ سلاستِ زبان، روانیٔ بیان، لفظی صنعت گری اور محاورہ بندی ان کے کلام کے خاص عناصر ہیں۔ ان کے شعروں میں کہیں کہیں سوز و گداز اور حسرت و یاس بھی ہے۔ ان کی غزل، حسن و محبت کے حدود توڑتی ہوئی نظر نہیں آتی ولاؔ نے ۷ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو وفات پائی۔ ان کے رنگِ سخن کا اندازہ حسبِ ذیل اشعار سے ہو سکتا ہے:۔

دشتِ جنوں میں عمر بھٹکتے گزر گئی — لیکن دلِ حزیں سے نہ نکلی وطن کی یاد
فرصت کی شب بھی شامِ غریباں سے کم نہیں — رہتی ہے رات بھر مجھے صبحِ وطن کی یاد

بجھ کر رہا فراق میں اس کے دلِ حزیں — شب ہی میں ہو گئے بجھے چراغِ سحر سے ہم

غم سے بھر آئی آنکھ تو پینے لگے ہم اشک — ضبطِ الم نے آنکھ کو ساغر بنا دیا
ہم رو رہے تھے بزم میں جب چل رہے تھے دور — اشکوں کو دل نے بادۂ احمر بنا دیا

آہ جو دل سے نکلتی ہے غبارے کی طرح — جھلملاتی ہے سرِ چرخ ستارے کی طرح
اشکِ سوزاں سے مرے آگ نہ لگ جائے کہیں — خونِ دل آنکھ سے اڑتا ہے شرارے کی طرح
میرے نالوں کی بلندی شبِ غم چار پہر — "حیدرآباد" میں ہے چار منارے کی طرح

راہ کی خاک پہ جمنے نہ دیا نقشِ قدم — باد پائی سے عیاں ہے ترے رہوار کی کاٹ
اس کے آنے کی خبر سن کے کہا میں نے ولاؔ — "حیدرآباد" کی گپ ہے کہ "ملیبار" کی کاٹ

مری صورت سے لی بہزاد نے تصویر وحشت کی
بگولا دامنِ صحرا کا خاکہ میری وحشت کا

ابر کا رونا تھا، بجلی کی ہنسی تھی رات بھر
تھا یہ عالم میری آہ گرم کی تاثیر کا

آپ اگر بت ہیں تو ہم بت پرست
ہم نہ بگاڑیں گے دھرم آپ کا

ہمارے سوزِ دل کو دامنِ دل کا سہارا ہے
بجھا سکتا نہیں کوئی چراغِ زیرِ دامن کو

آنکھیں لگی ہیں راہ پہ، جھپکی نہیں پلک
اے بے وفا! برا ہو ترے انتظار کا

لحاظِ بزمِ عشرت آج دامن گیر تھا ورنہ
جو ہم روتے تو محفل کو رلاتے اپنی آنکھوں سے

منصوبہ ہائے دل تو بہت کچھ تھے رات دن
کرنے کا تھا خیال مگر کچھ نہ کر گئے

ولا کی ایک غزل کے چند شعر بلاحظہ فرمایئے:۔

وابستۂ قدیم ہوں میں زلفِ یار کا
پیچوں سے تجربہ ہے فقط تین چار کا

میں بے خبر نشیب و فرازِ جہاں سے ہوں
کچھ غم جسے رہا ہو کا ہے نہ کھٹکا اتار کا

امیدِ وصل، وصل سے بہتر ہے، دوستو!
جب آ گئے تو لطف گیا انتظار کا

جنگل ہے لالہ زار مژہ کے خیال میں
احساں ہے آبلے پہ کسی نوکِ خار کا

جلتا ہوں سوزِ عشق میں بیٹھے ہیں اشکِ گرم
روشن چراغ ہوں میں کسی کے مزار کا

عارض سے زلف، زلف سے عارض کا ہے خیال
یہ سلسلہ ہے گردشِ لیل و نہار کا

اٹھنے لگے تو دوڑ کے اُن سے لپٹ گئے
دیوانہ ہو کے کام کیا ہوشیار کا

دلی سے کچھ غرض نہ ہمیں لکھنؤ سے کام
ملکِ دکن ولا! ہے وطن اپنے یار کا

شوکت علی خاں فانی

جناب ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب قتیل
ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ

شوکت علیخاں نام فانی تخلص۔ نسلاً پٹھان تھے۔ ان کے اجداد کو دربار دہلی نے جاگیر اور خطابات سے سرفراز کیا تھا۔ لیکن انقلاب زمانہ نے یہ نوبت پہونچائی کہ ان کے والد شجاعت علیخاں ملازمت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ فانی ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو قصبہ اسلام نگر ضلع بدایوں پیدا ہوئے سنہ ۱۹۰۱ء میں بریلی کالج سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں ال۔ ال۔ بی علی گڑھ کی ڈگری حاصل کی سنہ ۱۹۲۳ء تک لکھنو میں اور سنہ ۱۹۳۲ء تک آگرہ میں وکالت کرتے رہے۔ کچھ عرصہ بدایوں اور بریلی میں بھی وکالت کی سنہ ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد آئے یہاں سنہ ۱۹۳۹ء تک صدر مدرس رہے۔ اسی زمانہ میں نواب معظم جاہ کے ہاں باریاب ہوئے سنہ ۱۹۳۹ء کے بعد سے آخر عمر تک بیروزگاری کے ساتھ خودداری کو نباہ کر سنہ ۱۹۴۱ء میں انتقال کیا۔

ان کی ایک جوان لڑکی نے سنہ ۳۳ء میں انتقال کیا۔ دو لڑکے سعادت علیخاں اور وجاہت علیخاں بقید حیات ہیں۔

دور حاضر کے غزلگو شعراء میں فانی سب سے زیادہ انفرادیت کے حامل ہیں کیا بلحاظ احساس تغزل اور کیا بلحاظ اسلوب بیان وہ اپنے ہر شعر سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کی اٹھان غالباً عزیز لکھنوی کی گوروکفن والی شاعری کے زیر اثر ہوئی ہے۔ باقیات میں اس ماتمی رنگ کے بکثرت شعر موجود ہیں۔ فانی کا غم ان کی زندگی کی ایک تلخ حقیقت تھا لیکن اس غم کے اظہار کے لئے انھوں نے صف ماتم کی رسمی زبان اختیار کی۔ اگرچہ جنازہ، میت، گور، کفن اور نزع جیسے الفاظ بھی ان کی شدت احساس کی ترجمانی کے باعث اس قدر بے روح نہیں ہیں۔ جیسے عزیز کے کلام میں ہیں۔ تاہم انکی صحت ذوق رفتہ رفتہ ان الفاظ کو ترک کرتی گئی اور وہ اپنا حال اپنی ہی زبان میں سنانے لگے۔ درحقیقت فانی کے طرز فکر اور طرز بیان نے غالب اور مومن کا گہرا اور منفعل اثر

قبول کیا ہے۔ لیکن آخری زمانہ میں غالب اور مومن کا رنگ بھی ان کی طرز خاص کا ناقابل شناخت جزو بن گیا۔

اردو غزل کے ارتقا میں سراج اور میر کے بعد فانی تیسرے شاعر ہیں جن کی زندگی اور شاعری دونوں سراپا درد و غم ہیں۔ سراج کا غم ایک شاہد مجاز کی ودیعت تھا جس کو انھوں نے بعد میں عشق حقیقی سے مبدل کر لیا۔ میر کے یہاں دل کی آگ بھی ہے لیکن شاید ان کے پیٹ کی آگ اس سے زیادہ تیز ہے کیونکہ کبھی کبھی ان کے غم عشق سے بھی غم روزگار کی بو آتی ہے۔ فانی کا غم میر کی طرح غم عشق بھی ہے اور غم روزگار بھی لیکن میر کے برخلاف ان کا غم عشق اس قدر شدید ہے کہ وہ سعی معیشت میں تدبیر کی ناکامی اور تقدیر کی خرابی کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس تدبیر و تقدیر کا تعلق ان کے کاروبار شوق ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ قطع نظر اس سے میر اور فانی کے غم میں ایک صریح اور امتیازی فرق یہ ہے کہ میر کے غم کی تان ہمیشہ مایوسی اور بے سرو سامانی کے ایسے احساس پر ٹوٹتی ہے جس سے انسان کا دم گھٹنے لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ میر اپنے سننے والے کو اپنے ذہنی خلجان میں مبتلا کر لیتے ہیں لیکن فانی کے غم کی ہر موج ایمان کے ساحل سے ٹکرا کر ابدی سکون میں مبدل ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان کے غم کی تہہ میں اس حاصل غم کی قدر و قیمت کا ایسا لطیف احساس پوشیدہ رہتا ہے کہ ان کے آنسو ہماری فکر و احساس میں انتشار پیدا کرنے کی بجائے ہماری زندگی کے ناگزیر درد و غم کو بظاہر بہت خفیف لیکن درحقیقت اس قدر مضبوط سہارا دیتے ہیں کہ ہم اپنے میں ہر افتاد کو طمانیت قلب کے ساتھ سہہ جانے کی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

فانی کے غم کی اس مسرت انجامی کو سمجھنے کے لئے ان کے غور و فکر کی تمام منتشر کڑیوں کو جوڑ کر ایک ایسا سلسلہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو ان کے فلسفۂ غم اور تصور حیات پر منتج ہو لیکن یہ کام نہ اتنا آسان ہے نہ یہاں اس کی گنجائش ہے۔ البتہ مختصراً ان کا نتیجۂ فکر یہ ہے کہ انسان کی سعی و کوشش کیسی ہی مکمل کیوں نہ ہو کامیابی کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ تدبیر کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار محض اسباب و علل ہی پر نہیں ہے بلکہ اس غیر محسوس قوت پر بھی ہے جو نامعلوم طور پر اسباب و علل کے ساتھ ساتھ لیکن پس پردہ کارفرما رہتی ہے جس کو عرف عام میں

"مشیت الٰہی" کہا جاتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ تصور اتنا گہرا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ناکامی ہی کو نہیں بلکہ اپنی سعیِ ناکام کو بھی تقدیر کا جزو سمجھنے لگتے ہیں۔ غرض ان کی فکر کا یہی وہ منتہا ہے جہاں ایک قادرِ مطلق ہستی کے وجود کا ایقان محکم سے محکم تر ہو جاتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ ایقان و ایمان کی قوت کس قدر بے پایاں اور لازوال مسرت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ اسی نعمت عظمیٰ کے حصول کے باعث وہ اپنی ہر تباہی کو مشیت کی مخصوص رحمت سمجھنے لگتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ فانی زندگی کی بے کیفی اور موت کی تمنا کا ذکر کرتے ہیں، اور بار بار کرتے ہیں لیکن یہ احساسات درحقیقت ان کے جادۂ فکر کی درمیانی منزلوں کے احساسات ہیں جہاں وہ ایک عام انسان کی طرح جسم اور روح کی تھکن کا اظہار کرتے ہیں یا یوں ہم ان اشعار میں بھی میر کی سی پژمردگی اور افسردگی نہیں ملتی۔ ان کی آہ کے ساتھ لذتِ آہ کا احساس اس طرح لپٹا ہوا رہتا ہے کہ انکی آواز بھرانے نہیں پاتی۔

یہاں تک تو عرصہ حیات میں فانی اور ان کے خدا کا معاملہ تھا، جہاں ان کیلئے ہر تباہی ایک سرفرازی ہے۔ آئیے اب کوچہ عشق میں اس پردردۂ غم کا حال دیکھیں۔ لیکن یہاں بھی ان کی تقدیر میں غم ہی غم ہے اور یہ غم بھی ان کے لئے دنیا کی ساری مسرتوں سے زیادہ عزیز اور راحت رساں ہے کیونکہ دوست کی عطا کی ہوئی جراحتیں خواہ وہ کتنی ہی جاں گسل ہوں بالآخر ایک دوست ہی کی عطائیں ہیں۔

فانی کو "بیوہ عالم" سمجھنے والے یہ تو دیکھتے ہیں کہ ان کی زندگی غم کی مترادف بن کر رہ گئی ہے لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ خود زندگی فانی کے نزدیک کس حقیقت سے عبارت ہے۔ خود انھیں سے سنئے :-

زندگی یادِ دوست ہے یعنی — زندگی ہے تو غم میں گذرے گی
دم بھی فانی کسی کے غم تک ہے — دم نہ ہوگا اگر یہ غم نہ ہوا
تم پہ مرنا جنھیں نہیں آتا — زندگی کا انھیں شعور نہیں

غرض فانی کا غم، وہ غمِ دنیا ہو یا غمِ عشق صرف غم ہے۔ یاس نہیں ہے اور یہ غم بھی اپنے دامن میں اتنی لذتِ احساس رکھتا ہے کہ اس سے نہ ان کی زندگی بے کیف ہوتی ہے

نہ ان کے مطالعہ سے ہم میں ایسی بے کیفی پیدا ہوتی ہے جو ہمارے ولولۂ حیات کے لئے مضر ہو بلکہ ان لوگوں کے لئے جو فانی کے تصورات سے متفق ہوں انکی شاعری جاودانی مسرت کا سرچشمہ ہے۔ فانی کا یہ فلسفیانہ غم اُردو غزل کو غم کے ایک ایسے نئے احساس سے روشناس کرتا ہے جو صرف انھیں کا حصہ ہے۔

فانی کا بلند تصور دوست اور معین مسلک عشق بھی اُردو غزل کو ایک نیا مزاج اور نئی فضا دیتے ہیں۔ یوں تو دور حاضر کی غزل میں طالب و مطلوب کا کردار بہت کچھ شائستہ ہوگیا ہے لیکن فانی کے نزدیک ان کا محبوب اس قدر عالی مرتبت ہستی ہے کہ اسکی عظمت سے ان کا ایک ایک لفظ متاثر ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس کا ذکر بھی کرتے ہیں تو یار، معشوق اور محبوب جیسے الفاظ بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان الفاظ کے ساتھ کوٹھے اور بازار کا حسن بھی مذکور ہوتا رہا ہے۔ ان الفاظ کی بجائے وہ بالعموم لفظ "دوست" سے محبوب کو یاد کرتے ہیں۔ غزل میں یہ لفظ نیا نہیں ہے لیکن جس خصوصیت اور کثرت کے ساتھ فانی نے اس کو استعمال کیا ہے اور جو پاکیزہ تصور اس کے ساتھ وابستہ کیا ہے اس کو اردو غزل پر فانی کا ایک اضافہ سمجھنا چاہیئے۔

اسی طرح ان کا مسلک عشق بھی معین اور مستقل ہے جس کو فانی کا مسلک نیاز سمجھنا چاہیئے۔ مشق ستم ان پر بھی ہوتی ہے۔ قدم قدم پر ناکامی سے وہ بھی دوچار ہوتے ہیں لیکن وہ جس حوصلہ مندی کے ساتھ اپنی نیازمندانہ روش کو نباھتے جاتے ہیں۔ ہر مدعی عشق کے بس کی بات نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کی زبان پر حرف شکایت ہی نہیں آتا۔ وہ شکایت کرتے ہیں، اظہار غم کرتے ہیں، عرض مدعا کرتے ہیں لیکن یہ سب کچھ اس مقام سے کرتے ہیں۔ جہاں بلند سے بلند حوصلہ بھی اقتضائے انسانیت سے مغلوب ہو جاتا ہے اور یہیں انکے کردار کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے جب اس مجبوری میں بھی ان کا ذوق نیاز اور جذبۂ احترام محو ہونے نہیں پاتا۔

فانی الفاظ کے مزاج اور انکی معنوی وسعت سے اچھی طرح واقف ہیں خصوصاً غم کی کیفیات کی ترجمانی میں ان کی قوت اظہار مسلم ہے اور چونکہ ان کی شاعری تقریباً ایک سی کیفیات

اور ایک سے رجحانات کا مرقع ہے اس لئے ان کی لفظیات بھی مخصوص اور معین ہو گئی ہے جب خیال الجھا ہوا ہوتا ہے تو غالب کی طرح وہ بھی فارسی الفاظ اور تراکیب کا سہارا لیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک آدھ لفظ ایسا رکھ دیتے ہیں جس سے طرز بیان میں بے ساختگی آجاتی ہے اس فن کارانہ چال میں وہ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی اکثر مقامات پر ان کی لطافت غم بھاری بھرکم ترکیبوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ فانی کی زبان پر اکثروں کو اعتراض ہے اور بلا شبہ ان کے ہاں ایسے اسقام ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ان کے طرز بیان کو نہ مجموعی طور پر پر تکلف ہی کہا جا سکتا ہے اور نہ سادہ و بے ساختہ ہی۔ کیونکہ کبھی تو وہ غالباً غالب کے زیر اثر اس قدر تکلف اظہار سے کام لیتے ہیں کہ شعر بوجھل ہو جاتا ہے۔ باقیات میں ایسے متعدد شعر ملتے ہیں اور کبھی ایسی بلیغ سادگی پر آجاتے ہیں کہ میر سے آنکھیں ملانے لگتے ہیں۔ فانی آخری زمانہ میں اسی طرز پر آ گئے تھے۔ ان کے ہر طرز کی مشترکہ خصوصیت الفاظ کی تکرار ہے لیکن یہ خصوصیت آزاد انصاری کے پاس بھی نظر آتی ہے اس لئے یہ تصفیہ کرنا مشکل ہے کہ اس خصوص میں کس نے کس سے استفادہ کیا ہے جہاں تک فانی کا تعلق ہے وہ تقریباً ہر شعر میں اس لفظی صنعت سے کام لیتے ہیں۔ اس کے باوجود بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ کی یہ الٹ پھیر ذوق سامعہ کو ناگوار گذرے۔

فانی کی دو غزلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں :-

غزل

(۱)

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں
لئے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

وحدت حسن کے جلووں کی یہ کثرت اے عشق
دل کے ہر ذرے میں عالم ہے پری خانے کا

ہم نے چھانی ہیں بہت دیر و حرم کی گلیاں
کہیں پایا نہ ٹھکانا ترے دیوانے کا

کس کی آنکھیں دم آخر مجھے یاد آتی ہیں
دل مرقع ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

(۲)

کارواں گذرا کیا ہم رہ گزر دیکھا کئے
ہر قدم پر نقش پائے راہ بر دیکھا کئے

دردمندان وفا کی ہائے رے مجبوریاں
درد دل دیکھا نہ جاتا تھا مگر دیکھا کئے

یاس جب چھائی امیدیں ہاتھ مل کر رہ گئیں
دل کی نبضیں چھٹ گئیں اور چارہ گر دیکھا کئے

تو کہاں تھی اے اجل! اے نامرادوں کی مراد!
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

زیست تھی فانی بقدر فرصت تمہید شوق
عمر بھر ہم پرتو نور بشر دیکھا کئے

(۳)

وہی وہ ہیں مگر ظہور نہیں
اس طرح دور ہیں کہ دور نہیں

گھر جلاتے تو ہو مگر کس کا
دل ہے بندہ نواز طور نہیں

تم پہ مرنا جنہیں نہیں آتا
زندگی کا انہیں شعور نہیں

ہم بھی اپنی وفا پہ ہیں مغرور
بات کی بات ہے غرور نہیں

ترک دنیا نہ ہو سکے تو نہ کر
غم دنیا مگر ضرور نہیں

ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانی
ہم نہ ہوں گے وہ دن بھی دور نہیں

حضرت امجد حیدرآبادی

جناب خواجہ حمید الدین صاحب شاہد
لکچرار اُردو چادر گھاٹ کالج

حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد اُردو کے ان چند باکمال اور صاحب دل شاعروں میں سے ہیں جنھیں زمانہ صدیوں بعد پیدا کرتا ہے حضرت امجد سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے رباعی گو شاعر کی حیثیت سے اُردو دنیا میں نام پیدا کیا۔ آپ آج سے تقریباً (۷۵) سال پہلے حیدرآباد میں پیدا ہوئے ابھی چالیس دن ہی کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بیوہ ماں کے زیر سایہ پرورش پائی۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی پھر مدرسہ نظامیہ میں کئی سال تک پڑھتے رہے۔ پنجاب کے امتحان منشی فاضل میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ مدرسہ دارالعلوم میں مدرس اور صدر محاسبی میں منتظم کی حیثیت سے کارگزار رہ کر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

حضرت امجد کی ہستی نہ صرف سرزمین دکن بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے لئے باعث فخر ہے۔ آپ نے اپنی شاعری میں انفرادیت کی شان پیدا کری ہے پندرہ سال کی عمر سے شعر کہتے ہیں۔ آپ کا کلام مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ صنف رباعی تو آپ کے نام کے ساتھ مخصوص ہو چکی ہے۔ اس وقت سارے ہندوستان اور پاکستان میں حضرت امجد کی ٹکر کا کوئی رباعی گو شاعر نہیں ملے گا۔

آپ کی غزلیں بھی خاص رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ زبان کی سلاست، بیان کی خوبی اور تاثر کی فراوانی کے علاوہ لفظی و معنوی خوبیاں بھی بدرجۂ اتم موجود رہتی ہیں۔ حضرت امجد نہ صرف بلند پایہ شاعر ہیں بلکہ ایک خدا رسیدہ بزرگ اور صاحب باطن صوفی بھی ہیں۔ حضرت امجد جیسے باکمال شاعر و ادیب کی خدمات کا اعتراف کرنے کے لئے ادارۂ ادبیات اُردو کی طرف سے ۱۴؍ جنوری ۱۹۵۵ء کو یادگار جشن الماس منایا گیا جس کی صدارت افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق مرحوم سابق ممبر پبلک سرویس کمیشن مدراس نے فرمائی۔

حضرت امجد کی خدمت میں اہل ملک کی طرف سے سپاس نامہ اور کیسۂ زر پیش کیا گیا

حیدر آباد میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی تقریب تھی حضرت جوش ملیح آبادی حضرت جگر مراد آبادی اور حضرت بالمکند عرش ملسیانی نے نہ صرف اس تقریب میں شرکت فرمائی بلکہ خراج عقیدت بھی پیش کیا۔

حضرت امجد اب بہت ضعیف ہو گئے ہیں آنکھوں سے کم دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے باہر بہت کم نکلتے ہیں۔ غزلوں کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

غزل (۱)

کس چیز کی کمی ہے مولا تری گلی میں — دنیا تری گلی میں عقبیٰ تری گلی میں
جام سفال اس کا تاج شہنشہی ہو — آ جائے جو بھکاری داتا تری گلی میں
دیوانگی پہ میری ہنستے ہیں عقل والے — تیری ہی گلی کا رستہ پوچھا تری گلی میں
ہے فیض کی تجلی گہری اندھیریوں میں — بکتا ہے رات ہی کو سودا تری گلی میں
موت اور حیات میری دونوں ترے لئے ہیں — مرنا تری گلی میں جینا تری گلی میں

امجد کو آج تک ہم ادنیٰ سمجھ رہے تھے
لیکن مقام اس کا دیکھا تری گلی میں

(۲)

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا — کوئی تم سا نظر نہیں آتا
ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں — وہ تماشا نظر نہیں آتا
اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھوں گا — مجھے ایسا نظر نہیں آتا
ہو چلی ختم انتظار میں عمر — کوئی آتا نظر نہیں آتا
جھولیاں سب کی بھرتی جاتی ہیں — دینے والا نظر نہیں آتا
جو نظر آتے ہیں نہیں اپنے — جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

زیر سایہ ہوں اس کے میں امجد
جس کا سایہ نظر نہیں آتا

(۳)

آفت ہے آئے دن طلبِ ملک و مال میں
راحت ہے دو جہان کی ترکِ سوال میں

کہتے ہیں وہ بلند ہے وہم و خیال سے
یہ بھی ہے اک خیال ہمارے خیال میں

دیکھو خدا کی شان وہ آئے ہیں میرے گھر
جو آج تک نہ آئے کسی کے خیال میں

جب تک رہا فراق رہی ان کی جستجو
اب ہے کہ خود کو ڈھونڈ رہے ہیں وصال میں

وہ آنے والے ہجر کے جھگڑوں سے بچ گیا
جس زندہ دل نے جان ہی دیدی وصال میں

جھکتا نہیں ہے بدر کبھی مثلِ ماہِ نو
کیا شان ہے کمال کی اہلِ کمال میں

دیکھو نہ کم نگاہی سے امجد فقیر کو
آبِ حیات ہے اسی جامِ سفال میں

بقیہ صفحہ ۹۲

(۴)

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں

پڑا ہے دستِ اجل مجھ پہ لاکھ بار مگر
نکل گیا ہوں تڑپ کر وہ بے قرار ہوں میں

مجھے آج سمجھانے نئی پی ہے حضرتِ واعظ
ازل کا مست پرانا شراب خوار ہوں میں

خبر نہیں اسے روتا ہوں حال پر جس کے
اداس صورتِ شمعِ سرِ مزار ہوں میں

بلائیں لیتی ہے پھر پھر کے گرد نومیدی
کسی کے در پہ الٰہی امیدوار ہوں میں

وہ بے قرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری
قرار بھی یہ پکارے کہ بے قرار ہوں میں

بڑے مزے سے گذرتی ہے بے خودی میں امیر
وہ دن خدا نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

صفی اورنگ آبادی

جناب محمد اکبر الدین صاحب صدیقی
لکچرار اردو سٹی کالج

صفی کے والد حکیم محمد منیر الدین قادری اورنگ آباد میں یونانی طبیب تھے۔ وہ ۲۶؍ رجب ۱۳۱۰ھ م ۱۴؍ فروری ۱۸۹۳ء کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے بہاء الدین نام رکھا گیا۔ لیکن انھوں نے خود بہبود علی رکھ لینا مناسب سمجھا اور زمانہ نے صرف صفی پر اکتفا کی۔ وہ سات سال کی عمر میں حیدر آباد آئے۔ مدرسہ نظامیہ میں شرکت کی حصولِ تعلیم کے بعد مدرسہ طبیہ میں داخل ہوئے۔ نصاب کی تکمیل تو کی مگر سند حاصل نہ کر سکے۔ اور شوقِ شعر گوئی نے انھیں محمد منیر الدین ضیا گورگانی تیموری کے پاس پہنچایا۔ اس کے بعد انھوں نے حکیم ظہور احمد صاحب ظہور دہلوی سے تلمذ حاصل کیا۔ کچھ دن انھیں سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ اور پھر محمد عبد الولی فروغ حیدر آبادی شاگرد داغ کو اپنا کلام اصلاح کیلئے دکھانے لگے۔ لیکن صفی کی طبیعت نہت عجلت پسند تھی اس لئے انھوں نے فروغ کو چھوڑ کر کیفی کو اپنا استاد بنایا اور دو سال تک یہ صحبت نبھ سکی اور اس کے بعد کیفی اجمیر چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ صفی نے اساتذہ سے جو کچھ سیکھا اسی راستہ پر چل کر اپنا ایک خاص رنگ پیدا کر لیا۔ کیفی داغ کی زبان اور ذوق کے رنگ میں شعر کہتے تھے اس لئے صفی کے کلام میں بھی کیفی کی یہ خصوصیت نظر آتی ہے۔ صفی نے مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں بھی شعر کہے ہیں اور انتہائی سادہ اور سلیس زمینوں کو بھی آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ لیکن دونوں حالتوں میں تغزل کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ معاملہ بندی اور عشق و محبت کی ترجمانی کو نہایت ہی حسن کارانہ انداز میں اپنی غزلوں میں سمویا ہے۔ اچھوتی اور نادر تشبیہیں اور استعارے محاوروں کا استعمال کلام میں بے ساختگی اور برجستگی صفی کی شاعری کی خصوصیات ہیں طویل غزلوں کے مطالعہ سے زود گوئی اور قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے۔

صفی مشاعروں میں شرکت کے عادی نہ تھے۔ رسائل میں غزلیں دینے سے احتراز بلکہ گریز کرتے تھے اس پر بھی ان کی غزلوں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ بچہ بچہ کی زبان پر ہیں ڈھولکوں پر گائی جاتی ہیں قوالیوں میں سنائی جاتی ہیں۔ کئی غزلیں ریکارڈ کی جا چکی ہیں اور کئی شعر اور مصرعے ضرب المثل بن چکے ہیں۔

صفی نے اپنی ساری زندگی شاعری کی نذر کر دی۔ والد کی زندگی تک تو انھیں غم روزگار کی ضرورت نہ تھی لیکن جب والد کا سایہ سر سے اٹھا تو آسمان پھٹ پڑا۔ معاشی حالات نے شاعر کو مفقود کرنا چاہا چنانچہ وہ ایک دفتر میں امیدوار ہو گئے۔ وقت کی پابندی، دفتریت، حاکم و محکوم کے تعلقات یہ سب چیزیں ان کی خودداری کے منافی تھیں اس لئے انھوں نے اس بے تنخواہ کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کی۔ کچھ دنوں اپنی خوش نویسی اور شعر گوئی کی بنا پر دفتر نظامت دیوان و مال ملکی میں ملازمت کی لیکن یہاں سے بھی چپ چاپ نکل آئے۔ قدر دانوں نے نواب معین الدولہ کی پائیگاہ میں پہنچایا لیکن چونکہ وہ شاعری کی بارگاہ میں باریاب تھے اس لئے پائیگاہ میں خودداری کا سودا نہ کر سکا تو کلت علی اللہ گھر بیٹھ رہے اور "درسفتی" کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ سوتیلی ماں اور خود دو آدمیوں کی گذران جوں توں ہو جاتی۔ دوست احباب اور قدر داں کچھ مدد کر دیتے۔ صفی نے اپنی زندگی بڑی تنگی سے گذاری لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ ان کے کلام کا مطالعہ ان کی حد درجہ مفلسی کی غمازی کرتا ہے وہ اپنا دیوان "پراگندہ" مرتب کر چکے تھے لیکن چھپتا کیسے؟ جب کہ کوئی سرپرست نہ ہو۔ انھیں بڑی تمنا تھی کہ دیوان چھپ جائے اور یہ حسرت دل ہی میں لئے ۱۲ مارچ ۱۹۵۴ء م ۱۵ رجب ۱۳۷۳ھ کو صفی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

صفی کے شاگردوں اور قدر دانوں کی کمی نہیں ۱۹۵۵ء میں صفی کی برسی بڑی دھوم سے منائی گئی اور ایک جلسہ میں دیوان کی اشاعت کا بھی بیڑا اٹھایا گیا تھا۔ خدا کرے کہ ان کا دیوان واقعتاً پراگندہ نہ ہو اور چھپ کر عروس ادب کا آویزۂ گوش بن جائے۔

صفی کی غزلوں کا نمونہ درج ذیل ہے:۔

(۱)

خیال آپ کا جب ذرا آگیا — تڑپنے میں ہم کو مزا آگیا
انھیں ہم سے ملنے کی فرصت کہاں؟ — گیا ایک تو دوسرا آگیا
خدا کی قسم کھا کے وہ چپ ہوئے — خدا کی قسم ہے مزا آگیا
کوئی جھوٹ کی حد بھی اے نامہ بر! — ابھی کی ابھی میں گیا آگیا

نہ ہم دوسرے ہیں نہ وہ دوسرا — زمانہ مگر دوسرا آگیا
سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستو — یہ دل ہے جدھر آگیا آگیا
صفیؔ کو بھی اچھا سمجھنے لگے
زمانہ اب ایسا بُرا آگیا

(۲)

چل دیا وہ رشکِ مہ گھر اپنا سونا ہو گیا — چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیرا ہو گیا
عاشقی میں ہم بڑھتے بڑھتے سودا ہو گیا — قطرہ قطرہ جمع ہوتے ہوتے دریا ہو گیا
ان کا دامن کیا چھٹا اک حشر برپا ہو گیا — اپنا قصہ قصۂ یوسف زلیخا ہو گیا
جس کو پہلے پہلے دل آرام ہم سمجھا کئے — رفتہ رفتہ اب وہی دل کی تمنا ہو گیا
ان کو دیکھو وہ نظر آیا کئے ہر رنگ میں — مجھ کو دیکھو دیدہ و دانستہ اندھا ہو گیا
میری آنکھیں تو لگی تھیں شوخیِ رفتار پر — اور وہ چلتے ہوئے دل لے کے چلتا ہو گیا
اپنے دل کا خون کر ڈالوں تو شاید چین ہو — یہ تو جس کا ہو گیا کم بخت اسکا ہو گیا
کیا یہی ہے شرم تیرے بھولے پن پر میں نثار! — منہ پہ دونوں ہاتھ رکھ لینے سے پردا ہو گیا
میری ہر اک بات قانونِ محبت ہے مگر
اے صفیؔ! میں شاعری کرنے سے جھوٹا ہو گیا

(۳)

وہ کسی کا بھلا نہیں کرتے — نہیں کرتے وفا نہیں کرتے
نہ کرو داغہائے دل کا شمار — دینے والے گنا نہیں کرتے
ہم نے جو کچھ کیا محبت میں — لوگ کرتے ہیں یا نہیں کرتے
تم نے کیوں چاہنے سے روک دیا — چاہتے ہم تو کیا نہیں کرتے
حیرتی بن کے دیکھ جلوۂ دوست — آئینے سے حیا نہیں کرتے
پیار دل کی بہار ہوتی ہے — عیش کے دن رہا نہیں کرتے
سوچ لو کیوں بنا رہے ہو صفیؔ! — درد دل کی دوا نہیں کرتے

(۴)

مصیبت، رنج، غم، صدمہ ہر اک منظور ہوتا ہے
محبت ایسی شئے ہے آدمی مجبور ہوتا ہے

کہیں جاتے ہیں تو اسکی گلی سے ہو کے جاتے ہیں
اگرچہ راستہ اس راستے سے دور ہوتا ہے

کوئی مجنوں کی عزت عشق کی سرکار میں دیکھے
بڑی خدمت پہ ایسا آدمی مامور ہوتا ہے

حسینوں کا تنزل بھی نہیں ہے شان سے خالی
بڑھاپے میں بھی ان لوگوں کے منہ پر نور ہوتا ہے

تری فرقت میں کچھ تو ہو نہیں سکتا غریبوں سے
تڑپ لیتے ہیں ان کا جس قدر مقدور ہوتا ہے

تجھے مشہور ہونا ہے تو جی بھر کوستا مجھ کو
برائی سے بہت جلد آدمی مشہور ہوتا ہے

صفی ہر دم تڑپنے کی بھلا طاقت کہاں مجھ میں؟
ذرا ان کو ستانا بھی کبھی منظور ہوتا ہے

"دورِ حاضر کی غزلوں کا رجحان بھی قابلِ دید ہے .... دورِ حاضر میں غزل نے نئے انداز سے نغمہ سرائی کی۔ تاثیر، ترنم، داخلی پہلو، ہمواری، یک رنگی، جذباتی اور ذہنی کیفیات کے اظہار میں خاص توجہ کی گئی۔ تصنع اور لفظی بھرمار اور بیکار باتوں کے بجائے شعراء نے سادگی، سچائی، روانی، بندش کی چستی اور موسیقیت کو جگہ دی ہے۔ لطیف و پرمعنی کنایات موجودہ اردو غزل کی امتیازی خصوصیات سے ہیں۔ عام طور پر غزلوں میں فلسفۂ حیات اور حقیقتِ ہستی کا بیان زیادہ ہو چلا ہے ..... ایک اور بڑی خصوصیت جو موجودہ اردو غزل میں نظر آتی ہے وہ اسکی حقیقت و واقعہ نگاری ہے۔ مبالغہ سے گریز کر کے ابتذال کے گندے نالے سے بچتے ہوئے ہمارے شعراء نے جذبات تخیل کی پاکیزہ دنیا کو آباد کرنا سب سے پہلا کام سمجھا .... زبان سے زیادہ خیالات کی بلندی و پرکاری پر زور ہے۔"

(نئے ادبی رجحانات ص۱۷۹ از ڈاکٹر اعجاز حسین)

علی اختر

محمد سعادت اللہ خاں
ایم۔ اے (عثمانیہ)

مشرق میں جب کوئی شاعر، کوئی ادیب یا کوئی فن کار زندہ رہتا ہے تو اس کی مناسب حوصلہ افزائی نہیں کیجاتی اور نہ ہی اس کے جگر پاروں کی قدر ——— جب وہ مرجاتا ہے تو اس کا سوگ منایا جاتا ہے، اس کی تخلیقات اور شاہکاروں کی چھان بین کی جاتی ہے، ان کو آنکھوں سے لگایا جاتا ہے اور ان پر بڑے بڑے مضامین اور مقالے سنائے جاتے ہیں ——— مگر ایسے ماحول میں علی اختر ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں، جن کی قدر مرنے سے پہلے بھی کی گئی اور مرنے کے بعد بھی۔ سنہ ۱۹۳۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۳۳ء تک حضرت نیاز فتح پوری نے ماہنامہ "نگار" میں مسلسل مضامین لکھ کر ثابت کرنیکی کوشش کی تھی کہ ان کی شاعرانہ عظمت ان کے ہم عصر جوش ملیح آبادی سے کہیں زیادہ ہے۔

علی اختر ۱۷ اپریل سنہ ۱۸۹۴ء کی صبح رامپور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی غرض سے آگرہ گئے، اٹاوہ گئے اور ایک مدت تک اپنے آبائی وطن علی گڑھ میں رہے۔ وہاں کی علمی و ادبی دنیا میں اتنے مصروف رہے کہ ان کا اپنا ایک خاص مقام پیدا ہوگیا۔ مذاقِ شعری ورثے میں ملا تھا، بچپن ہی سے شعر کہنے لگے اور اپنے والد جانشین داغ دہلوی جناب کاظم علی باغ کی رہنمائی میں اپنا ذوقِ سلیم نکھارتے رہے۔

میٹرک کامیاب ہونے کے بعد علی اختر اپنے والد کے ساتھ حیدرآباد آئے اور سررشتہ آبکاری میں ملازم ہوگئے۔ تنخواہ ناکافی ہونے کے سبب تنگدستی کا شکار رہے۔ اسی زمانے کی یادگار ان کی نظم "فاقے کی ایک شام" ہے جو انتہائی دردانگیز اور رقت آمیز ہے ——— ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا مگر وہ کسی پر بھی اپنی مصیبت ظاہر نہ ہونے دیتے تھے کیونکہ فطرتِ خودداری کے ہاتھوں مجبور تھے۔ ؎

خدا شاہد ! بھنور میں ڈوب جانا اس سے بہتر ہے
اگر ساحل ملے منت پذیرِ ناخدا ہوکر

جب محکمۂ تعمیرات میں مددگار معتمدی کے عہدے پر فائز ہوئے تو سکھ سے بسر ہونے لگی ؎

پھر بہار آئی، نشاطِ روح کا منظر کھلا
ساز جاگے، جام چھلکے، میکدے کا در کھلا

سنہ ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد سے پاکستان گئے مگر ؎

عشرتِ منزل سکون، اختر!
اک غریب الدیار کیا جانے ؟

علی اختر کا ابتدائی زمانہ بھی مصیبتوں میں گزرا اور آخری زمانہ بھی البتہ کاوشِ پنہاں سے سکون ملتا رہا چنانچہ وہ اپنی نظم "اپنے بچے سے آخری باتیں" میں کہتے ہیں ؎

زندگی بھر کشتۂ بے مہریٔ دوراں رہا
میں رہا لیکن رہینِ کاوشِ پنہاں رہا

مختصر یہ کہ ان کی زندگی ایک مسلسل تڑپ سے عبارت رہی ؎

کیا زمانہ کو یاد رکھیں گے
چار دن چین سے بسر نہ ہوئی

اور کراچی ہی میں دس سال کے بعد ۱۱؍ جنوری سنہ ۱۹۵۸ء کو یہ کہتے ہوئے ابدی نیند سو گئے ؎

موت آئی خوابِ شیریں کی طرح
ہم نے آنکھیں بند کیں اور سو گئے

ایک زمانہ تھا کہ حیدرآباد شعر و سخن کی پُرکیف فضا میں ڈوبا ہوا تھا۔ باغ صاحب کے مشاعرے بہار پر تھے، ان میں مشاہیر ادب اور کہنہ مشق اساتذۂ سخن جیسے جلیل مانک پوری، عبداللہ عمادی، نظم طباطبائی، وحیدالدین سلیم، حکیم آزاد انصاری، ضامن کنتوری، مرزا ہادی رسوا، ظفر علی خاں اور جوش ملیح آبادی گرمجوشی سے حصہ لیتے رہے اور ہر محفل کو اپنے گراں بہا نغموں سے گرماتے رہے۔ ان تاریخی مشاعروں میں علی اختر نے بھی مدتوں اپنے جوہرِ سخن دکھائے اور داد و تحسین حاصل کی ؎

نغمۂ درد چھیڑ کر انجمنِ حیات میں
عشق نے جان ڈال دی پیکرِ کائنات میں

علی اختر نے سنہ ۱۹۱۳ء سے نظمیں لکھنی شروع کیں۔ جب سنہ ۱۹۱۶ء میں رسالہ ذخیرہ کے مئی نمبر میں ان کی نظم "بہار کا آخری پھول" شائع ہوئی تو سب نے یہ جان لیا کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

سلیقہ تھا کسے اس انجمن میں سوز باطن کا؟
حقیقت کر دیا میں نے محبت کے فسانے کو

پھر اس کے بعد اردو زبان کا کوئی ایسا رسالہ ایسا نہ تھا جس میں ان کی کاوشیں نہ چھپتی ہوں۔

بے پردہ جو وہ جلوۂ پنہاں نظر آیا
اٹھتا ہوا اک حسن کا طوفاں نظر آیا

سنہ ۱۹۲۱ء میں ان کی نظم "منکرانِ خدا سے خطاب" شائع ہوئی جس سے ان کے مذہبی عقائد پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ دہریوں کو منہ توڑ جواب دیا تھا الحاد کو دبانے کی کوشش کی۔ جوش ملیح آبادی کی نظم "حرفِ آغاز" کے جواب میں بارہ سو شعر کی ایک طویل اور معرکتہ الآرا نظم "قولِ فیصل" لکھی جو لکھنؤ سے سنہ ۱۹۴۵ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ اس کے متعلق محترم نیاز رقم طراز ہیں کہ "قولِ فیصل" میں بحث و استدلال کے تمام پہلو سامنے آ گئے ہیں ایسے دقیق مسائل کو نظم کرنا آسان نہ تھا لیکن اختر اپنی زبردست قوتِ شاعرانہ سے کام لیکر مشکل سے مشکل مقامات کو بھی اس خوبی سے طے کر گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

علی اختر نے "موجِ گہر" میں بتایا ہے کہ شاعر کھویا کھویا سا رہتا ہے مگر اس کے کلام میں بیدار دل انگڑائیاں لیتی ہے۔ عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ شاعر اپنی رنگین بیانی اور شیریں زبانی سے اپنی تخلیق میں جادو جگاتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ شاعری الہام کا نام ہے۔ جب عہدِ رفتہ کی رنگینیاں فضائے یاد میں پرکشا ہوتی ہیں تو شاعر گم کردۂ ہوش و حواس ہو جاتا ہے، ایسے میں انسانی ہستی ایک اڑتا ہوا سا سایہ معلوم ہوتی ہے۔

جہاں ہے اک افسانۂ دل فریب
سبھی کچھ ہے لیکن حقیقت نہیں

علی اختر کی اکثر غزلوں اور نظموں میں "دنیا گریزی" کار فرما ہے ؎

عیاں جتنی زمانے کی حقیقت ہوتی جاتی ہے
خود اپنی زندگی سے مجھ کو نفرت ہوتی جاتی ہے

علی اختر کی شاعری کے بارے میں پروفیسر کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ وہ غزل سے کچھ مناسبت

رکھتے ہیں، غور و فکر کی عادت کچھ زیادہ ہے لیکن جذبات نوخیز و خام ہیں، کلام میں کوئی جدت یا گہرائی بھی نہیں ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ اقبال کی نادر ترکیبیں، اصغر کا لطیف تغزل اور ہلکا تصوف اختر کے یہاں پایا جاتا ہے۔ خیالات کے اظہار کا سلیقہ حاصل ہے۔

پروفیسر مجنوں گورکھپوری کی رائے ہے کہ علی اختر کے کلام میں ہم کو نئے انداز کا فلسفیانہ تعمق ملتا ہے لیکن نظموں میں وہ اپنی شخصیتِ شعری کو زیادہ اچھی طرح ظاہر کر سکتے ہیں، غزل میں کچھ کمزور پڑ جاتے ہیں۔

اور حضرت نیاز نے تحریر فرمایا ہے کہ علی اختر اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، جو شعر کے حدود کو بہت وسیع دیکھنا چاہتی ہے، یہاں تک کہ اگر کائنات کے تمام جھگڑے اس سے طے ہو سکتے ہیں تو بیانِ حسن و عشق کے ترک کر دینے میں بھی مضائقہ نہیں۔

ان کی غزل سے ہم کو کسی جگہ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے واقعی کسی سے محبت کی ہے اور اسی لئے جب وہ بربنائے رسم و رواج معاملاتِ محبت بیان کرتے ہیں تو ان میں مطلق جان نہیں ہوتی ان کا فطری میلان تفلسف کی طرف زیادہ ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص بیانِ حسن و عشق میں کبھی لوچ اور دردمندی پیدا نہیں کر سکتا۔

علی اختر نظمیں خوب لکھتے ہیں اور ان کے فکر کی بلندی ان میں بہت کامیاب نظر آتی ہے لیکن چونکہ غزل کی زبان اور غزل کے اندازِ بیان دونوں نظموں سے مختلف ہیں، اس لئے تغزل میں کامیاب نہیں ہیں اور مشکل ہی سے کوئی شعر ان کی غزل کا ایسا ہوتا ہے، جو ہمارے دل پر دیرپا نقش چھوڑ جائے۔

زندگی کیا ہے؟ جو دل ہو تشنۂ ذوقِ فنا — یعنی یہ پردہ تو اٹھ سکتا ہے آسانی کے ساتھ
ایک نقطہ پر نظر آتے ہیں اختر عیش و غم — زندگی اک شکل ہے یکجائیِ اضداد کی
کروٹیں وقت نے بدلیں کیا کیا — اثرِ گردشِ قسمت نہ گیا
تھا تو دنیا کا فسانہ دلِ جیب — تا بہ رودادِ حقیقت نہ گیا
مرا دل بھی زندہ تھا، ہم دم! کبھی — مگر اب تو یونہی سا کچھ یاد ہے
غم کی ہو داستاں میں بھی کس قدر دل آویزی؟ — جس نے جب سنی سمجھا میری ہی کہانی ہے
ٹپک پڑتے ہیں آنسو جب کسی کا درد سنتا ہوں — مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ میری کہانی ہے

جب ہم اختر کے اس قسم کے شعروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی شعریت اور تغزل [illegible]

آپ نے مسکرا کے یوں نظمِ جہاں بدل دیا
آج حدیثِ درد بھی ذکرِ جمیل ہو گئی

اخترِ نامراد وہ اور بھی شوخ ہو گئے
عرضِ نیازِ عشق کے درد و اثر نے کیا کیا!

مسکرائے وہ، مجھے یاد آ گیا پیمانِ ضبط
رہ گئی شرما کے گستاخیٔ لبِ فریاد کی

عہدِ ہجراں بے نیازِ گردشِ ایام تھا
صبح تھی، لیکن وہی رُخ پر نقابِ شام تھا

دل کی آبادی ہے اخترؔ! دل کی بربادی کا نام
اک تعلق ہے مری ہستی کو ویرانی کے ساتھ

وہ کھیچے جتنے، مقامِ شوق طے ہوتے گئے
وہ بولے جھکے مزاجِ حسن برہم دیکھ کر

ہاں پھر اک جنبش تڑپ کر اے اسیرِ بندِ غم!
چند کڑیاں اور باقی رہ گئی ہیں دام کی

اخترؔ اک آہِ زیرِ لب اس کو فسانہ کر گئی
کہہ نہ سکے جو رازِ غم اپنے ہی رازداں سے ہم

ترے ادا شناس درد مست ہیں اپنے حال میں
عہدِ نشاطِ وصل کیا؟ عالمِ انتظار کیا؟

گئے وہ دن، جب ان کانٹوں میں پھولوں کی لطافت تھی
کہ اب دل کا لہو بھی زینتِ مژگاں نہیں ہوتا

جنوں نے فاصلہ رکھا نہ کوئی عشق و عرفاں میں
گریباں کے عوض اب ہاتھ الجھتا ہے رگِ جاں میں

نظر آتا ہے کچھ تشنہ سا حسنِ کائنات اب تک
ابھی شاید کوئی خم رہ گیا ہے زلفِ جاناں میں

بقدرِ شوق نہ تھا اہتمامِ سوز و گداز
خمیرِ خاک میں بھر دی ہیں بجلیاں میں نے

حریمِ کعبہ بنا دی وہ سرزمیں میں نے
ترے خیال میں رکھ دی جہاں جبیں میں نے

مجھی کو پردۂ ہستی میں دے رہا ہے فریب
وہ حسن، جس کو کیا جلوہ آفریں میں نے

علی اخترؔ کے دونوں شعری مجموعوں "انوار" اور "اسرار" کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سنجیدہ اور متوازن شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں رنگِ اقبال جھلکتا ہے ؎

اہلِ ہمت حلقۂ امواج میں رہتے نہیں
رخ بدل دیتے ہیں طوفانوں کا خود بہتے نہیں

علی اختر کی شاعری میں ہیجان ہے نہ طوفان، بولی ہے نہ ٹھولی، محاورہ بندی ہے نہ سوقیانہ پن، نعرہ بازی ہے نہ گروہ بندی، البتہ ہلکا سا فلسفۂ حیات ہے، سنجیدہ لب و لہجہ ہے۔ غزلوں میں جو بھی اسلوبِ بیان ہے جو ان کی نظموں میں بھی رہا ہے ؎

حضرت سیّد علی منظورؔ مرحوم

جناب حمید الدین صاحب شاہد
لکچرار اردو چادرگھاٹ کالج

حضرت سید علی منظور مرحوم حیدر آباد کے ایک پختہ مشق اور پرگو شاعر تھے ان کی شاعری ان کی افتاد طبیعت کی آئینہ دار ہے وہ زندگی کی ترجمانی کو شاعری کی سب سے بڑی بنیاد قرار دیتے ہیں انھوں نے اس معیار کو نہ صرف ہمیشہ پیش نظر رکھا بلکہ اس خصوص میں انفرادی شان پیدا کی۔ وہ ایک گوشہ نشین اور قناعت پسند شاعر تھے۔ نام و نمود اور شہرت کی بالکل خواہش نہیں تھی۔ ساری زندگی وضع داری کے ساتھ بسر کی۔ انتہائی افلاس اور تنگدستی کے زمانے میں بھی اس درویش خدامست نے کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا۔ وہ ۱۹ ستمبر ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے مدراس یونیورسٹی سے امتحان منشی فاضل میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد محکمہ طبابت میں ۳۰ تا ۶۰ روپے کی تنخواہ پر اہلکاری کی خدمت قبول کرلی۔ اور ساری عمر اسی جگہ پورہ کر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے وظیفے کے ڈھائی سال بعد ۱۱ نومبر ۱۹۵۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔ پہلا مجموعۂ کلام منظورؔ شائع ہوا تھا ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے دو اور مجموعے "نمود زندگی" اور "ترجمان زندگی" شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی نظموں کا سرمایہ غزلوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ غزل کہنے کا انداز بھی سب سے الگ ہے۔ ان کی بعض غزلوں کی زمینیں خود ان ہی کی ایجاد ہیں۔ مندرجۂ ذیل غزلوں سے ان کے رنگ تغزل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے

غزل

(۱)

اے کشمکش الفت جی سخت پریشاں ہے
مرنے کی بھی حسرت ہے جینے کا بھی ارماں ہے

ساحل سے نہیں لگتی غرقاب نہیں ہوتی
کشتی ہے کہ تھپیڑوں میں یہ بھی کوئی طوفاں ہے

میں کیا مری الفت کیا تو اور مجھے پوچھے
بس اے ستم آرا بس حسرت ہے نہ ارماں ہے

یہ موج تبسم کیا ظالم اسے دھو دے گی
جو رنگ پشیمانی چہرہ سے نمایاں ہے

مغرور محبت ہوں خود میری نگاہوں میں
یہ بے سرو سامانی راز سروساماں ہے

اس حسن مجسم کی شرمیلی اداؤں کا
احساس محبت بھی شرمندۂ احساں ہے

منظورؔ اسے رخصت کس دل سے کروں گا میں
دھڑکا ہے یہی ہر دم جب سے کہ وہ مہماں ہے

(۲)

تھی نظر ملانے کی آرزو زمانے سے
ہوش ہو گئے رخصت کیوں نظر ملانے سے

مل گیا پتہ ان کا دیکھ لی گلی ان کی
کیوں نہ مطمئن ہوں میں لگ گیا ٹھکانے سے

ذوقِ دید پیہم بھی کاش وہ عطا کر دیں
لطفِ سجدہ پاتا ہوں جن کے آستانے سے

دیکھ دیکھ کر مجھ کو جب پلائی ساقی نے
جھوم جھوم کر اٹھا میں نشاط خانے سے

سرگزشت دل میری واہ واہ کیا کہنا
بن گئے فسانے کچھ اک اسی فسانے سے

بے قرار کرنے کی آ گئی ادا ان کو
باز اب نہ آئیں گے وہ نظر چرانے سے

مضطرب نہیں ہوں میں مطمئن نہیں ہوں میں
دل کی آج یہ حالت وہ بھی جی لگانے سے

کیا غضب ہے اے منظورؔ اس بتِ پری وش کا
مسکرا کے اٹھ جانا نیند کے بہانے سے

(۳)

دردِ دل بار بار کیا کہئے
خود ہیں وہ شرمسار کیا کہئے

اعتبار نظر ہیں دونوں بھی
یہ خزاں! یہ بہار! کیا کہئے

ایسی بے اعتبار دنیا میں
اعتبار اعتبار کیا کہئے

بے سبب ہی تڑپ رہے ہیں ہم
حاصلِ انتظار کیا کہئے

رہ گئی یاد وضع داروں کی
کون ہے وضع دار کیا کہئے

عشق بے اعتبار ہے ہو گا
حسن اور اعتبار کیا کہئے

ان کی رنجیدگی نہیں منظورؔ
کیوں ہے دل بے قرار کیا کہئے

حیرت بدایونی

حیرت بدایونی ۱۵ ربیع الاول ۱۳۱۴ھ کو قاضی محلہ بدایون (یو۔پی) میں منصف عظمت علی صاحب کے مکان میں پیدا ہوئے جو آپکے دادا تھے آپ کے بزرگ عرب سے "سبزوار" (ایران) آئے چند پشتیں وہاں گزریں۔ پھر وہاں سے دہلی ہوتے ہوئے بدایوں پہنچے اورنگ زیب عالمگیر نے آپ کے جد اعلیٰ قاضی محمد جلیس کو عہدۂ قضاءت اور معافی کے چند گاؤں عطا کئے اور فتاوی عالمگیری مرتب کرائی اسی زمانے سے حیرت کے خاندان کے افراد قاضی زادے کہلاتے ہیں۔ ددھیال سے آپ صدیقی سبزواری اور ننہال سے صدیقی فرشوری ہیں آپ کے والد نے تاریخی نام منظور حسن ۱۳۱۴ھ نکالا۔ اور والدہ نے اپنے پیر کی رائے سے آپ کا نام سید حسن رکھا۔ یہی نام معروف ہوا۔ آپ نے جب شاعری شروع کی تو نام کے ساتھ حیرت تخلص کا اضافہ کیا۔ جب آپ کے بڑے فرزند موید حسن پیدا ہوئے تو آپ نے پھر اپنے نام میں ایک کنیت ابوالموید کا مزید اضافہ کرلیا۔ اس طرح آپ کا پورا نام یوں ترتیب پاتا ہے:۔

ابوالموید سید حسن حیرت صدیقی قادری بدایونی ثم حیدرآبادی۔

حیرت کے والد محمد حسن صاحب مرحوم نے منت مانی تھی کہ لڑکا پیدا ہوکر زندہ رہیگا تو علم دین اور عربی پڑھاونگا۔ چنانچہ فارسی تو والد نے خود پڑھائی اور مدرسہ شمس العلوم بدایون و مدرسہ قادریہ بدایون سے آپ نے سند تکمیل و فضیلت بھی حاصل کی اور الہ آباد یونیورسٹی و پنجاب یونیورسٹی سے علی الترتیب ملا۔ مولوی عالم فاضل کے امتحانات دیکر اسناد حاصل کیں۔ رامپور جاکر مولوی طیب صاحب مکی سے چند سال تک صرف عربی ادب پر عبور حاصل کیا۔ تحریک خلافت اور نان کوآپریشن کے سلسلے میں بدایون چھوڑکر حیدرآباد تشریف لائے غالباً ۱۹۲۲ء میں جب کہ سر علی امام صدر اعظم تھے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔ اس چھتیس ۳۶ سال کے سارے ریاستی و سیاسی نشیب و فراز آپ کے دماغ میں مستحضر اور آنکھوں کے پیش نظر ہیں۔ شاعری آپ نے تعلیم سے فراغ اور ملازمت کے بعد شروع کی۔ لیکن کم سنی سے ہی والد چچا اور بڑے بھائی کے ساتھ

مشاعروں میں جاتے تھے اسطرح شاعرانہ ماحول ہی میں آپکی پرورش ہوتی رہی۔ فارسی میں زیادہ کہتے ہیں خصوصاً رباعیات آپ نے زیادہ کہی ہیں۔ غزلیات کی بھی کافی تعداد ہے۔ سوسائٹی کی خاطر اُردو میں بھی کہتے ہیں اُردو میں غزل زیادہ کہتے ہیں اور کبھی کبھی دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں فن شعر میں کسی استاد کے سامنے کبھی زانوئے ادب طے نہیں کیا۔ سیکھے ہوئے علوم و فنون اور پڑھی ہوئی کتابوں نے آپ کو دہلوی و لکھنوی مکاتیب خیال کے اساتذہ سے بے نیاز رکھا۔ شاعری میں آپ کا کوئی استاد ہے نہ شاگرد۔ کیونکہ یہ کاروبار آپ کو پسند نہیں۔ اب رہگیا مشورہ دنیا اس میں کبھی آپ نے بخل سے کام نہیں لیا۔

حیرت اب مدنی سبزواری دہلوی بدایونی سے حیدرآبادی ہیں۔ آپ کی دو غزلوں کے منتخب اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

(۱)

آج وہ چیز نگاہوں سے پلادے ساقی
مجھ پہ کھل جائیں مشیت کے ارادے ساقی

حرف رکھنی ہے خرابات پہ ساری دنیا
ساری دنیا کو خرابات بنادے ساقی

فتنۂ ہوش سے ہے عافیتِ دہر تباہ
ہوش کی رسم ہی دنیا سے اٹھادے ساقی

یہ چھلکتے ہوئے ساغر کی تڑپتی موجیں
لے مجھے بھی اپنی موجوں میں بہادے ساقی

باُمیدِ کرمِ تو وطنے ساختہ ام
بلدِ رشکِ اِرم را زبِلادے ساقی

پھر تو حیرت کا کہیں اور ٹھکانا ہی نہیں
تو اگر اپنی نگاہوں سے گرادے ساقی

(۲)

عید آئی ہے۔ دے پیرِ مغاں آتشِ تر آج
کر بادہ و مینا نہ کو، پُر شیر و شکر آج

شوخی ہے بہاروں پہ تو شوخی پہ بہاریں
فردوس ہی فردوس ہے تا حدِ نظر آج

شمعوں سے کہو گائیں گلوں سے کہو ناچیں
دیکھو مرے گھر میں اُتر آیا ہے قمر آج

تھا رات ضرور آپ کے ہونٹوں پہ تبسم
ہنستی ہوئی نکلی ہے تباشیرِ سحر آج

ہر نقشِ گراں قدر و گراں مایۂ حیرت
جوہر ہے بہ ہر زاویۂ نقد و نظر آج

نجم آفندی

محمد سعادت اللہ خاں
ایم۔ اے (عثمانیہ)

سرزمین دکن دنیائے ادب میں ایک امتیاز رکھتی ہے، نہ صرف اس لئے کہ اس نے اُن باکمال شعرا کو پیدا کیا، جن پر خود اردو زبان کو ناز ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس نے غریب الوطن شاعروں کی مہمان نوازی کی، ہمیشہ ان کی سرپرستی کی انھیں اپنے جوہر نکھارنے کے مواقع عطا کئے اور اپنی جود و سخا سے ہزاروں شاعروں کو کسب معاش سے بے نیاز کر دیا۔ کئی مشاہیر ادب یہاں آئے اور نہال ہو کر اپنے وطن لوٹ گئے اور کئی تو یہیں کے ہو رہے۔ انھیں میں سے ایک مرزا تجمل حسین نجم آفندی ہیں جو مدتوں غازی آباد اور لکھنؤ میں رہے اور اب تقریباً بائیس سال سے یہاں سکونت پذیر ہیں اور ادبی زندگی گزار رہے ہیں۔

نجم آفندی ماہ رمضان ۱۳۱۰ھ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں بہت ہی ذہین تھے، جو کچھ پڑھتے تھے یاد کر لیتے تھے۔ اردو ہندی اور فارسی میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے ہاتھ میں انگریزی کتاب نظر آتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی سے بھی واقف ہیں۔

نجم آفندی سراپا اخلاق و محبت ہیں۔ چھوٹوں سے مشفقانہ انداز سے ملتے ہیں اور ساتھیوں سے پرخلوص انداز سے ــــ انھیں اپنے مسلک امامیہ سے کافی شیفتگی ہے ــــ

نجم آفندی کا ماحول مذہبی ہونے کے علاوہ شاعرانہ بھی ہے ان کے گھرانے میں چار پشتوں سے شاعری کا سلسلہ جاری ہے۔ ان کا بیان ہے کہ وہ بارہ برس کی عمر سے شعر کہہ رہے ہیں انھوں نے سب سے پہلے واقعہ کربلا کے متعلق ایک رباعی کہی۔ اپنے والد حضرت مرزا عاشق حسین بزم آفندی سے فن شاعری میں استفادہ کیا ــــ ہر صنف سخن سے دلچسپی ہے مگر نوحے میں آج ان کا جواب مشکل ہی سے مل سکے گا۔

نجم آفندی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں ان کی غزلوں میں احتیاط اور رکھ رکھاؤ زیادہ ہے سلاست اور روانی ہے، زور و قوت ہے۔ پختگی ہے۔ انداز بیان دلکش ہے۔

ہزار مرحلوں سے زندگی گزر آئی — قدم اکھڑ گئے جب راہ راست پر آئی
بلائے عشق ہزاروں کی جان پر آئی — نجات خلق کی اک آرزو نہ بر آئی

ہر اک زباں پہ چرچا ہے سرفروشوں کا
اجل کے سائے میں کیسا زندگی نکھر آئی

عذاب ہو گئی راہِ ثواب، ارے توبہ!
ہزار بار طبیعت گناہ پر آئی

کوئی بچا نہ زمانے میں جبرِ فطرت سے
لبِ وفا پہ بھی اک آہِ مختصر آئی

کچھ ایسے خاک نشیں اہلِ دل بھی گزرے ہیں
اجل بھی آئی سرہانے تو پوچھ کر آئی

بشر وہ کیا ہے؟ اگر چاند تک پہنچ نہ سکے
زمیں پہ حسن کے لئے چاندنی اتر آئی

یہ دور وہ ہے کہیں سے جواب تک نہ ملا
ہر ایک در پہ محبت سلام کر آئی

خدا ہی خیر کرے بے ضرر جہالت کی!
بشر کے علم کی تلوار باڑھ پر آئی

کسے نصیب ہے مقتل کا آئینہ خانہ؟
وہ بجلیوں کی جوانی تھی، بن سنور آئی

زہے سلیقۂ فطرت! جہاں بھی آئی ہے
نوید امن بہ تقریبِ شور و شر آئی

ہماری فکر کا انداز دیکھ کر اے نجم!
فلک سے کیا یہ غزل کی زمیں اتر آئی

پیامِ حق تہِ تیغِ ستم سنانا تھا
یہ وار بھی دلِ قاتل پہ کر کے جانا تھا

بھری بہار تھی، پھولوں میں آشیانا تھا
میں سوچتا ہوں حقیقت تھی یا فسانا تھا

کہا یہ کس نے؟ ہمارا بھی اک زمانا تھا
یہ بات کہہ کے کچھ اپنا ہی دل دکھانا تھا

نگاہ پھیر لی فطرت نے حسن دے کے فقط
بجبرِ عشق تمہیں آدمی بنانا تھا

اجل نے دی ہے وہ عجلت کہ سانس لے نہ سکے
ذرا حیاتِ دو روزہ پہ مسکرانا تھا

نہ غم کو تھی نہ حوادث کو دشمنی مجھ سے
کبھی کبھی مرے احساس کو جگانا تھا

خدا کو میں نے بفیضانِ عشق مان لیا
خرد زدوں کو دلائل میں سر کھپانا تھا

قدم قدم پہ خطا کی ہے، ابنِ آدم ہوں
نئے گناہ مگر سلسلہ پرانا تھا

میں نجم! حال کا مفہوم ہی سمجھ نہ سکا
مری نظر میں گزرتا ہوا زمانہ تھا

محمد عبدالحمید خاں خیالی

محمد عبدالحمید خاں ولد محمد عبدالکریم خاں مرحوم مولوی فاضل مدرسہ نظامیہ، ولادت ۲۶ جمادی الآخر ۱۳۰۸ھ میں بمقام محلہ چیلہ پورہ حیدرآباد ہوئی۔ ۱۳۲۱ فصلی سے شعر کہتے ہیں۔ ابتدا میں خیالی نے نواب جہانگیر علی خاں صاحب آنفت دہلوی سے مشورۂ سخن کیا۔ بعد میں حضرت عبدالولی فروغ مرحوم شاگرد حضرت داغ دہلوی کو کلام دکھایا کئے۔ حضرت فروغ کے ارشاد کی تعمیل میں محمود علی صاحب صفی اورنگ آبادی کے شاگرد ہوئے۔

محمد عبدالحمید خاں خیالی کی چند غزلیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں :-

غزل

(۱)

دوست ہم سے اجنبی ہے، دوست سے بیگانہ ہم
اب سنائیں کس کو اپنے درد کا افسانہ ہم

عمر گزری ہے نگاہِ مستِ ساقی دیکھتے
کیا کریں اب امتیازِ بادۂ و پیمانہ ہم؟

تو غریبوں کا سہارا ہے بیکسوں کی زندگی
کیا جئیں تیرے بغیر اے جلوۂ جانانہ ہم

منزلِ مقصود پر ہی سانس لیں گے آخری
ہارنے والے نہیں اے ہمتِ مردانہ ہم

ہر نفس ہو بے خودی عالم یہ عالم جلوہ گر
چاہتے ہیں ایک ایسی لغزشِ مستانہ ہم

جس قدر ہوتا ہے کوئی عالمِ دل کے قریں
اس قدر ہوتے ہیں اپنے آپ سے بیگانہ ہم

وہ دماغ و دل کہاں؟ وہ دن کہاں؟ وہ سن کہاں؟
اے خیالیؔ بن گئے ہیں جیتے جی افسانہ ہم

(۲)

کتنے منظر دیکھ ڈالے کتنے منظر رہ گئے
تشنہ کامِ دید پھر بھی دیدۂ تر رہ گئے

ضعف سے اظہارِ غم بھی نا مکمل ہی رہا
کچھ ستارے سے پلک پر جھلملا کر رہ گئے

شرم نے لیں چٹکیاں روکا غرورِ حسن نے
کچھ وہ کہنے کو تھے لیکن مسکرا کر رہ گئے

بھولنے سے تلخیاں کم ہو گئیں غم کی تو کیا
دل میں کچھ گزری ہوئی یادوں کے نشتر رہ گئے

اس قدر دل بجھ گیا ہے کثرتِ آلام سے
اے خیالیؔ ہم نہ رہنے کے برابر رہ گئے

(۴۳)

عیش بھی بنیادِ غم پایا گیا
تم گئے اور لطف جینے کا گیا

زندگی پھر اتنی فرصت دے نہ دے
دیکھ جب تک بھی اُسے دیکھا گیا

کیا قیامت ہے حصولِ مدعا!
وہ جو اک لطفِ تمنا تھا گیا

اب نہیں جچتا نگاہوں میں کوئی
آپ کا جلوہ قیامت ڈھا گیا

دردِ دل ہر ایک کو ملتا نہیں
یہ جسے بخشا گیا بخشا گیا

جیسی جیسی زندگی گھٹتی گئی
اعتبارِ زندگی بڑھتا گیا

تیری دزدیدہ نگاہی کی قسم
مجھ کو جینے کا سلیقہ آ گیا

اے خیالیؔ دل کو وہ تڑپا گئے
اور میرا دل مجھے تڑپا گیا

(۴۴)

دل کی چوٹیں دیکھئے یا دیدۂ تر دیکھئے
زندگی جو کچھ دکھائے زندگی بھر دیکھئے

میں نہیں کہتا کہ حالِ دل مکرر دیکھئے
بن گئے ہیں کتنے احساسات نشتر دیکھئے

ان کے جلوے تو بہر حال ان کے جلوے ہیں مگر
دیکھنے والی نگاہوں کا مقدر دیکھئے

آدمیت وسعتِ فکر و نظر کا نام ہے
جس کسی کو دیکھئے اپنے برابر دیکھئے

ہیں بہت آساں کنارے سے خیال آرائیاں
رہ کے طوفانوں میں طوفانوں کا منظر دیکھئے

یہ سکوتِ ظاہری کیوں ہے مجھے معلوم ہے
وہ ذرا آ جائیں تو پھر دل کے تیور دیکھئے

ان کی محفل میں خیالیؔ جا رہے تو ہیں مگر
کیا خبر کیا رنگ لائے قلبِ مضطر دیکھئے

ناصر زیدپوری

محمد سعادت اللہ خاں
ایم۔ اے (عثمانیہ)

میرانیس اور میرزا دبیر کے بعد سے فن مرثیہ گوئی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا کیونکہ انھیں کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر مرثیہ گو مراثی لکھتے رہے، جو فنی حیثیت سے زبانِ اردو کا سرمایہ تو ہیں مگر ان میں عصری رجحانات، اسلامی تعلیمات، فلسفہ، حقائق و معارف اور رموز و نکاتِ تصوف پر اتنا زور نہیں دیا گیا جتنا مصوری پر ــــ البتہ ناصر زیدپوری نے جدید تقاضوں پر پورا پورا اُترنے والے مرثیے لکھے، فن مرثیہ گوئی کو نیا ذہن دیا، نئی نئی راہیں نکال کر مرثیے کے دامن کو وسیع تر کر دیا۔

مولانا سید غلام عباس صاحب ناصر یکم جنوری ۱۹۱۵ء میں زیدپور ضلع بارہ بنکی (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی سید محمد جعفر صاحب ہے۔ ناصر زیدپوری کی ابتدائی تعلیم زیدپور میں ہوئی اور علوم مشرقیہ کی تحصیل لکھنؤ میں ــــ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی اور الٰہ آباد یونیورسٹی کے آخری امتحانات بھی کامیاب کئے۔ ابتدا میں گورنمنٹ ہائی اسکول (لکھیم پور) اور گورنمنٹ ہائی اسکول (ہردوئی) میں دو سال تک عربی کے استاد رہے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد آئے اور سٹی کالج میں اردو مدرس ہو گئے۔ اس کے بعد تین برس تک محکمۂ اطلاعات حیدرآباد دکن میں پبلک ریلیشن آفیسر کے عہدے پر فائز رہے اور اب ادبی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ناصر زیدپوری کا کلام فارسی اور اردو میں موجود ہے۔ یوں تو ان کو تمام اصنافِ سخن سے دلچسپی ہے لیکن مسدس اور غزل سے گہرا لگاؤ ہے۔ شعرگوئی کا شوق بچپن ہی سے ہے۔ ان کی پہلی غزل کے دو شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

نہیں ممکن کہ ہو جائیں نہ بسمل دیکھنے والے ‎ ‎ ترے ابرو کو سمجھیں تیغِ قاتل دیکھنے والے

ملیں گے نزع میں، مرقد میں، برزخ میں، قیامت میں ‎ ‎ ہمارا حالِ دل منزل بہ منزل دیکھنے والے

ناصر زیدپوری نے ابتدا میں حضرت فراست زیدپوری سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ جب لکھنؤ آئے تو چوبیس برس کی عمر تک حضرت مرزا محمد طاہر رفیع جانشین دبیر سے شرفِ تلمذ رہا۔ پہلے پہل مشق کے طور پر روزانہ ایک فارسی غزل اور ایک اردو غزل کہا کرتے تھے۔ جب نظریہ بدلا تو تحریکِ جذبات پر شعر کہنے لگے۔

غالب اور حالی کے مطالعے نے دماغ کو جلا دی ۱۹۳۶ء تک وہ لکھنؤ اسکول کی پیروی کرتے رہے۔ جب جدید ادب پڑھا تو یہ محسوس کیا کہ غزل کو بھی زندگی کے تقاضوں کا ساتھ دینا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے مزاجِ غزل برقرار رکھتے ہوئے مسائل کو غزل میں داخل کر لیا مگر اب بھی خالص اور نکھرا ہوا تغزل پسندِ خاطر ہے۔ جدید رنگ کی غزلوں میں فن کی پابندی کا خیال نہیں رکھا جاتا جو "عجزِ شاعرانہ" ہے۔ لیکن ناصر زیدپوری کا کوئی شعر بھی حدودِ فن کو توڑتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ان کے کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی غزل داخلیت اور خارجیت کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اس میں اندازِ بیان کی برجستگی ہے، زبان کی چاشنی ہے، روانی ہے، جدت طرازی ہے، مضمون آفرینی ہے، خیال کی وسعت ہے، معیارِ فن کی بلندی ہے، فلسفے کی جھلک ہے، حسن و عشق ہے، زندگی کا گہرا مشاہدہ ہے اور کیف آگیں موسیقی و ترنم ہے ——

صداقتِ بیان کے لئے چار غزلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

غزل

(۱)

بقیدِ "طور" جو "موسیٰ" نہ التجا کرتے — ترے جمال کا ہر سو مشاہدہ کرتے
حقیقتِ بشری پر جو تبصرہ کرتے — تو ہم گناہ کی عظمت سے ابتدا کرتے
اشارتاً بھی اگر عرضِ مدعا کرتے — ادا شناسِ مشیت خیال کیا کرتے؟
جو کوئی محرمِ اسرارِ عشق مل جاتا — کچھ اس سے اپنی محبت کا تذکرہ کرتے
حدود کر کے معین خطا و عصیاں کے — تعینِ کرمِ بے حساب کیا کرتے؟
مذاقِ درد جو ہوتا بقدرِ جوہرِ عقل — تباہیوں کے نہ سامان پھر ہوا کرتے
دلوں میں نفس کی خواہش نہ کروٹیں لیتی — نہ بندگانِ ضرورت خدا خدا کرتے
نہ بے حسی کے یہ چرچے جگہ جگہ ہوتے — اگر وہ دردبھری داستاں سنا کرتے

جو خود کو وارثِ جائز سمجھتے ہیں تنہا
کسی کے درد کی ناصر! وہ کیا دوا کرتے؟

(۲)

نگاہ دیکھ کے گلچیں کی، آنکھ بھر آئی — جہاں کلی کوئی کھلتی ہوئی نظر آئی

نئے چراغ، نئی روشنی نظر آئی
مشاہدات کی منزل جدھر جدھر آئی

ابھی تو شب کا سماں ہے، کہاں سحر آئی؟
فقط خیال کی صورت گری نظر آئی

قدم قدم پہ یہ ہوتا ہے اِن دنوں محسوس
اب آئی! آئی!! محبت کی رہ گزر آئی!!!

خیال آ گیا بھولے ہوئے فسانے کا
جب اُن کا نام سُنا، دل کی چوٹ اُبھر آئی

بہار دیکھنے پائے نہ تشنگانِ بہار
اِدھر خزاں گئی، اے باغباں! اِدھر آئی

شبِ فراق کے لمحے گواہ ہیں، ناصر!
کہ اُن کی یاد بہ پابندیٔ اثر آئی

(۳)

نظر گُل چیں کی اب کچھ اور ہی معلوم ہوتی ہے
مجھے خطرے میں پھولوں کی ہنسی معلوم ہوتی ہے

یہ دنیا چلتی پھرتی چھاؤں سی معلوم ہوتی ہے
یہاں تو چار دن کی چاندنی معلوم ہوتی ہے

مری بربادیوں کے جس قدر پہلو نکلتے ہیں
مجھے اتنی ہی شرکت آپ کی معلوم ہوتی ہے

یہی دیکھا ہے، اکثر جان جاتی ہے نتیجے میں
محبت ابتدا میں دل لگی معلوم ہوتی ہے

ستم گر! میرے ارمانوں کی دنیا لُٹ گئی جب سے
ہر اک بستی مجھے اُجڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے

بنے ہیں مرکزِ فکر و نظر نقشے تباہی کے
خرد کے بھیس میں دیوانگی معلوم ہوتی ہے

اندھیری رات! غافل راہ بر! رہزن تعاقب میں!
متاعِ کارواں لٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے

ستم کے اتنے نشتر باغباں نے دل میں توڑے ہیں
قبائے گُل بھی اب کانٹوں بھری معلوم ہوتی ہے

مرے اشکوں میں ہو غم کی صداقت کتنی ہی! ناصر!
کہا جاتا ہے، اِس میں شاعری معلوم ہوتی ہے

جناب خواجہ حمید الدین صاحب شاہد
لکچرار اردو چادر گھاٹ کالج

عبدالقیوم خاں باقی مرحوم

مادر جامعہ کے ان چند فرزندوں میں سے ایک تھے جن پر جامعہ عثمانیہ کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ ۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۱۶ء کو وہ حیدر آباد کے ایک خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ فارسی ادب میں ایم۔ اے کی ڈگری لی اور دو سال تک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کیا سنہ ۱۹۳۷ء میں سررشتہ تعلیمات میں ملازم ہو گئے سنہ ۱۹۴۲ء میں شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ میں لکچرار بنائے گئے دارالعلوم کالج، چادر گھاٹ کالج اور آخر زمانہ میں نظام کالج میں اردو کے لکچرار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کو شعر و ادب، مصوری اور موسیقی سے فطری لگاؤ تھا۔ ستار بہت اچھا بجاتے تھے۔ انگریزی ادب اور تنقید پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ کئی انگریزی نظموں اور منظوم ڈراموں کو اردو زبان میں منتقل کیا۔ جرمن زبان کے شاعر گوئٹے کے منظوم ڈراما "فاوسٹ" کا کامیاب ترجمہ کیا۔ ادبی اور تنقیدی موضوعات پر کئی مضامین لکھے جو مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ رسالہ جامعہ دہلی میں ان کے (۹) عنائیے شائع ہوئے تھے جن میں یوسف زلیخا، اقبال اور خاقانی بہت کامیاب اور بے حد مقبول ہوئے۔

پروفیسر باقی مرحوم کو قدرت نے حسن کارانہ دل و دماغ اور نظر عطا کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر ادب اور شاعری کے جمالیاتی پہلو پر غور و فکر کرتے تھے۔ پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے وہ "اردو شاعری کا جمالیاتی مطالعہ" پر تحقیقی کام کر رہے تھے۔ اگر کچھ دن اور زندہ رہتے تو اس مقالہ کو مکمل کر لیتے اور اردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہوتا۔ میرے خیال میں باقی مرحوم نے اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ مطالعہ کیا اور سب سے زیادہ لکھا لیکن یہ زمانہ کی ستم ظریفی ہے کہ ان کی ادبی تخلیقات کتابی صورت میں شائع ہو کر منظر عام پر نہ آسکیں۔ غزلیں بہت کم کہی ہیں۔ غزل کی زبان، انداز بیان اور طرز تخیل پرانی روایات کی آئینہ دار ہوتے ہوئے بھی جدت مضامین سے خالی نہیں ہے سنہ ۱۹۵۴ء میں اچانک طور پر دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ حضرت سردار بیگ قبلہ کے احاطہ میں اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے

اِن کی غزلوں کا نمونہ حسب ذیل ہے ۱۔

غزل (۱)

مژدہ اے برق تجلی ہوش میں آتا ہوں میں
عشق بن کر وادیٔ ایمن پہ چھا جاتا ہوں میں

آنکھ والوں کو عبث دعویٰ ہے میری دید کا
جو نظر آتا نہیں اس کو نظر آتا ہوں میں

میرے ذوق دید کا صدقہ جمال کائنات
حُسن کی آنکھوں پہ اپنا نور برساتا ہوں میں

مرحبا اے جذبۂ عشق آفریں صد مرحبا
حسن بن جاتی ہے دنیا جسطرف جاتا ہوں میں

میرا کھل جانا حقیقت میرا سمجھانا حیات
راز بن کر راز کے آداب سمجھاتا ہوں میں

آئینہ خانے تماشا ہیں میرے دیدار کے
حیرتوں کی زندگی آنکھوں سے دکھلاتا ہوں میں

اک کھلونا رکھ کے دو عالم کا اپنے سامنے
مجھکو بہلاتے ہیں وہ اور ان کو بہلاتا ہوں میں

(۲)

خمار نیند کا آیا مرے فسانے سے
حسین سو ہی گئے سازِ دل بجانے سے

جہان عشق میں کس سے بیاں کروں اے دل
جو نسبتیں ہیں مجھے ان کے آستانے سے

جلا یا عشق نے جب بجلیوں کا خرمن بھی
لپٹ کے رونے لگیں میرے آشیانے سے

چراغ شام کی یہ ضو فشانیاں ہے ہے
چمک رہی ہے فضا غم کے مسکرانے سے

شکستہ ساز میں یہ سوز عشق کیا کہنے
ستارے جھومتے ہیں میرے گنگنانے سے

بڑھی کہیں مہ و انجم سے آبرو دل کی
حسیں خیال کے پہلو میں جگمگانے سے

مری حیات میں باقی امید و یاس کہاں
مجھے ہے کام فقط قسمت آزمانے سے

(۳)

روٹھ گئی ان کی نظر دیکھنا
جرم محبت کا اثر دیکھنا

وصل کی اک آس مٹانا تو ہے
شام کو آوے گی سحر دیکھنا!

صاحبزادہ میر محمد علیخان میکش

جناب خواجہ حمید الدین صاحب شاہد
لکچرار اردو چادرگھاٹ کالج

صاحبزادہ میر محمد علیخاں میکش مرحوم خانوادۂ آصفی کے ایک ہونہار اور لایق فرزند تھے۔ سانولا رنگ، چھریرا بدن، غنچہ دہن، غزالی آنکھیں، کمانی بھنویں، ستواں ناک، سبک نقشہ، سر پر ترکی ٹوپی ایک طرف کو ذرا جھکی ہوئی، ہمیشہ شیروانی پہنتے تھے۔ کم سخن اور اس سے بڑھ کر کم آمیز۔ لیکن ان کی مقناطیسی شخصیت نے سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ آج سے تقریباً (۲۴) سال پہلے سٹی کالج سے میٹرک پاس کر کے جامعہ عثمانیہ میں انٹرمیڈیٹ کی جماعت میں میرے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ دو سال تک تعلیم حاصل کی اور امتحان میں ناکام ہونے کی وجہ سے سلسلۂ تعلیم منقطع ہو گیا۔ جامعہ کی شعر پرور فضا میں میکش کے فطری جوہر چمکنے لگے اور چند ہی دنوں میں وہ جامعہ کے مقبول شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ "گریہ و تبسم" ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے جو ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہو کر ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ چھ سات سال بعد ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ "نوید" شائع ہوا۔ حیدرآباد اور اس کے باہر میکش کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ شاید ہی ان کے کسی ہم عمر شاعر کو نصیب ہوئی ہو گی۔ میکش کی غزلوں کو سن کر حضرت امجد نے فرمایا تھا کہ "کہنے والا کوئی اور ہے" یقیناً یہ خدا کی دین ہے جو چند خوش نصیب انسانوں کو ملتی ہے میکش کی جدت طبع اور پہلودار طبیعت پر سب کو حیرت ہوتی تھی۔ ان کا ذوق سخن بہت ہی نکھرا ہوا اور سلجھا ہوا تھا۔ اور یہ باتیں ایک نوعمر شاعر کیلئے یقیناً غیر معمولی تھیں۔ ڈاکٹر زور صاحب کی تحریک پر گولکنڈے کے تاریخی آثار پر نظمیں لکھ کر نہ صرف شاندار ماضی کی یاد تازہ کر دی بلکہ قطب شاہی تہذیب و تمدن کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔ میں نے ان کی یہ نظمیں "کھوئے ہوؤں کی جستجو" کے عنوان سے سب رس کے میکش نمبر میں شائع کر دی ہیں۔

میکش کئی سال تک رسالہ سب رس کی ادارت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔ بعد کو حیدرآباد دکن کے محکمہ ریڈیو میں ملازمت اختیار کر لی تھی چند سال بعد اس سے بھی سبکدوش ہو گئے میکش کی زندگی کا آخری زمانہ بڑی مصیبت اور پریشان حالی کا زمانہ تھا۔ دق جیسا موذی مرض گھن کی طرح

انھیں کھارہا تھا۔ آخر کار زندگی کے (۳۰) سال گزرنے کے بعد ۱۳ فروری ۱۹۴۸ء کے منحوس دن موت نے میکش کو ہم سے چھین لیا۔ ان کی بیوی رفعت لیق بھی چند ماہ بعد اللہ کو پیاری ہوئیں اور دونوں میاں بیوی درگاہ حضرت محمد حسینی صاحب قبلہ کے شہر خموشاں میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

میکش مرحوم کے تین لڑکے اور ایک لڑکی اپنی نانی صاحبہ کے زیر پرورش ہیں۔ میری استدعا پر حکیم الشعراء حضرت امجد نے میکش کی تاریخ وفات پر یہ قطعہ ارشاد فرمایا تھا ؎

میکش کی التجا ــــ ساقیٔ کوثر سے ــ ؟

بھاگا ہوا ہے مدت کا غلام آیا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ با صد ادب اب بہر سلام آیا ہے
اے ساقیٔ کوثر ترا میکش میکش ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ٹوٹے ہوئے دل کا لے کے جام آیا ہے

محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر دکن کی نامور خاتون شاعرہ نے بھی ایک نظم لکھی جس کے آخری دو شعر یہ ہیں ؎

مختصر سی زندگی میں بھی رہا بے تاب تو ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ لے کے آیا تھا جہاں میں فطرت سیماب تو
تیرے افسانے کو دہرائے گی تاریخ دکن ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ یاد رکھے گا تجھے ہر دور میں تیرا وطن

پروفیسر منظور حسین شور کی نظم کے دو شعر درج ذیل ہیں ؎

ذکر ماضی نہ کروں شکوۂ فردا نہ کروں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ میں نے سوچا ہے تری موت کو رسوا نہ کروں
رات کی گود میں خورشید ضیا بار کی موت ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ عبرت انجام ہے اس خاک پہ فن کار کی موت

میکش کی تین غزلیں ملاحظہ فرمایئے :-

(۱)

شراب ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا
جھلک رہا تھا تبسم بھی ساغر مے میں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ پھر ایک بار اسی طرح مسکرا کے پلا
شراب نغمہ بھی بہتی رہے فضاؤں میں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کلام حافظ و خیام گنگنا کے پلا

ترا خیال ہے مجھ کو کبھی نہ بہکوں گا
تری قسم مجھے سو بار آزما کے پلا

کچھ امتیاز رہے میکدے میں میکش کا
لبوں سے اپنے ہر اک جام کو لگا کے پلا

(۲)

میری محویت کو گرما کر ہنسے
برق سی ہونٹوں پہ لہرا کر ہنسے

ہنس کے دیکھا دیکھ کر تڑپا دیا
دیکھنے والوں کو تڑپا کر ہنسے

کچھ تکلف سے گرائی برق بھی
جب ہنسی آئی تو شرما کر ہنسے

چاند کی کرنوں میں پھونکی روح سی
مستیاں منظر میں بکھرا کر ہنسے

لیں خمارِ حسن میں انگڑائیاں
موجِ مے کی طرح بل کھا کر ہنسے

کھو دیا حسنِ تکلم میں مجھے
اپنے منہ سے پھول برسا کر ہنسے

دستِ نازک میرے شانے پر رکھا
بجلیاں رگ رگ میں دوڑا کر ہنسے

کہتے کہتے رک گئے کچھ جی کی بات
اپنے منہ تک ہاتھ لے جا کر ہنسے

رکتے رکتے مجھ سے وعدہ کر لیا
اپنے وعدہ پر قسم کھا کر ہنسے

ہنستے ہنستے رک گئے کچھ سوچ کر
وجہ جب پوچھی تو شرما کر ہنسے

میکشِ خاموش نے مانگی جو مے
دور سے ساغر کو دکھلا کر ہنسے

(۳)

ڈرتے ڈرتے گناہ کرتا ہوں
تیری جانب نگاہ کرتا ہوں

عنفوانِ شباب کے صدقے
دل کی دنیا تباہ کرتا ہوں

یہ بھی کوئی گناہ ہے شاید
آج ترکِ گناہ کرتا ہوں

میری گستاخیاں معاف کریں
تیری محفل میں آہ کرتا ہوں

آج رہ رہ کے اپنے سجدوں کو
جانے کیوں فرشِ راہ کرتا ہوں

بات کھوتا ہوں التجا کر کے
التجائے نگاہ کرتا ہوں

لبِ فریاد بند ہے میکش!
ضبط کو صرف آہ کرتا ہوں

سکندر علی وجد

محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ
ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی (عثمانیہ)
صدر شعبہ اردو کلیہ اناث

کیلنڈر کے صفحات انسانی حافظہ پر اپنا نقش اسوقت تک نہیں چھوڑتے جب تک کوئی واقعہ ظہور پذیر نہ ہو۔ ۱۹۱۴ء میں حالی اور شبلی نے انتقال کیا اور شاید اردو زبان کے اس عظیم نقصان کی تلافی کے طور پر قدرت نے فیض، وجد، راشد اور میراجی کو جنم دیا۔ جنھوں نے اپنے افکار سے حالی کے خوابوں کو مجسم بنایا اور شعر و ادب میں نئی روایتوں کی بنیاد ڈالی۔ حالی سے پہلے اردو شاعری صرف غم جاناں کی تفسیر تھی جس میں غم دوراں کا دور دور تک شائبہ نہ تھا۔ شاعروں کی نظر اپنے دل کے نہاں خانے تک محدود تھی؛ وہ اس کے باہر کا نہ اندھیرا دیکھ سکتے تھے نہ اجالا۔ بیسویں صدی میں جب شاعری میں انقلاب آیا تو ردعمل کے طور پر شاعروں کو باہر کا اندھیرا ہی نظر آنے لگا اور وہ صرف غم دوراں کے ڈھنڈورچی بنکر رہ گئے۔ ان میں چند شاعروں کو چھوڑ کر اکثروں کے کلام میں بیزاری، تلخی، جھنجلاہٹ اور کلبیت آئی اور شاعری نعرہ پیکار یا ہنگامہ رجز بنکر رہ گئی بعض صرف غم جاناں کے مطرب بنکر رہ گئے۔ وجد کی انفرادیت نے اپنے لئے ایک نیا راستہ منتخب کیا۔ وہ نہ غم دوراں کے ڈھنڈورچی بنے نہ غم جاناں کے مطرب انھوں نے اقبال کی طرح "حسن" و "افادیت" دونوں کو مد نظر رکھا

اس میں شک نہیں کہ وجد کے ساتھی جب رجز خوانی کر رہے تھے وجد ایسے نغمے سنا رہے تھے جو لازوال تھے۔ وجد کا کائناتی شعور دوسرے شعرا کے مقابلے میں زیادہ منجھا ہوا اور ترقی یافتہ تھا۔ وجد نے افادیت کی قربان گاہ پر یا زیادہ صحیح لفظوں میں پروپیگنڈہ کی بارگاہ پر فن کی بھینٹ نہیں دی۔ انھوں نے الفاظ کی نبضوں میں خون جگر دوڑایا۔ ان کی شاعری جذبات کی نہیں خیالات کی شاعری ہے یعنی (Poetry of Ideas) جسکی ضرورت ہر زمانے میں باقی رہتی ہے جو قوم کو صحیح راستہ پر چلاتی ہے۔

وجد اورنگ آباد میں پیدا ہوئے جسکی سرزمین سے ولی اور سراج اٹھے اور جہاں اجنتہ اور ایلورا کے اصنام ایک قدیم ترتمدن کی یاد دلاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی شاعری میں بھی وہی کلاسکیت

اور روحانیت ہے وہی "گمبھیرتا" اور "سندرتا" ہے جو مہاتما بدھ کے مجسمہ میں ہے جسطرح بدھ کے مجسمہ سے ایک سکون اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے، وہی کیفیت وجد کی شاعری طاری کرتی ہے۔ اس میں صرف گھن گرج نہیں نغمگی اور ترنم ہے ان کی شاعری نہ تو جدی خوانی ہے نہ مرثیہ خوانی بلکہ ایسی داستان جو زندگی سے مقابلے اور اسکی تسخیر کے بعد حاصل ہوتی ہے: وہ بھرپور امید و یقین جو بدھ کے ہونٹوں پر تبسم کی شکل میں محفوظ رہ گیا۔

حالات زندگی

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے وجد نے اورنگ آباد کے ایک تعلقہ بیجاپور میں ایک متوسط زمیندار وں کے خاندان میں جنم لیا۔ ابتدائی تعلیم قصبہ کے اسکول میں حاصل کی پھر میٹرکیولیشن کیلئے اورنگ آباد آئے۔ میٹرک کے بعد وہیں کے انٹرمیڈیٹ کالج میں داخلہ لیا۔ اسوقت اس کالج کے پرنسپل بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق تھے ان کی تجربہ کار آنکھوں نے بہت جلد اس جوہر قابل کو پرکھ لیا۔ یہ ان ہی کا فیض تربیت تھا کہ وجد کو اردو ادب بالخصوص شاعری سے غیر معمولی لگاؤ پیدا ہوگیا۔ اور وہ اس زمانے ہی سے نظمیں کہنے لگے۔ اس میں شک نہیں مولوی صاحب نے کئی کتابیں لکھیں لیکن وجد کی ذات میں انھوں نے جس بیش بہا لفظ کو ترتیب دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ان کی ذات میر کی خودداری، حالی کی دردمندی، سرسید کی انسان دوستی اور غالب کی حق پرستی کا بڑا مکمل مجموعہ ہے۔ ابتدائی دور ہی سے وجد کو حسن قبولیت عطا ہوا ان کے عروج کا زینہ اورنگ آباد کا وہ تاریخی یادگار مشاعرہ تھا جو مہاراجہ کشن پرشاد کی صدارت میں منعقد ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا۔ وجد میٹرک کے طالب علم تھے مولوی عبدالحق کالج کے پرنسپل ہونے کے ساتھ ساتھ انجمن ترقی اردو کے معتمد بھی تھے۔ اس مشاعرہ میں انھوں نے دور دور سے مشہور شعرا کو بلایا تھا۔ اس موقع پر وجد کو بھی حصہ لینے کی تاکید کی۔ وجد کم سن تھے پہلے تو وہ بہت جھجکے آخر ہمت کرکے راضی ہوگئے اور اپنی یہ مشہور غزل سنائی۔

روتے روتے آنکھ میں آنسو کی بوند — گوہر تایاب بن کر رہ گئی
اس نظر سے تم نے کیوں دیکھا مجھے؟ — ہر تمنا خواب بن کر رہ گئی
وجد کیا معلوم کیا تھی وہ شئے — جو شراب ناب بن کر رہ گئی

مہاراجہ کشن پرشاد کو یہ غزل بہت پسند آئی پھر وجد کی پاٹ دار آواز اور پڑھنے کا دلکش انداز۔ مہاراجہ اتنے متاثر ہوئے کہ ہر شعر پر ایک ایک اشرفی نکالتے گئے۔ اس ہمت افزائی نے وجد کے حوصلے بلند کر دیئے۔ انٹر کے بعد وہ بی۔اے کیلئے حیدرآباد چلے آئے اور جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لے لیا۔ انھوں نے شاعری کے شوق میں تعلیم کو کبھی خیرباد نہیں کہا۔ باقاعدہ تعلیم حاصل کی مقابلہ کے امتحانوں میں حصہ لیا بالآخر ایچ۔سی۔ایس کیلئے چنے گئے جو کسی نوجوان کیلئے بڑا اعزاز تھا کیونکہ ایچ۔سی۔ایس میں کامیابی عہدہ داری اور ترقی کا پروانہ راہداری تھا۔ عام طور پر اس میں ایسے ہی طلبا کو لیا جاتا تھا۔ جو بارسوخ اور صاحب عزت گھرانوں کے ہوتے تھے۔

وجد کا اس میں انتخاب ان کی غیر معمولی ذہانت کا ثبوت ہے۔ ورنہ اس زمانے کا حیدرآباد اقربا پروری اور جاہ پرستی کے لئے مشہور تھا۔ ایک متوسط کسان گھرانے کے لڑکے کا انتخاب حیدرآباد کی سول سروس کی تاریخ کا نیا واقعہ تھا۔ نتیجتاً وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بنے پھر اسسٹنٹ ججی کے عہدے پر مامور ہیں۔ سول سروس کی ٹریننگ کے دوران میں وجد کو حیدرآباد سے باہر کئی اضلاع پر رہنا پڑا کچھ دنوں لکھنؤ میں انھیں پروفیسر جعفر علی خاں اثر کی بھی معیت میسر ہوئی اثر ان کی شاعری کے بڑے دل دادہ ہیں۔ وہ خود بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر ہیں لیکن وجد کے کلام کو بہت پسند کرتے ہیں اثر کے علاوہ دور حاضر کے اکثر شاعر جیسے علی سردار جعفری ساحر لدھیانوی ڈاکٹر مسعود حسین خاں معین احسن جذبی غلام ربانی۔ تاباں جوش اور جگر وجد کے کمال سخن کے مداح ہیں۔ وجد کی گھریلو زندگی بھی بڑی خوش گوار ہے اس وجہ سے ان کی شاعری میں کسی قسم کا (complex) نظر نہیں آتا۔ وہ جدت اور روایت کا بڑا خوش نما امتزاج ہے۔ اس بھیانک زندگی کو نکھارنے اور سنوارنے کا سامان موجود ہے۔ ارسطو نے شاعری کا کام "نفس کا تزکیہ" ( ) بتایا تھا۔ وجد کی شاعری کا بھی یہی مقصد ہے۔ وہ تخیل کے ذریعے امکانات کی از سر نو تعمیر کرتی اور داخلی طور پر انسان کو بدلنے میں مدد دیتی ہے۔ مثلاً

زندگی جب اجل سے ٹکرائی　　دیر تک روشنی نظر آئی

وجد کی شہرت کی ابتدا ان کے پہلے مجموعہ کلام "لہو ترنگ" سے ہوئی۔

وجد ایک اچھے شاعر ہی نہیں بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ یہ بہت بذلہ سنج اور حاضر

جواب ہیں۔ حاضر جوابی کی اس عادت سے بعض مرتبہ انھیں نقصان بھی برداشت کرنا پڑا۔ انکے استادان کے زمانہ طالب علمی کا ایک قصہ سناتے تھے جو وحید کی زندہ دلی اور حاضر جوابی پر روشنی ڈالتا ہے۔ وحید جسوقت جامعہ عثمانیہ میں زیر تعلیم تھے۔ اس وقت اردو کے ایک اور بڑے ناول نگار اور نقاد عزیز احمد بھی ان کے ساتھی تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق دونوں کو بہت چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق کے گھر پر بیٹھک جمی تھی۔ ان کے یہ دونوں شاگرد بھی وہیں موجود تھے۔ عزیز احمد کو انگریزی ادب پر بھی بڑا عبور حاصل تھا وہ اپنی گفتگو میں ہر بات پر کسی نہ کسی مغربی مصنف کا حوالہ ضرور دیتے ڈاکٹر عبدالحق خاموشی سے سنتے جاتے تھے۔ لیکن وحید سے کہاں چپ رہا جاتا انھوں نے فوراً کہا۔ صاحب یہ تو ہمیشہ دوسروں کی رائے بیان کر رہے ہیں میں تو ان کی ذاتی رائے سننا چاہتا ہوں۔ یہ تو آدمی کیا ہیں" بقول شخصے" ہیں"۔ عزیز احمد صاحب خاموش ہوئے لیکن مولوی صاحب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ اس طرح وحید کی گفتگو بڑی پُر لطف۔ اور پُر معنی ہوتی ہے۔ وحید الفاظ کے جادوگر ہیں وہ الفاظ کو نگینوں کی طرح جوڑتے ہیں ان کی زبان دانی کا اعتراف مولانا آصف علی اور جعفر علی خاں اثر تک کر چکے ہیں۔ جگر نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

آپ کے شعر غیر فانی ہیں
حضرت وحید واہ! کیا کہنا!

یوں تو وحید کی نظمیں بہت مشہور ہیں۔ لیکن ان کی غزلیں اپنے رچاؤ گھلاوٹ اور جذبات کی شیرینی کی وجہ سے خاص مقام رکھتی ہیں اس میں نری داخلیت نہیں۔ خارجیت اور داخلیت دونوں ہیں مثلاً

نکلے جب اپنے گھر سے تو صورت خزاں کی تھی
آئے بہار بن کے تیری انجمن سے ہم

اغیار مہر و ماہ سے آگے نکل گئے
الجھے ہوئے ہیں صبح کی پہلی کرن سے ہم

اور ـــــــ

قفس میں بھی مری خوئے پر افشانی نہیں جاتی
نفس گم ہے مگر فکر غزل خوانی نہیں جاتی

زمانہ ہے کہ محو شست و شو ہے ایک مدت سے
گلیم فقر سے بوئے جہاں بانی نہیں جاتی

مصور حسن روز افزوں سے مثل نقش حیرت ہے
تری تصویر جب بنتی ہے پہچانی نہیں جاتی

مسلسل لٹ رہا ہے کاروان رنگ و بو لیکن
بہار زندگی کی گل بہ دامانی نہیں جاتی

غزل ۲

کیف جو روح پہ طاری ہے تجھے کیا معلوم
عمر آنکھوں میں گزاری ہے تجھے کیا معلوم

نگہِ اول بیباک میرے دل پہ
تیری تصویر اتاری ہے تجھے کیا معلوم

مہر یا قہر ترے چاہنے والے کے لئے
ہر ادا جان سے پیاری ہے تجھے کیا معلوم

وقت کٹتا ہی نہیں صبح مسرت آ جا
رات بیمار پہ بھاری ہے تجھے کیا معلوم

غزل ۳

ہمت کے چراغوں سے روشن ہر راہ گذر ہو جاتی ہے
بڑ عزم نگاہ راہ رواں سامان سفر ہو جاتی ہے

دل رنگ بدلتا ہے پیہم چھٹتا ہے غبار شادی و غم
ہو وصل کی شب یا ہجر کی شب ہر شب کی سحر ہو جاتی ہے

اب تنگ ہے اے ارباب چمن بابہ پیروی آئین کہن
یوں عمر ہزاروں پھولوں کی کانٹوں میں بسر ہو جاتی ہے

اے وجد جہان الفت میں آرام کی صورت کیا ہو گی
دل اور پریشان ہوتا ہے تسکین اگر ہو جاتی ہے

جناب تمکین سرمست صاحب

محشر عابدی

محشر عابدی تعلیم اور پیشہ کے اعتبار کرتے سائنس کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو ادب اور شعر کے دامن سے وابستہ رکھا ہے میں سائنس کو ادب اور شعر کا مخالف نہیں مانتا۔ برخلاف اس کے میرا عقیدہ ہے کہ سائنسی شعور شعر و ادب کا صحیح زاویہ نظر پیدا کرتا ہے۔ لیکن سائنسی درس و تدریس اور تحقیقاتی انہماک تخلیق شعر و ادب میں مانع ضرور ہو سکتا ہے۔

ان کا پورا نام محمد محسن عابدی تخلص محشر ہے ایک عرصہ تک محشر عابدی کے نام سے افسانے لکھتے رہے۔

ان کی تمام تر ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہی ہوئی۔ یہیں سے انٹرمیڈیٹ بی۔ اے۔ ام ایس سی اور آخر میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

محشر سائنس میں جامعہ عثمانیہ کے سب سے پہلے پی۔ ایچ ڈی ہیں۔ حال ہی میں ان کا مجموعہ کلام "غبار کارواں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں نظموں اور غزلوں کے علاوہ سانیٹ بھی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر عابدی نے اردو کی پرانی ہئیت پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ وسیع تر تجربات کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرف انھوں نے اردو کے روایتی لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارے، تمثیل و کنایات اور اشارات سے اپنی شاعری کا آب و رنگ تیار کیا ہے تو دوسری طرف انکے موضوعات میں تنوع ہے ان کے کلام کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ فی الجملہ ایک رومانی شاعر ہیں۔ ان کی عشقیہ شاعری میں لطافت، تازگی اور جوانی کی ابتدائی سرمستیاں ملتی ہیں۔

محشر کی کئی غزلوں میں کافی پرجوش تغزل موجود ہے۔ ان میں جابجا جذبہ اور احساس کی بجلیاں کوندتی نظر آتی ہیں۔ اس کے ساتھ اکثر غزلوں میں کیفیت کی وحدت موجود ہے۔

اگلے صفحہ پر ڈاکٹر محشر عابدی کی دو غزلیں بطور نمونہ درج کی جاتی ہیں۔

غزل

(۱)

تصویرِ دردِ شعلۂ برقِ نہاں ہوں میں
سن لو کتابِ عشق کی اک داستاں ہوں میں

ممنونِ انبساط نہ مرہونِ لطفِ دوست
گویا کہ اس زمین پہ بارِ گراں ہوں میں

تفسیرِ زندگی مری اتنی ہے مختصر
اڑتا ہوا غبارِ رہِ کارواں ہوں میں

رنگِ شباب لوٹ لیا چشمِ یار نے
فصلِ بہار بن کے مثالِ خزاں ہوں میں

محشرؔ مرے کلام میں کیونکر نہ ہو اثر
باغِ سخن کا ایک جواں باغباں ہوں میں

(۲)

اک نورِ مجسم کی ضیا ڈھونڈ رہا ہوں
یا اپنے مقدر کا لکھا ڈھونڈ رہا ہوں

ہستی کو ڈبو کر بھی گل رنگ فنا میں
اک زندگیٔ نو کی بقا ڈھونڈ رہا ہوں

اک جلوۂ ساحر نے تو گھر کا بھی نہ رکھا
کیا جانئے اب دشت میں کیا ڈھونڈ رہا ہوں

آنکھوں سے جو ٹپکے تھے تری یاد میں شب بھر
ان اشکوں کا میں نقشِ وفا ڈھونڈ رہا ہوں

اک گذرے ہوئے قافلۂ عشق کا محشرؔ
اس دہر میں نقشِ کفِ پا ڈھونڈ رہا ہوں

(غزل کے بارے میں)

"غزل کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حد درجے کی دروں بینی پائی جاتی ہے۔ غزل گو جو کچھ کہتا ہے اپنے آپ میں ڈوب کر کہتا ہے۔ اس کا حیات و کائنات کا نقطۂ نظر داخلی ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل کی دنیا کی سیر میں ایسا منہمک ہوتا ہے کہ اسے اوپر نظر اٹھانے اور خارجی عالم کا مشاہدہ کرنے کی فرصت اور ضرورت نہیں رہتی۔ وہ اپنی ذات میں سب کچھ پا لیتا ہے۔"

"لفظ شاعرانہ ہوتے ہیں نہ غیر شاعرانہ۔ شاعر کے جذبے اور تخیل کی قوت انہیں شاعرانہ بنا دیتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض لفظوں میں خلقی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ آسانی سے تخیل کے سانچے میں ڈھل جائیں۔" (اردو غزل از ڈاکٹر یوسف حسین خان)

کنول پرشاد کنول

جناب محمد اکبرالدین صاحب صدیقی
لکچرار اردو سٹی کالج

شہری کالی چرن جی جیسوال سنسکرت اور ہندی کے عالم علم نجوم اور ہندی زبان کے اچھے شاعر تھے۔ چوراہا جنسی حیدرآباد میں رہتے تھے۔ انھیں کے گھر ۱۵ اپریل ۱۹۲۱ء کی صبح ایک کنول کھلا جس کا نام انھوں نے کنول پرشاد رکھا۔ جب کنول سن شعور کو پہنچا تو اپنے بڑے بھائی اندر پرشاد نسیم کے ساتھ شعروسخن کی محفلوں میں شرکت کی اور اپنے ذوق شعر میں اضافہ کرتا گیا۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ فوقانیہ چارمحل (جواب وسطانیہ بن گیا ہے) میں حاصل کی کچھ دن مستعد پورہ ہائی اسکول میں اور کچھ دن سٹی کالج میں زیر تعلیم رہا۔ لیکن میٹرک کی سند بنارس یونیورسٹی سے حاصل کی شعروسخن کے شوق نے حصول تعلیم میں کچھ رکاوٹیں ہی پیدا کیں لیکن کنول مسکراتا ہوا ان رکاوٹوں پر ہمیشہ غالب آتا گیا۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں آنرز اردو کا امتحان پنجاب سے پاس کیا۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں الہ آباد ساہتیہ سمیلن کی ساہتیہ رتن پریکشا میں کامیابی حاصل کی اور سنہ ۱۹۵۱ء میں جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کی ڈگری لی۔ ان تمام بکھیڑوں میں الجھنے اور ان سے نجات پانے کے لئے شاعر نے کیا کیا تکلیفیں برداشت کیں یہ صرف شعرا ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

سات سال کی عمر سے بھائی کی انگلی پکڑ کر مشاعرہ میں شریک ہونے والا کنول دن بدن شعر سے انس پیدا کرتا گیا اور گیارہ سال کی عمر میں ایک مشاعرہ میں اپنی غزل سنائی سنہ ۱۹۳۵ء میں اپنے والد کے سورگباش ہونے پر ایک دردبھری نظم کہی سنہ ۱۹۳۸ء میں فلمکار لاہور میں پہلی اردو غزل اور سنہ ۱۹۳۹ء میں "منور تجن" کلکتہ کے ہندی ماہنامے میں پہلی نظم شائع ہوئی اور اب ہندوستان و پاکستان کا کوئی اردو اور ہندی رسالہ ایسا نہیں جو کنول کی نظم شائع کرتا اپنے لئے فخر کا باعث نہ سمجھتا ہو۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں کنول نے اپنی اردو نظموں کا ایک مختصر مجموعہ "کنول پشیا نجلی" کے نام سے شائع کیا۔ قاضی عبدالغفار مرحوم نے کنول کی نظموں کا انتخاب انجمن ترقی اردو علی گڈھ سے شائع کرنے کے لئے حاصل کیا ایک جزکی

طباعت ہو چکی تھی کہ قاضی صاحب رحلت فرما گئے۔ توقع ہے کہ یہ مجموعہ جلد منظر عام پر آجائیگا۔ ہندی کلام قریب میں "پینکلچ پرکاشن" کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔

خوش قسمتی سے کنول کی شادی بھی ایک ایسی خاتون سے ہوئی ہے جو نہ صرف اردو کی شاعرہ ہیں بلکہ ہندی کی بھی۔ محترمہ شیل بالا نے بنارس یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری لی اور پھر بی' ٹی کیا اور اب حیدرآباد کے ایک اسکول میں معلمہ ہیں۔

ہندوستان کا شاید ہی کوئی ریڈیو اسٹیشن ہو جہاں سے کنول نے غزلخوانی اور نغمہ سرائی نہ کی ہو۔ آواز میں ایسی لچک ایسا درد اور سوز ہے کہ محفل پر چھا جاتے ہیں اور دیرپا تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ پاکستان میں بھی ایک مشاعرہ میں مدعو رہے ہیں اور نوجوان ہونے کے باوجود کئی مشاعروں کی صدارت کی ہے۔ جہاں کنول مجسم شعر ہے وہاں مجسم اخلاق و مروت بھی اور اس کی ہر دلعزیزی کا ایک راز یہ بھی ہے۔

کنول نے اپنی عملی زندگی اہلکاری جیسے خشک پیشے سے شروع کی اور اب محکمہ اطلاعات میں شعبہ اُردو و ہندی کے مددگار ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

کنول کی تین غزلیں بطور نمونہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

غزل

(۱)

کس نے دیکھا پلٹ کر مجھے پیار سے، زخم دل کا ہر اک مسکرانے لگا
کسکی نظروں نے چھیڑا مرا سازِ دل درد بھی جھوم کر گنگنانے لگا
کس کے پائل کی رُن جھُن پڑی کان میں، گھل گیا مدھرے گیت کی تان میں
رنگ خوابوں سے کسکے چُرا کر نئے، شوق پھر اپنی محفل سجانے لگا
کس کے ماتھے سے پھوٹی کرن نور کی، بات چھیڑی ہوئی شعلۂ طور کی
جل اُٹھے کسکے جلوے سے بن کے دیئے، ذرہ ذرہ مرا جگمگانے لگا
اُسکے لب پر تبسم کی چٹکی کلی، موجِ مستی کی لہرا کے ہر سو چلی

جام اس کا جو آنکھوں سے چھلکا اُدھر، ایک عالم اِدھر ڈگمگانے لگا

ہم جو دیر و حرم میں بھٹکتے رہے، پھول بھی خار بن کر کھٹکتے رہے
گُل کی چاہت میں منزل وہ آئی کہ اب ہم کو کانٹوں پہ بھی پیار آنے لگا

(۲)

جس میں کانٹوں پہ بھی نکھار نہیں — وہ خزاں ہو تو ہو بہار نہیں
کوئی دیکھے یہ رنگ شامِ بہار — پی رہا ہوں مگر خمار نہیں
بوئے گل یہ کہاں سے آئی ہے — دل کو پل بھر مرے قرار نہیں
ان نگاہوں کی تیرگی مت پوچھ — جن میں سلگے کبھی شرار نہیں
اتنے دھوکے دیئے بہاروں نے — دل میں اب حسرتِ بہار نہیں
اِن کی نظروں سے ہر کلی کو بچا — ان بہاروں کا اعتبار نہیں
آج ہی حالِ دل سنانا تھا — آج ہی دل پہ اختیار نہیں
انتہائے نظامِ زر داری — عشق کو حسن سے بھی پیار نہیں
مسلکِ عشق حفظِ حسنِ جہاں — منزلِ عشق کوئے یار نہیں

(۳)

چار جب تجھ سے ساقی نظر ہو گئی — موت بھی زیست کی ہم سفر ہو گئی
ان کی نظریں پھریں شامِ غم چھا گئی — ان سے نظریں ملیں اور سحر ہو گئی
ان کی آنکھوں میں تھا بند رازِ سحر — ان کی پلکیں کھلیں اور سحر ہو گئی
حسن جب سے ہوا مائلِ زرگری — آبروئے عشق کی در بدر ہو گئی
راہبر ہوش میں بھی بھٹکتے رہے — اپنی دیوانگی راہبر ہو گئی
جیسے جیسے ستاروں کا ٹیکا لیے — رات کی زندگی مختصر ہو گئی
اک تبسم کا جاں بخش سایہ کنول
زیست اس آسرے میں بسر ہو گئی

شاذ تمکنت

جناب مغنی تبسم صاحب
لکچرار اردو کالج

آج سے غالباً پانچ سال پہلے کی بات ہے، میں اس وقت ام۔اے کر چکا تھا۔ اور اکوٹنٹ جنرل آفس کی دقیانوسی عمارت کے ایک گوشے میں فائیلوں اور برآوردوں کے انبار تلے دبا اپنی قسمت کو کوسا کرتا تھا۔ شعر و سخن سے رہا سہا تعلق بھی ٹوٹنے کے قریب تھا۔ بالآخر جینے اور کچھ کرنے کی اُمنگ نے سہارا دیا۔ قمر ساحری، عاتق شاہ اور سرور ڈنڈا کے تعاون سے ایک دو ماہی رسالہ "شعور" جاری کیا۔ انھیں دنوں کسی مقامی ہفتہ وار میں ایک نظم میری نظروں سے گذری اور میں چونک سا گیا۔ شاعر کا نام شاذ تمکنت تھا۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ یہ کوئی فرضی نام ہے۔ پھر بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ اس میں تخلص کونسا لفظ ہے۔ اور جب مقطعے نظر سے گذرے جن سے یہ عقدہ تو کھل گیا کہ تخلص شاذ ہے لیکن ابھی یہ نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ "تمکنت" اسم خاص کی کونسی قسم ہے؟ بہر حال مجھے شاعر سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ بعض احباب سے سنا تھا کہ وہ ایک کم عمر، نومشق شاعر ہیں لیکن دماغ اس قدر خراب ہے کہ اپنے سوا کسی کو شاعر نہیں مانتے۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ "اسٹار نیوز پیپر ایجنسی" کے سامنے والے فٹ پاتھ پر (جو ان دنوں حیدر آباد کے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی بیٹھک تو نہیں البتہ گھنٹوں ایستادہ رہنے کی مرکزی جگہ تھی) میرا تعارف شاذ تمکنت سے ہوا۔ ایک پستہ قامت کھلے رنگ اور فراخ پیشانی والا نوجوان میرے سامنے تھا۔ جس کے سر کے بال گردن تک بڑھے ہوئے۔ لبوں پر پان کا لاکھا سا جما ہوا تھا۔ شاذ نے خود بیان کیا کہ وہ سٹی کالج میں میرے چھوٹے بھائی کے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔ یہ جان کر بزرگانہ انداز اختیار کر لینا ایک فطری بات تھی لیکن میں اسے زیادہ دنوں تک نہیں نباہ سکا۔

پھر شاذ تمکنت کو دو ایک بار مشاعروں میں میں نے سنا۔ لمبی نظم اگر مشاعرے میں پڑھی جائے تو سننے والا صرف اچھے مصرعوں پر داد دیتا ہے۔ نظم کو سمجھنے اور اس کے پورے تاثر کو قبول کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ابتداء میں میں بھی دوسروں کی اس رائے سے متاثر رہا کہ شاذ کو فارسی آمیز ترکیبیں باندھنے اور دور از کار تشبیہیں استعمال کرنے کا خبط ہے۔ مصرعے حسین اور ترشے ہوئے لفظوں اور ترکیبوں کا مجموعہ ہوتے ہیں جن میں مفہوم اور معنی کا کوسوں پتہ نہیں چلتا۔ ایک روز میں نے شاذ کی ایک نظم کا

لیغور مطالعہ کیا جو غالباً "شعور" میں چھپنے کے لئے انھوں نے مجھے دی تھی۔ نظم مجموعی حیثیت سے عجیب تھی۔ مجھے خوشی زیادہ اس بات سے ہوئی کہ شاعر نے نظم کی ہیئت کو پورے آداب کے ساتھ برتا تھا۔ اگرچہ بادی النظر میں مرکزی خیال گروہ تشبیہات میں الجھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

شاذ کو زیادہ قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع مجھے اس وقت ملا جب میں پچھلے سال سیف آباد سائنس کالج میں اردو پڑھایا کرتا تھا۔ اتفاق سے شاذ تمکنت کو بھی اس کالج کے آفس میں دو مہینے کی منصرمی مل گئی تھی۔ تقریباً ہر روز ڈیڑھ دو گھنٹے شاذ کی صحبت میں گذرتے۔ میں نے محسوس کیا کہ شاذ حد درجہ منکسر المزاج اور فراخ دل انسان ہیں وہ بڑی خندہ پیشانی سے اپنی کوتاہیوں کو ماننے اور دوسروں کی خوبیوں کو کسی قدر مبالغہ آمیزی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یہ وصف مجھے نوجوان نسل کے بہت کم شاعروں میں نظر آیا۔ اکثر باتوں میں ہم ایک دوسرے کے ہم خیال تھے۔ ہماری پسند کے شاعروں میں میر، مصحفی، آتش، فراق، یگانہ، اخترالایمان، جمیل مظہری اور عالی وغیرہ کے نام مشترک ہیں اختلاف ہے تو اس قدر کہ وہ جوش اور جگر کو بھی بے حد پسند کرتے ہیں جبکہ میرے پسندیدہ شاعروں میں فانی اور میراجی بھی شامل ہیں اس فہرست سے شاذ کی افتاد طبع کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نئی نسل کے شاعروں میں بہت کم اپنی آواز میں انفرادیت پیدا کر سکے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنی جلدی شاذ نے اپنا لب و لہجہ متعین کر لیا۔ یہ لب و لہجہ فراق، جوش، اخترالایمان اور جمیل مظہری کے طرزِ فکر اور اندازِ بیان کی بہت سی اچھی خصوصیتوں کے امتزاج سے بنا ہے۔ جو چیز شاذ کو اپنی عمر کے دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا خلوصِ فن ہے۔ لب و لہجہ کی گھلاوٹ اور نشتریت، انوکھے استعاروں اور کیفیاتی تشبیہوں کا استعمال، رومانیت پسندی، محبوب کا دلنواز تصور، عشق کی پاکیزگی یہ ان کی شاعری کے چند نمایاں اوصاف ہیں۔ شاذ کی شاعری میں ان کی شخصیت کا بھرپور اظہار ملتا ہے وہ شاعر کی شرافتِ نفس، سلجھے ہوئے جمالیاتی ذوق اور وارفتگیٔ مزاج کی غمازی کرتی ہے۔

شاذ نے اپنی شاعری کا آغاز نظم سے کیا اور نظم نگار شاعر ہی کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں لیکن ادھر انھوں نے چند اچھی غزلیں کہہ کر ثابت کر دکھایا ہے کہ وہ اس صنف پر بھی پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں بھی غزل کے اشعار کی طرح ان کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے اور ان میں وہی داخلی رچاؤ ملتا ہے جو صنفِ غزل کا لوازمہ ہے۔ اس لئے میری رائے میں اگر وہ نظموں کے

ساتھ ساتھ غزلیں بھی کہتے ہیں تو اس صنف کے امکانات کو روشن کرسکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے غزل کی صنف میں آج جو تازگی ملتی ہے وہ ان نظم گو شاعروں کی دین ہے جنھوں نے اس میں اظہار وابلاغ کے نئے تجربے کئے اور اسے اپنے داخلی جذبات اور احساسات سے نکھار کر اس میں وسعت اور گہرائی پیدا کی ورنہ بہت سے نام نہاد شاعر آج تک روایتی غزل گوئی کے دلدل میں پھنسے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ شاذ تمکنت، غزل میں پرانی لکیر کو پیٹ کر خوش نہیں ہو لیتے وہ ان اچھوتے احساسات اور کیفیات کو لفظوں کی گرفت میں لانے کی کوشش کرتے ہیں جو خاص لمحوں میں ذہن کے ارد گرد منڈلانے لگتی ہیں اور جن کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ ان کا تخیل فلا کی لامحدود وسعتوں میں پرواز کرسکتا ہے۔ ان کی شاعری میں استعاروں اور تشبیہوں کی ایک الگ دنیا آباد ہے۔ یہ فضا اور ماحول کہیں اور نہیں مل سکتا، ان کے پاس کہنے کے لئے بہت سی نئی باتیں ہیں جن کے اظہار کے لئے وہ اپنی الگ زبان بنانے پر مجبور رہیں۔

یہ بات کیا کم قابل رشک ہے کہ اتنی کم مدت میں شاذ نے اپنے پڑھنے والوں، ہم عصر شاعروں اور نقادوں میں ایسی مقبولیت حاصل کرلی کہ آج ہندوستان اور پاکستان کا بڑے سے بڑا رسالہ ان کے کلام کو شائع کرنا فخر سمجھتا ہے۔ شاید اسی بات سے متاثر ہو کر خلیل الرحمن اعظمی نے کہا ہے ؎

عزیز دوست تمہیں کچھ خبر نہیں شاید\
کہاں کہاں نہیں پہنچا تمہارا جادوئے فن\
تمہارے نغموں سے گھائل ہے دہلی و لاہور\
رواں ہے وادیٔ کشمیر تک یہ جوئے سخن\
یہ ہند و پاک تمہارے ہیں تم سبھی کے ہو\
تمہارا دیس بھی ہے یہ سواد گنگ وجمن

اختر شیرانی کی شاعری جب بام عروج پر تھی تو لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ اردو نے بھی ایک شیلی پیدا کیا ہے لیکن وہ اپنے پڑھنے والوں کی توقعات کو پورا نہ کرسکے۔ کبھی شاذ کے تعلق سے نہ جانے کیوں مجھے ایسا ہی اندیشہ ہونے لگتا ہے، مگر مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اس کا انحصار خارجی حالات اور بڑی حد تک خود شاعر کے حوصلہ پر ہے کہ وہ میری اور مجھ ایسے دوسرے پڑھنے والوں کی توقعات کو پورا کر دکھائے۔

شادؔ کی غزلوں کا نمونہ درج ذیل ہے۔

(۱)

صبح کیوں اتنی بھلی ہے؟ مجھے معلوم نہ تھا ۔ عمر کی رات کٹی ہے، مجھے معلوم نہ تھا
خبرِ شبنم و گل کب تھی جنوں سے پہلے؟ ۔ کون کس درجہ دکھی ہے؟ مجھے معلوم نہ تھا
دشتِ تاریک ہے جگنو کا دیا لرزاں ہے ۔ میری تقدیر یہی ہے، مجھے معلوم نہ تھا
میں گلہ سنج تھا غمخوار کی خاموشی کا ۔ کیسی افتاد پڑی ہے! مجھے معلوم نہ تھا
مدتوں بعد تری لوحِ جبیں دیکھی ہے ۔ کیسی تحریر مٹی ہے! مجھے معلوم نہ تھا
سایۂ گل میں بھی کروٹ نہ بدلنے کا سبب ۔ رنجِ بے بال و پری ہے، مجھے معلوم نہ تھا
لوگ کہتے ہیں کہ یہ نقدِ ہنر نام خدا! ۔ مجھکو قسمت سے ملی ہے، مجھے معلوم نہ تھا
ہائے! یہ تلخیٔ صہبائے ضمیر و احساس ۔ میری رگ رگ سے کھنچی ہے، مجھے معلوم نہ تھا

تار تار آج وہ سوغاتِ چمن لایا تھا
دامنِ شادؔ پھٹی ہے مجھے معلوم نہ تھا

(۲)

حیاتِ نو بہ نو کے ساتھ غم ملے نئے نئے ۔ ہماری صبح و شام کے ہیں سلسلے نئے نئے
شکستہ پا کی شرم رکھ لے اے غبارِ کارواں ۔ کہیں اسے نہ دیکھ پائیں قافلے نئے نئے
جبینِ سجدہ جستجوئے قرب تر میں مٹ گئی ۔ سراغ تیرے نقشِ پا کے یوں ملے نئے نئے
ترا کرم کہ زندگی اداس ہو کے رہ گئی ۔ ہیں ورنہ شادمانیوں کے سلسلے نئے نئے
تمہیں خبر نہیں ہوئی چمن سے تم چلے گئے ۔ بسی بہارِ آرزو بھی گل کھلے نئے نئے
نفس نفس میں نشترِ فراق ٹوٹتے گئے ۔ قدم قدم پہ غمگسار بھی ملے نئے نئے

اٹھا تو آہ! کب اٹھا تھا حشر باز دید بھی ما
دہانِ زخمِ دل تھے شادؔ! جیسے سلے نئے نئے

علی احمد جلیلی

نام علی احمد جلیلی۔ حافظ جلیل حسن (نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل) کے صاحبزادے ہیں۔ سنہ پیدائش ۲۲ جون ۱۹۱۵ء ہے مقام پیدائش حیدرآباد اور آبائی وطن لکھنؤ ہے شاعری آپ کو ورثہ میں ملی۔ شاعرانہ ماحول میں بچپن گزرا۔ فن شاعری اور عروض کی تعلیم جلیل ہی کے فیض کی مرہون منت ہے۔

آپ نے ۱۹۴۹ء میں اُردو ادب میں ام۔ اے کیا۔ پھر بی ایڈ کامیاب کیا۔ سررشتہ تعلیمات میں کام کر رہے ہیں۔ شاعری کا آغاز بچپن ہی سے ہوا۔ غزل سے مشق سخن شروع ہوئی۔ غزل کا پہلا شعر جو آپ نے موزوں کیا اور جو آپ کی قدیم بیاض میں درج ہے یہ تھا ؎

تری یاد آ کے خیال ہلاتی رہی — تمنا مری رنگ لاتی رہی

طالب علمی کے زمانے میں سب سے پہلی غزل آپ نے دارالعلوم ہائی اسکول کے مشاعرہ میں سنائی جو فانی بدایونی کی صدارت میں ہوا تھا۔ جب بی۔ اے میں تعلیم پا رہے تھے آپ نے "بتخانۂ خلیل" کے عنوان سے ایک گمنام مثنوی پر مقالہ لکھا۔ یہ "ادبی دنیا" لاہور میں شائع ہوا۔ اور پہلے انعام کا مستحق قرار پایا۔ انہیں دنوں بزم اردو جامعہ کی جانب سے نواب معظم جاہ بہادر شجیع کی صدارت میں مشاعرہ ترتیب دیا گیا تو صدر مشاعرہ کی جانب سے آپ کی نظم "افق کے پار" کو انعام ملا۔

کالج کی تعلیم ختم کرنے کے بعد اب تک نظم و غزل میں جو کچھ لکھا وہ زیادہ تر ادبی ماہناموں میں شائع کیا۔ حسن عسکری صاحب نے جب ایک کتاب "میری بہترین نظم" ترتیب دی تو اس میں آپ کی نظم "بنارس کی صبح" شامل کی میراجی نظم آزاد کے بانی تو نہ تھے لیکن علمبردار ضرور تھے۔ انہوں نے اس نئی تحریک کو نظم میں استعمال کرنے کیلئے آپ کو بھی لکھا اور آپ نے کئی آزاد نظمیں لکھیں جو "ادبی دنیا" میں چھپیں۔

آپ کی شاعری کی ابتداء تو غزل سے ہوئی لیکن بعد میں جوش و اقبال کی تقلید میں نظمیں ہی موضوع شاعری بن گئیں۔ ان نظموں کو آپ نے "رباب" کے نام سے ترتیب دیا۔ اس مجموعے کے تعارفی دیباچہ میں قاضی عبدالغفار صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں :-

علی احمد صاحب نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل کے صاحبزادے ہیں اس لئے وراثتاً بھی مذاق سخن میں انکا حصہ مسلم ہے . . . . قدیم شاعری کے جوہر سے مستفید ہو کر جدید شاعری کے میدان میں قدم اٹھایا ہے . . . . . وہ ادب برائے زندگی کے تصورات کو اس حد تک تو نہیں پہنچے ہیں اور شاید پہنچنا بھی نہیں چاہتے جہاں شاعری رجعت پسندوں اور قدامت پرستوں کے مقابلہ میں جارحانہ انداز اختیار کر لیتی ہے . لیکن انہوں نے خیال اور بیان کی قدامت و فرسودگی سے اپنے ذوقِ سخن کو بلا شبہ آزاد کرا لیا ہے ."

لیکن نظم کا طوفان جس تندی سے اردو شاعری میں اٹھا تھا اسی تیزی سے اس پر جمود بھی طاری ہوا . غزل کا نشاۃ ثانیہ ہوا اور اس دور کی غزلوں کا عام آہنگ بہت کچھ بدل گیا . اب غزلوں کا دامن زیادہ وسیع تھا . ان میں "غمِ جاناں" کے ساتھ "غمِ دوراں" بھی سمو دیا گیا تھا . اسے آپ کی شاعری کا بھی دوسرا دور سمجھئے . اس وقت سے آپ زیادہ تر غزلیں ہی لکھتے ہیں جسکے متعلق ہمارا خیال ہے کہ یہ داستان کائنات میں سب سے پرانی ہونیکے باوجود جدید ترین ہے .

علی احمد جلیلی کی دو غزلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں :-

غزل

(۱)

ہم لاکھ چھپائیں درد مگر دنیا کو خبر ہو جاتی ہے
خاموش جو لب ہو رہتے ہیں تو چشم دل نظر ہو جاتی ہے

اک ہم ہیں کہ اپنے گلشن سے بیدردِ خزاں ملتی ہی نہیں
اک وہ ہیں کہ جنکی شام و سحر پھولوں میں بسر ہو جاتی ہے

تدبیر کے چھینٹے کیا دیکھے تقدیر میں جلنا لکھا ہے
جب اپنا نشیمن بنتا ہے بجلی کو خبر ہو جاتی ہے

تب زیست سے کھیلا کرتے تھے اب موت سے جی بہلاتے ہیں
دنیسے بھی بسر ہو جاتی تھی ایسے بھی گزر ہو جاتی ہے

وہ شعلہ نہیں وہ برق نہیں لیکن جو مقابل ہوتا ہے
دل جل کے دھواں بنتا ہے بیکار نظر ہو جاتی ہے

ظلمت میں کھلیں آنکھیں جنکی وہ نور کا مطلب کیا جانے
ہم نے تو وہ شب دیکھی ہی نہیں جس شب کی سحر ہو جاتی ہے

کیا کہئے علی اپنے دل میں میں کیا کیا سوچا کرتا ہوں
مائل بہ کرم جس روز کوئی دزدیدہ نظر ہو جاتی ہے

(۲)

لگائے ہونٹوں سے اشکوں کے جام گزری ہے
بڑے مزے سے غریبوں کی شام گزری ہے

قسم ہے آپکی اُس زلف کی جو نذر ہوئی
تمام رات بدقّت تمام گزری ہے

جہاں جہاں ترے نقشِ قدم نظر آئے
وہاں حیات بہت تیز گام گزری ہے

اُسی کی یاد میں جیتے ہیں آشیاں والے
وہ زندگی جو کبھی زیرِ دام گزری ہے

جہاں لٹائے گئے جام خُم بہائے گئے
مرے نصیب! وہیں تشنہ کام گزری ہے

خدا کا نام کبھی لے لیا تھا گھبرا کر
وہی بس ایک گھڑی نیکنام گزری ہے

گزار دیتے ہیں کیونکر گزارنے والے
علیؔ کی صبح کٹی ہے، نہ شام گزری ہے

(غزل کے بارے میں)

غزل رموز و مطالب کی باز آفرینی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اُردو شاعری زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ نہ لے اور انہیں اپنے اندر سمونے کی کوشش نہ کرے۔ تغیّر جس طرح عالم کی شان ہے اسی طرح زندگی کی بھی شان ہے جسے جاننا اور ماننا چاہیئے۔ جذبے اور تخیل کی طلسمی دنیا میں بھی نت نئے محرک پیدا ہوتے ہیں جن سے جمالیاتی قدریں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں جذبے کی طرح تصور بھی کچھ دنوں بعد عام ہو جاتے ہیں۔ وہ تصور یا خیال جو آج نیا معلوم ہوتا ہے کل اس میں تازگی باقی نہیں رہتی اسلئے ہر پیڑھی کا ادب نے غیر مطمئن نظر آتی ہے جو اس سے پہلی کی پیڑھی اس لئے غیر مطمئن نظر آتی ہے جو اس سے پہلے کی پیڑھی کے فنکاروں کی تخلیق تھا۔ وہ خود دنیا ادب تخلیق کرنا چاہتی ہے اور وہ اپنی اس خواہش میں بالکل حق بجانب ہوتی ہے۔

"غزل میں دیدہ و دانستہ محبوب کے جنس کو ظاہر نہیں کرتے اسلئے کہ رمز و ایما کا یہی اقتضا ہے۔ جب کبھی اسکا ذکر آتا ہے تو مذکر صفات و افعال استعمال کئے جاتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ بات غیر فطری ہے لیکن جو شخص روحِ غزل کا راز داں ہے اس کے نزدیک اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ غزل کی رمز نگاری کا اقتضا ہونا چاہیئے تھا کہ جس طرح حقیقت و مجاز کے فرق و امتیاز کو مبہم چھوڑ دیا گیا کہ ذوق خود اس کا فیصلہ کرے۔ اسی طرح معشوق کے جنس کو بھی ابہام کے نقاب میں لپیٹ دیا۔" (اردو غزل صفحہ نمبر ۸ از ڈاکٹر یوسف حسین خان)

رائے منوہر لال شارب

جناب خواجہ حمید الدین صاحب شاہد
لکچرار اردو چادر گھاٹ کالج

رائے منوہر لال شارب حیدرآباد کے کالیستھ خاندان کے ایک لائق سپوت ہیں قدیم روایات کے مطابق اردو فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور اس کے بعد دسرم ونت ہائی اسکول اور مدرسہ فوقانیہ دارالعلوم میں تعلیم پائی۔ اس وقت ان کی عمر (۳۸) سال ہو گئی محکمہ زراعت میں ملازم ہیں۔ شاعری کا فطری ذوق ہے۔ غزل، نظم اور رباعی ان کی پسندیدہ اصناف سخن ہیں۔ ان کے کلام میں سوز وگداز کے ساتھ ساتھ مسائل زندگی کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ انسان اور غم انسان سے پیار ان کی شاعری کا نصب العین ہے۔

حیدرآباد کے نوجوان شاعروں میں ان کا خاص مقام ہے۔ شعر ترنم سے پڑھتے ہیں اور حیدرآباد کی کوئی ایسی محفل شعر وسخن نہیں ہوتی جس میں شارب شریک نہ ہوتے ہوں۔ اردو کے معیاری رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوتا ہے۔ وہ ایک نہایت ہی شریف النفس، وسیع الخیال اور سنجیدہ نوجوان ہیں۔ تعصب اور تنگ نظری سے انھیں نفرت ہے اور وہ حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ ہیں جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے۔ اپنے تخلص کی رعایت سے شارب غزل کے مقطع میں مئے ومینا، جام وسبو اور ساقی ومیخانہ کا ذکر ضروری خیال کرتے ہیں۔

شارب کی تین غزلیں بطور نمونہ پیش کیجاتی ہیں :-

(۱)

اسی سے عام ہوا غم مرا زمانے میں
جو اک تکلف پنہاں تھا مسکرانے میں

یہ میری فطرت آزاد کا کرشمہ ہے
قفس میں رہ کے بھی رہتا ہوں آشیانے میں

کم از کم اتنا تو ہو جائے انقلاب حیات
کوئی جھجک نہ کسی کو ہو مسکرانے میں

میری زبان کو سب اپنی زباں کہتے ہیں
فسانہ سب کا ہے شامل مرے فسانے میں

بہار جھوم کے آئی حیات جاگ اٹھی
کچھ اس ادا سے وہ آئے غریب خانے میں

وہ ایک بات جسے جان داستاں کہئے
اسی کو بھول گئے حال دل سنانے میں

اسی سے لوگ گماں کر رہے ہیں الفت کا
اک احتیاط جو ہے ان کے مسکرانے میں

یہ بندگی نہیں توہینِ بندگی ہے شیخ
غرورِ سجدہ جو شامل ہے سر جھکانے میں

نہ پا کے منزلِ دیر و حرم میں شارب کو
حیات ڈھونڈنے آئی شراب خانے میں

(۲)

خامشی گفتگو ہو گئی
آرزو — آرزو ہو گئی

مر کے ہم جاوداں ہو گئے
موت بے آبرو ہو گئی

اللہ اللہ اک مشتِ خاک
عالمِ رنگ و بو ہو گئی

آپ کا سامنا ہو گیا
زندگی رو برو ہو گئی

عشق کی شمع روشن ہوئی
روشنی چار سو ہو گئی

گل نے کیا جانے کیا کہہ دیا
ہر کلی لالہ رو ہو گئی

پردہ داریٔ حسن و جمال
عشق کی جستجو ہو گئی

بے وفائی کا شکوہ ہی کیا
جب وفا اپنی خو ہو گئی

اشکِ پیہم کے قربان جائیں
زندگی باوضو ہو گئی

زیست شارب بفیضِ الم
وقفِ جام و سبو ہو گئی

(۳)

مری حیات میں کوئی سکوں کی بات نہیں
مگر میں اس پہ بھی آزردۂ حیات نہیں

یہ رات بڑھ کے قیامت کی رات ہو بھی تو کیا
جو ختم ہی نہ ہو ایسی تو کوئی رات نہیں

ابھی دلوں میں ہیں اندیشہ ہائے دور و دراز
ابھی حیات باندازۂ حیات نہیں

بڑا کمال ہے مر مر کے بھی جیئے جانا
طریقِ عشق میں مرنا تو کوئی بات نہیں

جمالِ عظمتِ انساں ہے میری نظروں میں
بساطِ دیر و حرم میری کائنات نہیں

نہیں ہے اس میں اگر خونِ دل کی آمیزش
وہ کوئی اور ہی غم ہے غمِ حیات نہیں

مغنی تبسم

جناب شاذ تمکنت صاحب

عمر ستائیس سال، تعلیم ام۔اے (عثمانیہ) پیشہ لکچرار اُردو، وطن حیدرآباد (آندھرا پردیش)۔

تصنیف و تالیف: ۱۔ نوائے تلخ (ابتدائی مجموعۂ کلام) ۱۹۴۷ء

۲۔ کہانی اور اس کا فن (ترجمہ)

۳۔ تلگو ادب کی تاریخ پر ایک نظر

} ۱۹۵۵ء

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب میری شاعری میرے گھر کی چار دیواری کی حد تک محدود تھی ــــــ دار العلوم کالج میں مشاعرہ تھا۔ علی اختر مرحوم اور پروفیسر سرور بھی مدعو تھے۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ میں بھی سامعین میں بیٹھا، بقدرِ ذوق تعریف اور ہوٹنگ میں مشغول تھا۔ اچانک ایک شاعر کے نام کا اعلان ہوا۔ اور شاعر نے مائک پر طلوع ہو کر نظم شروع کی (اب یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ شاعر مغنی تبسم تھا) سنہرے بال، آنکھوں پر خوبصورت چشمہ، خوب رو اور خوش گو" یہ وہ تاثرات تھے جو میں نے اس مشاعرے سے حاصل کئے مجھے اب یاد نہیں کہ مغنی صاحب نے اُس مشاعرہ میں کون سی نظم پڑھی تھی؟ اتنا ضرور یاد ہے کہ نظم سُن کر میں نے انھیں اپنے قبیلے کے شاعروں میں شامل کر لیا تھا۔

مغنی صاحب سے میری ملاقات کب ہوئی اور کہاں ہوئی؟ مجھے یاد نہیں پڑتا یہ کوئی ۱۹۵۳ء کی بات ہو گی جب میں حیدرآباد کی ادبی فضا کے لئے نو وارد تھا ہر نو وارد کے ساتھ "پیرانِ تسمہ پا" کا جو سلوک رہتا ہے اسکا اندازہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ ادب کے "سندباد" نہ بن جائیں۔ چاروں طرف میری نئی نئی آواز پھیل رہی تھی، چند بزرگانِ ادب (جن کی بے ادبی پر آج ہنسی آتی ہے) اس آواز پر جھلا رہے تھے کچھ ادب دوست ایسے بھی تھے جو اس آواز کے پردے چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں خیر خواہانِ ادب میں مغنی صاحب بھی شامل تھے جنھیں شائد میری آواز میں سُر اور سرگم کی آہٹیں محسوس ہوتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے مجھے "عوامی ادبی سوسائٹی" کے ایک جلسہ میں مدعو کیا اور میری ایک نظم کو سال کی بہترین نظم قرار دیتے ہوئے کتابوں کا ایک سیٹ پیش کیا جو یقیناً اُس وقت جبکہ مجھ پر تنقیص کا نزول ہو رہا تھا کسی نوبل پرائز سے کم نہ تھا۔

ایک وقت وہ آیا جب مغنی صاحب کالج میں میرے اُستاد کی حیثیت سے نمودار ہوئے میں نے اپنی ادھوری تعلیم کی تکمیل کے لئے ایوننگ کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں مغنی صاحب اُردو کے اُستاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے میں یہ نہیں جانتا کہ مغنی صاحب بحیثیت اُستاد کس درجہ کامیاب ہیں، لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ مغنی صاحب اپنے مزاج کی سادگی یا کم کم کھلنے کے باعث طلباء میں صد درجہ مقبول ہیں۔ میں چونکہ کلاس سے اکثر غائب رہا کرتا تھا۔ اس لئے ان کے طریقۂ تدریس کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ انھوں نے مجھے من مانی حاضریاں دیں اور اُستاد کی بجائے دوست کا سا سلوک کیا۔

مغنی صاحب کی شخصیت پر لکھنے کا یہ موقع نہیں، میں نے یہ دل کی لگی کسی اور وقت کیلئے اٹھا رکھی ہے، اب میں اپنے موضوع کی طرف آتا ہوں، مجھے ان چند سطروں میں مغنی صاحب کے فن پر بات کرنی ہے۔

مغنی صاحب اپنے دل و دماغ کی ساخت کے اعتبار سے میراجی اور اخترالایمان سے زیادہ قریب ہیں۔ میراجی یا اخترالایمان سے متاثر ہونا یا ان کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش، بجائے خود گھاٹے کا سودا قبول کرنے کے برابر ہے۔ حلقہ "اربابِ ذوق" کے یہ شاعر اپنی حسیاتی طبیعت کے باعث خاصے پہلو دار ہیں یہ شاعر محفل میں نہیں کھلتے ان کے جوہر خلوت میں کھلتے ہیں جہاں حواسِ خمسہ کے علاوہ چھٹی حس بھی اپنا جادو جگاتی ہے۔ ان خلوتیانِ راز سے متاثر ہو کر مغنی صاحب نے جہاں اپنے فن میں معبدوں کا سا سکوت اور ڈوبتے تاروں کا سا کرب سمو لیا ہے وہیں انھیں مشاعروں کی ہاؤ ہو اور مجلسی آداب کے شعراء کا ساتھ چھوڑنا پڑا ہے، میری رائے میں ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ مغنی صاحب اپنی افتادِ طبع کے باعث کھل کھیل بھی نہیں سکتے۔ ان کا یہی عیب میری نظر میں ہنر بھی ہے۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے نظم گو شاعر ہیں۔ کبھی کبھار منہ کا مزہ بدلنے کے لئے غزل بھی کہہ لیتے ہیں۔ سو اب آپ کی خدمت میں ان کی یہ غزلیں حاضر ہیں۔

غزل

(۱)

کیسی وحشت؟ کیسا صحرا! دل بھی کیا دیوانہ ہے
پاگل کون نہیں دنیا میں، دنیا پاگل خانہ ہے

جگ سارا ہے حسن تصور، جینا ایک بہانہ ہے
اس کی یاد ہے جب تک دل میں سانس کا آنا جانا ہے

تجھ سے ملنے کی گھڑیوں کو ہم نے بس اتنا جانا ہے
بیتے دنوں کی یاد ہے کوئی، خواب ہے یا افسانہ ہے

میخانے میں دنیا کے اک اپنا الگ میخانہ ہے
ہم ہیں محوِ چشمِ کرم اور گردش میں پیمانہ ہے

اصل حقیقت پنہاں ہے مشہور جو ہے افسانہ ہے
اس کی چشمِ ناز ہے وہ بھی جس کا نام زمانہ ہے

اس کے تصور کی خوشبو سے مہک اٹھا ہے جیسے چمن
یادوں سے آباد سراسر دل بھی کیا ویرانہ ہے

آہ نہیں ہے شبنم آسا حسن پہ رونے والا کوئی
کم کم کھلنا کلی کلی سا اس کو بھی مرجھانا ہے

عشق فقط ہے حسن بیاں، اسلوب ہے کہنے والے کا
حسن ہے قصہ در قصہ، افسانوں کا افسانہ ہے

تجھ سے ملی ہیں جب سے نظریں کیا ہے دل معلوم نہیں
اجڑی ہوئی اک بستی ہے یا بستا ہوا ویرانہ ہے

رونے والے تجھ سے چھٹ کر آنسو کو بھی رو بیٹھے
اب تو بس تکنا ہے افق کا رونا ہے نہ رلانا ہے

تو نہ اسے پہچان سکا بس رونا ہے تو اسی کا ہے
سارے جگ کو بھول بھال کے جس نے تجھے پہچانا ہے

ہم بھی تبسم سے مل آئے وحشی ایسے کم ہوں گے
بیگانوں میں اپنا ہے وہ اپنوں میں بیگانہ ہے

(۲)

کشاکشِ زیست میں یہ کیا کم ہے گاہے ماہے وہ یاد آئے
مرے خیالوں کی ظلمتوں میں بھی دیپ دو چار جھلملائے

انھوں نے لوٹا ہے کارواں اپنی آبلہ پا مسرتوں کا
گمان جن پر ذرا نہ گذرے، خیال جن کا ذرا نہ آئے

جنوں کی راہوں پہ چل پڑا ہوں میں لے کے سوغات آنسوؤں کی
ترے تصور کے آسرے میں، تری تمنا کے سائے سائے

ملے تو کیوں کر ملے فراغ اپنی وحشتوں سے اے نامرادی!
ہے دل کا اجڑا دیار ایسا، نہ کوئی آئے، نہ کوئی جائے

خیال میں ہے وہ دشت و صحرا جہاں گذر ہو نہ آدمی کا
نہ کوئی اپنا پتہ بتائے، نہ کوئی اپنا سراغ پائے

مرا گماں بھی یہ کہہ رہا تھا کہ رنگ لائیگا ترکِ الفت
کسی نے دیکھا کہ کل وہ بیٹھے تھے رہ گذر پر نظر لگائے

وحید اختر

۱۹۲۵ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے کا امتحان فلسفے میں بدرجہ اوّل کامیاب کیا اور اب ڈاکٹریٹ کے لئے "خواجہ میر درد کے تصوف" پر ریسرچ کر رہے ہیں جامعہ کے شعراء میں مخدوم، وجد، اور میکش وغیرہ کے بعد وحید اختر کو نمایاں مقام حاصل ہے جامعہ کے اس ہونہار فرزند کی شعری اور تنقیدی صلاحیتوں سے ہند و پاکستان کے ادیب و نقاد پوری طرح واقف ہیں۔

زبان و بیان کے حسن کو برقرار رکھتے ہوئے مضمون آفرینی میں انہیں کمال حاصل ہے انہوں نے بہت ہی قلیل مدت میں کئی اچھی اور معیاری نظمیں لکھیں جو ہند و پاکستان کے اکثر رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں غزل کم لیکن بہت پیاری کہتے ہیں نمونتاً دو غزلیں پیش ہیں۔

غزل

(۱)

تم گئے ساتھ اُجالوں کا بھی چھوٹا ٹھیرا
روز و شب اپنا مقدر رہی اندھیرا ٹھیرا

یاد کرتے نہیں اتنا تو دل خانہ خراب
بھولا بھٹکا کوئی دو روز اگر آ ٹھیرا

کوئی الزام نسیم سحری پر نہ گیا
پھول ہنسنے پہ خطاوار اکیلا ٹھیرا

پتیاں رہ گئیں بو لے اڑی آوارہ صبا
قافلہ موجِ بہاراں کا بس اتنا ٹھیرا

وقت بھی سعیٔ مداوائے الم کر نہ سکا
جب سے تم بچھڑے ہو خود وقت بھی ٹھہرا ٹھیرا

دل ہے وہ موم طلب جیسے شمعوں کا گداز
اب کوئی دیکھے نہ دیکھے یونہی جلنا ٹھیرا

گنگنا لیں گے غزل آج وحید اختر کی
نام لینا ہی تھا جو درپردہ تمھارا ٹھیرا

(۲)

دل کہ ہم قیمتِ صد رطلِ گراں ہوتا ہے
سنگ اندازوں میں رسوائے زماں ہوتا ہے

میرے روٹھے ہوئے خوابوں ہی کی آواز نہ ہو
کون یہ پچھلے پہر نوحہ کناں ہوتا ہے

جرسِ قافلۂ عمر ہے اک اک دھڑکن
جس پہ دل والوں کو کیا کیا نہ گماں ہوتا ہے

عمرِ ہر غم ہے بس اتنی ترے اک غم کے سوا
شمع بجھ جائے تو پل بھر کو دھواں ہوتا ہے

تیرے بیمار سے کیوں آنکھ چراتی ہے حیات
تازہ جب ذکرِ مسیحا نفساں ہوتا ہے

کون کس طرح سے یہ بوالہوسوں کو سمجھائے
عشق بیگانۂ ہر سود و زیاں ہوتا ہے

کیا کہوں میں مرے اشعار بتا دیں گے وحید
رگِ الفاظ میں کب خونِ رواں ہوتا ہے

غزل کے بارے میں

غزل کی ادبی صنف ان قوموں کا ورثہ رہی ہے جن کے جذبات کی شدت کا دنیا کو علم ہے ان کے جذبات اور تخیل کا غزل کی شکل میں لطیف ترین اظہار ہوا ہے۔ غزل کی بنا پہلے عربی ادب میں پڑی اور پھر عربی اثر سے فارسی میں اس کا رواج ہوا۔ فارسی میں یہ اپنے انتہائی عروج پر نظر آتی ہے غزل کی روایات فارسی ترکی اور اردو میں آئیں۔ اردو میں بھی غزل کمال کے اعلیٰ زینے پر پہنچی اور کسی طرح فارسی سے ہیٹی نہیں رہی۔ غرض کہ اسلامی دنیا کی چار سب سے بڑی اور اہم زبانوں میں غزل نے مقبولیت حاصل کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل اس روحانی اور جذباتی زندگی کی علامت بن گئی جن کی پرورش اسلامی تہذیب کے دامن میں ہوئی۔ غزل کے اس جذباتی ادب سے پہلے دنیا کے مہذب ملکوں میں عشق و محبت کی زمزمہ سنجی کا انداز اور لہجہ کچھ اور تھا۔

(اردو غزل ص ۳۳۸ از ڈاکٹر یوسف حسین خان)

غلام سرور ڈنڈا

جناب خواجہ حمیدالدین شاہد
لکچرار اُردو چادر گھاٹ کالج

اغلام سرور خاں نام اور ڈنڈا تخلص ہے سرور ڈنڈا کے نام سے مشہور ہیں عمر تقریباً (۳۵) سال ہو گی۔ گزشتہ ۱۵ سال سے شعر کہتے ہیں حیدرآباد کی کوئی محفل شعر و سخن ایسی نہیں ہوتی جس میں سرور ڈنڈا کا کلام شوق سے نہ سُنا جاتا ہو۔ حیدرآباد کی دیہاتی زبان میں شعر کہتے ہیں۔ پڑھنے کا انداز بھی دلکش ہوتا ہے۔ نظم، غزل اور رباعی کہتے ہیں۔ کلام میں سیاسی رنگ، حکومت پر نکتہ چینی اور اپنے ماحول کی ترجمانی ہوتی ہے۔ کالج آف آرٹس سے پینٹنگ کا ڈپلوما حاصل کیا کچھ دنوں یہ کام کرتے رہے۔ لیکن اب تعمیرات کے گتہ دار ہیں۔ ان کا کلام اتنا ہے کہ کتابی صورت میں شائع ہو سکتا ہے۔ لیکن اب تک صرف چند نظمیں رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ کئی مشاعروں میں ان کو انعام بھی ملا ہے۔ کلام کی خوبی یہ ہے کہ بچہ، جوان، بوڑھا، مرد، عورت، پڑھا لکھا اور ان پڑھ سب محظوظ ہوتے ہیں اور مکرر کلام سنانے کی خواہش کی جاتی ہے۔ ان کی تین غزلیں بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

غزل

(۱)

صورت بھی پیاری پیاری گن بھی ہے پیارا پیارا
کوئی او ٹی پڑ کو یارو دل لے لیا ہمارا

جب سے کسی کے اُپر دل آ گیا ہمارا
ارماں کٹاٹیاں کھاریں گردش میں ہے ستارا

جنتا کا دکھڑا کس سے میں انگے جا کو روؤں
کوئی بن گیا سکندر کوئی بن گیا ہے دارا

بن ٹھن کو میرے بل پو اپنے پوکاں مُرمُریں
بولو قسم ہے میری کن نے تمھیں سنوارا

من مانے ٹیکساں لیکو نخروں سے اتوں بولے
اب کے برس بجٹ میں بھل کو بھی نیں خسارا

رنگ لائیں گا نا اک دن لگمد کریں گا اک دن
کچھ بانکپن ہمارا کچھ بانکپن تمہارا

ڈنڈے کی بغلیوں سے کوئی بچا نہ اب تک
ڈنڈے کو بِن کی ظالم بنگی نظر نے مارا

(۲)

یہ رنگین مناظر یہ دلکش نظارے — کھلا ٹیاں لگا ریں نا ارمان ہمارے
غریباں کی ہمت لگی رنگ لانے — اترنے لگیں اچھے اچھوں کے پارے
بھری شام ہے سجے کو سونکو تم — ادھر بیچ رہیں گے یہ نخرے تمہارے
دکن میں تو جھینتراں سبیچ نامور ہیں — جگو املی بن کا یا بیگن بگھارے
ادہر میں بھی غپ چپ ادہران بھی غپ چپ — مگر پھر بھی پلکاں پو چمکیں ستارے

حکومت ہو یا کوئی اڑیل سا ٹٹو
سدا چلتیں ڈنڈے حقت کے سہارے

(۳)

میں رُس بھی گیا تو انوں خود ہٹک ریں — منانے کو کیا کیا اٹک ریں مٹک ریں
ہے دم سے ہمارے ترے دم میں بھی دم — ہمیچ کا ہیں کو آنکھیاں میں کھٹک ریں
مرے دوستاں کے کرم نکو پوچھو — ہزاروں غریباں ادھر بیچ لٹک ریں
ترقی کا دستر بچھے کا بچھا ہے — تمیں کیا جی اب لگ نلی جھٹک ریں

وو ڈنڈے یڑتال پڑنے سے پہلیچ
بچیچ ڈھونگاں کریں لے پاواں پٹک ریں

جناب شاذ تمکنت صاحب

عزیز قیسی

عزیز قیسی کا نام میرے لئے مدتوں کوفت کا باعث بنا رہا۔ قیسی نے حیدر آباد کی ادبی فضا میں اس وقت قدم رکھا جب سارے ہندوستان میں افسانہ نگار لکیر بازی کر رہے تھے اور شعرا نعروں میں مشغول تھے۔ قیسی نے آتے ہی ایسے دو چار نعرے لگائے کہ حیدر آباد کے ادبی ماحول پر چھا گیا۔ مشاعرے کے سامعین اور اس کے قدر دان شاندار نعروں سے متاثر رہے ہیں میں نے اس کے ہر نعرے پر اس کی آواز پھٹتی ہوئی محسوس کی۔ میں اپنی افتاد طبع کے باعث اونچی آواز میں نہیں بول سکتا اور شعر کے ساتھ میرا رویہ کچھ عجیب رہا ہے۔ ان ساری باتوں کا اثر یہ ہوا کہ میں نے قیسی کے تعلق سے خاصی غیر معقول رائے قائم کرلی۔ انہی دنوں "سب رس" میں قیسی کی دو چار عشقیہ نظمیں بھی نکلیں جنھیں پڑھ کر میری رائے کے قدم ڈگمگانے لگے لیکن میں نے اور نظموں کا انتظار کیا اور آخر ایک سہانی صبح وہ آئی جب میں نے جدید تر نسل کے دو چار نظم گو شاعروں میں اس کا شمار کیا۔

قیسی نظم کا شاعر ہے (یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں مسلسل ان شاعروں پر لکھ رہا ہوں جو نظم گو ہیں لیکن جنھیں غزل گو دکھانا ہے) نظم پر اس کی قدرت قابل قدر ہے۔ اس کی عشقیہ اور سنبھلی ہوئی انقلابی نظمیں جدید تر شاعری میں اضافہ ہیں۔ اس کی نظموں کی خوبیوں کا جائزہ لینا اس وقت برمحل نہیں ہے۔ لہذا غزلوں کے بارے میں دو ایک باتیں بہت اختصار کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں۔

بعض شاعر احباب کا خیال ہے کہ قیسی غزل نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میری رائے ایسی نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ مسلم ہے کہ غزل کی صنف اتنی منجھی ہوئی ہے کہ ہر کوئی شاعر ردیف اور قافیے کے سہارے اچھی غزل کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ غزل کی روایت غزل گو شاعروں کے حق میں ایک نعمت بن گئی ہے اور مضامین کا فقدان بھی نہیں، ہیر پھیر کے کچھ باتیں ڈھنگ کی کہہ لیجئے تب بھی غزل ٹھیک ہی کہلائے گی۔ بہرحال یہ اس صنف کی خوبی ہے (اور اب یہی کمزوری سمجھی جاتی ہے) اس اعتبار سے قیسی یقیناً ان غزل گو شاعروں سے مختلف ہے۔ اس کی غزلوں میں عجیب سا Abstractness ملتا ہے جو نظم کا خاصہ ہے۔ جدید تر نسل کے بعض شعرا اس قسم کی غزل کو فروغ دے رہے ہیں جن میں احمد ندیم قاسمی اور ناصر کاظمی کے نام

خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔ قیسی غزل گو شاعر نہ سہی لیکن غزل میں ایک منفرد انداز رکھتے ہیں جو بہت ہی دلکش اور موثر ہے۔

قیسی کا نمونۂ کلام حسبِ ذیل ہے:-

غزل

(۱)

شاخِ گل کے کانپ جانے پر تڑپ جاتا ہے دل
قطرۂ شبنم لرزتا ہے تو گھبراتا ہے دل

چاندنی میں کیا اثر ہے کون جانے؟ رات بھر
کچھ سبب کھلتا نہیں ہے اور گھبراتا ہے دل

وقتِ رخصت اُسکی پلکیں کس لئے اٹھتی نہ تھیں
ہائے کن بے کار سی باتوں پہ بھر آتا ہے دل

جن کی یادیں مدتوں تک آنسوؤں میں ڈھل گئیں
پھر انھیں بھولی ہوئی گلیوں میں لیجاتا ہے دل

ضبطِ غم کی انتہا دیکھی تو ہے بیمار نے
اب تو ٹکڑے ہو کے آنکھوں میں امڈ آتا ہے دل

کوچۂ دلدار قیسی! کوچۂ وحشت سہی
آپ کا کیا جائیگا؟ چلیے اگر جاتا ہے دل

(۲)

تمیز اپنے میں غیر میں کیا ہمیں جو اپنا نہ کر سکے ہم
ہر ایک محفل ہوئی گوارا تمہاری محفل سے کیا اٹھے ہم

سحر پشیمانِ آرزو ہے چراغِ شب تھے سو جل بجھے ہم
خراج اشکوں کا خونِ دل سے جو ہمکو لینا تھا لے چکے ہم

نہ شمع کا ہی نہ گیت ڈوبے اٹھے جو ہم اُسکی انجمن سے
چلو بس اچھا ہوا کہ ایسے کہاں کے محفل فروز تھے ہم

نہ ہم سیاہی نہ ہم اجالا چراغ ہیں اشکِ آرزو کے
کہ ہم سرِ دشتِ بیکراں ہیں سلگتے رہتے ہیں شام سے ہم

نظر ملاؤ تو جھوم جائیں نظر جھکا لو تو ڈگمگائیں
تمھاری نظروں سے سیکھتے ہیں طریق موت و حیات کے ہم

کریں جو شکوہ زباں کہاں ہے زباں ہی تابِ فغاں کہاں ہے
کہاں کا پردیس کیسی غربت؟ وطن کی گلیوں میں لٹ گئے ہم

عزیز قیسی! کہاں رہے تم کہ رات اُس بت کی انجمن میں
ہجومِ نغمہ میں ذکر سُن کر کسی دوانے کا رو پڑے ہم

جناب شاذ تمکنت صاحب

مظہر حسین قیصر

مظہر حسین قیصر پر لکھتے ہوئے یہ احساس ہو رہا ہے کہ میں گرے کے مرثیہ کے اس بند کی شرح لکھ رہا ہوں جس میں اُن جواہر پاروں کا ماتم ہے جنھیں کوئی آنکنے والا نہ مل سکا اور جن کی چمک آپ ہی آپ معدوم ہو کر رہ گئی۔

یہ غالباً ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء کی بات ہوگی۔ قائد اعظم کی وفات پر ساری فضاء اُداسی میں ڈوبی ہوئی تھی، جابجا جلسے ہو رہے تھے، تقریریں ہو رہی تھیں، نظمیں پڑھی جا رہی تھیں، ایسے ہی ایک ماتمی جلسے میں پہلی بار میں نے قیصر کو نظم پڑھتے ہوئے سُنا تھا، نظم اتنی خوبصورت اور درد کے آنسو میں تھی کہ اس کے کئی شعر آج بھی حافظہ میں محفوظ ہیں۔

دوسری بار میں نے قیصر کو جامعہ عثمانیہ کے ایک مشاعرے میں دیکھا، جگر صاحب کی صدارت میں مشاعرہ تھا۔ طلباء ایک ایک شاعر کی اس طرح مزاج پرسی کر رہے تھے کہ محفل زعفران زار بنی جا رہی تھی۔ اس شور و شغب میں قیصر نے اپنی غزل کا مطلع پڑھا۔ جگر صاحب کی تعریف، شعر کی خوبصورتی اور ترنم کے حُسن نے جیسے مشاعرہ میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہر ہر شعر پر تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہوتی رہیں۔ شاعر نے مقطع پڑھا اور سارا مشاعرہ سمیٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

قیصر کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اگر شرافت کی مادی شکل ممکن ہوتی تو میرا ایمان ہے اس کا نام مظہر حسین قیصر ہوتا۔ جی چاہتا ہے کہ اس کی شخصیت کے بارے میں کچھ لکھوں لیکن مجھ پر یہ پابندی عاید کر دی گئی ہے کہ مضمون محض تعارفی ہو۔ لہذا میں آپ کو اسکی اُن ملنسار آنکھوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں سُنا سکتا جو میری بینائی کا سرچشمہ ہیں۔

قیصر کی غزلیں آپ کی نذر ہیں، ان کے بارے میں کیا کہوں! کوئی اپنی تعریف اپنے ہی منہ سے کیسے کرے گا۔

غزل

(۱)

کیا کیا کروں سجنا جتن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے
بیری بنا اپنا ہی من کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

وعدہ تو تجھ سے کر گئی، میں لاج میں مر مر گئی،
پائل پکارے چھن چھنن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

پاپی گھٹا جب چھائے ہے کیا کیا من للچائے ہے
کس سے کہوں دل کی لگن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

پریتم سے جب پیتم ملے اندر ہی اندر من جلے
جھر جھر بہے نیناں سجن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

برہا کی کالی رات میں، اُمڈی ہوئی برسات میں
کروٹ جولوں چمکے چمن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

ساون کی یوں بوندیں پڑیں پلکوں سے جوں موتی جھڑیں
جل جل بجھے دل کی اگن کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

سکھیوں کی سیٹھی مار کیا تجھ بن مورا سنگھار کیا
کورے ہیں کاجل سے نین کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

(۲)

خود اپنے عزم جہد کو نیچا دکھا گئے
وہ قافلے جو ہار کے منزل کو پا گئے

ایسے بھی گل کھلے تھے گلستاں میں ہمنشیں
جو خود نہ ہنس سکے تو چمن کو ہنسا گئے

کیا ضبط کر سکیں گے بھلا تیرے غم کو ہم
بھولے سے جو کبھی تری محفل میں آ گئے

وہ جو خزاں کی نذر ہوئے ان کا ذکر کیا
کیا جانے کتنے پھول بہاروں کو بھا گئے

کچھ اس نظر سے آج وہ دیکھا کئے مجھے
جیسے ہزاروں طور کہیں جھلملا گئے

مجھ کو نہ دے شراب پر اتنا تو سوچ لے
کیا ہو گا حکم دے ہی جو گردش میں آ گئے

جس میں نہ کچھ خیال رہے اس جنوں پہ خاک
اچھا ہوا جو آپ گریباں بچا گئے

خیرات ندیم

جناب خواجہ حمید الدین صاحب شاہد
لکچرار اردو چادر گھاٹ کالج

میر خیرات علی نام اور ندیم تخلص ہے۔ سر رشتۂ تعلیمات میں ملازم ہیں عمر تقریباً (۳۴) سال ہوگی۔ حیدرآباد کے نوجوان شاعروں میں بہت مقبول ہیں کوئی مشاعرہ ایسا نہیں ہوتا جس میں یہ شریک نہ ہوں۔ حیدرآباد سے باہر مدراس اور امراوتی کے مشاعروں میں بھی اپنا کلام سنا چکے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے بھی کلام نشر ہوا۔ غزل اور نظم بہت اچھی کہتے ہیں۔ کلام میں لطافت، رنگینی اور مسائل زندگی کی ترجمانی ہوتی ہے۔ پروفیسر باقی مرحوم سے بھی مشورہ سخن کرتے تھے۔ کچھ دنوں خورشید احمد صاحب جامی کو بھی اپنا کلام دکھایا۔ غزلوں اور نظموں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ایک اچھا مجموعہ شائع ہو سکتا ہے۔

خیرات ندیم کی غزلوں کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

(۱)

حسرت سفر اتنی معتبر نہیں ہوتی — مشکل سفر جب تک ہم سفر نہیں ہوتی
شب کی اکھڑی سانسوں میں ڈوبنے لگے تارے — دیکھئے سحر کب تک جلوہ گر نہیں ہوتی
وہ بھی آج کہتے ہیں منزلوں کا افسانہ — منزلوں کی خود جن کو کچھ خبر نہیں ہوتی
عزم زندگی خود ہی حادثوں کا خالق ہے — آندھیاں تو ہوتی ہیں برق گر نہیں ہوتی
اور دید لیتی ہے شعلۂ بغاوت سے — آرزو کو جب کوئی رہگزر نہیں ہوتی
بات جو لرزتی ہے آج دل کی دھڑکن میں — مختصر سمجھنے سے مختصر نہیں ہوتی
وقت سادہ لوحی سے انتقام لیتا ہے — وقت کے تقاضوں پر جب نظر نہیں ہوتی

جل اٹھیں ندیم آخر مشعلیں حقایق کی
شاعری مسائل سے بے خبر نہیں ہوتی

(۲)

انساں سے پیار ہے غم انساں سے پیار ہے — ہر عظمت حیات کے عنواں سے پیار ہے

چھیڑو نہ یوں ابھی لب شیریں کی داستاں
فی الحال ہم کو تلخیٔ دوراں سے پیار ہے

گلچیں تری نگاہ میں مجرم ہمیں تو ہیں
یعنی ہمیں کو آج گلستاں سے پیار ہے

تھی مصلحت کہ درد پہ رہتے تھے مطمئن
اور آج ہم کو درد کے درماں سے پیار ہے

اے دوست جھوٹ جان کے کرتا ہوں اعتبار
تیرے حسین وعدہ و پیماں سے پیار ہے

مژدہ ضرور آئے گا فصل بہار کا
جو یوں جنوں کو چاک گریباں سے پیار ہے

ناکامیوں سے کھیل چکا عزم زندگی
اب کامیابیوں کے شبستاں سے پیار ہے

تاریکیوں سے کر نہ سکیں گے کبھی نباہ
وہ لوگ جن کو صبح بہاراں سے پیار ہے

کیوں کر نہ احترام کے قابل بنے ندیم
وہ فن کہ جس کو عظمت انساں سے پیار ہے

۳

نئے خیال نئی رہ گزر کی بات کرو
شب سیاہ میں نور سحر کی بات کرو

فریب حسن عقیدت ارے خدا کی پناہ
نہ اب دعا کی نہ باب اثر کی بات کرو

بدل چکا ہے بہت اہل کارواں کا مزاج
نہ منزلوں کی نہ اب راہبر کی بات کرو

جمال عارض دلکش کی بات رہنے دو
جلال منزل فکر و نظر کی بات کرو

حکایت لب و گیسو بہت پرانی ہے
غم حیات کی برق و شرر کی بات کرو

فسانۂ شب زنداں کو ختم کر ڈالو
حیات نو کی پیام سحر کی بات کرو

ندیم آج یہی وقت کا تقاضا ہے
غزل کی آڑ میں اوج بشر کی بات کرو

جناب خواجہ حمید الدین صاحب شاہد
لکچرار اردو چادرگھاٹ کالج

محمد شمس الدین تاباں

محمد شمس الدین نام اور تاباں تخلص ہے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ منشی فاضل کامیاب کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ شعر و سخن کا فطری ذوق رکھتے ہیں۔ حضرت صفی اورنگ آبادی مرحوم کے ممتاز شاگردوں میں گنے جاتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں جس میں تصوف کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ ان کا کلام ان کے دلی جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ سوز و گداز اور تڑپ ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ شعر پڑھنے کا انداز بھی بڑا اثر انگیز ہوتا ہے۔ حیدرآباد کے اکثر مشاعروں بالخصوص ادو و مجلس، ادارہ ادبیات اردو اور دبستان صفی کی شعر و سخن کی محفلوں میں ان کا کلام بہت پسند کیا جاتا ہے۔ ادبی رسالوں مثلاً سب رس اور "ہماری زبان" میں کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ قواعد زبان اور علم عروض پر ان کی گہری نظر ہے۔ چنانچہ گزشتہ چند ماہ قبل انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان "ہماری زبان" میں فیض احمد فیض کی ایک نظم پر تنقیدی مضمون شائع ہو چکا ہے۔

تاباں کی دو غزلیں بطور نمونہ کلام ذیل میں درج کی جاتی ہیں :-

غزل

(۱)

جب درد اٹھا جب ٹیس ہوئی ان کو ہی نمایاں دیکھا ہے
ہر رنج میں راحت پائی ہے ہر زخم کو خنداں دیکھا ہے

پھر وہ غم جاناں کیسے کرے جس نے غم دوراں دیکھا ہے
اک پھول میں کیا دلچسپی ہو جب حال گلستاں دیکھا ہے

ہر منزل پر راہی کو نیا اک اور نئی منزل کا ملا
ہر عالم امکاں کے آگے اک عالم امکاں دیکھا ہے

دشوار پسندی سے میری حل ہو نہ سکی آسانی بھی
وہ کام ہی مجھ سے بن نہ پڑا جس کام کو آساں دیکھا ہے

ہیں آپے سے باہر دیوانے گو فصلِ بہار آئی بھی نہیں
یا طوق و سلاسل آئے نظر یا پھر درِ زنداں دیکھا ہے

ہم اہلِ جنوں نے طوفاں میں ساحل کی سہولت پائی ہے
یا اہلِ خرد نے ساحل پر ہر حال میں طوفاں دیکھا ہے

کیا ذکر پریشانی کا میری! وہ خود بھی ہیں اپنے سودائی
اپنی ہی پریشاں زلفوں سے خود ان کو پریشاں دیکھا ہے

ہر چیز تمہاری نسبت سے کس درجہ حسین بن جاتی ہے
چمکا ہے ستارہ بن کر جو آنسو سرِ مژگاں دیکھا ہے

ہم اہلِ محبت سے تاباںؔ! آباد نہ ہوں کیوں مے خانے؟
جب دیر و حرم کو آپس ہی میں دست و گریباں دیکھا ہے

(۲)

کہا ہے مردِ کامل نے سُنا ہے مردِ کامل سے
کوئی نسبت نہیں دیر و حرم کو خانۂ دل سے

انھیں پا کر بھی کھو دیتا ہوں فرطِ جذبۂ دل سے
وفورِ شوقِ منزل میں گزر جاتا ہوں منزل سے

شہود و غیب، قرب و بعد سب کچھ اعتباری ہیں
کہ جو ہے دور آنکھوں سے وہی نزدیک ہے دل سے

مرا مقصود اس کی ذات ہے یا پھر رضا اس کی
مجھے مطلب نہیں کچھ خیر و شر سے حق و باطل سے

کوئی دیدار کا پیاسا کوئی بھوکا محبت کا
خدا محفوظ رکھے آدمی کو دیدۂ و دل سے!

بہت آساں ہیں دونوں جہاں کی نعمتیں زاہد!
مگر اک درد کی دولت ملا کرتی ہے مشکل سے

ترے منکر سے کب تیرے زمین و آسماں چھوٹے؟
کہ ساحل توڑ کر بھی بحر وابستہ ہے ساحل سے

ترے غم کی عطا نے جوہرِ ہستی کو چمکایا
ملا جو برق سے پایا وہ خرمن سے نہ حاصل سے

سبھی محتاج ہیں مجبور ہیں تاباںؔ! پکار اس کو
ملی ہے کب کوئی دولت کسی سائل کو سائل سے؟

شیخ حسین سالک

جناب مغنی تبسم صاحب
لکچرار اُردو کالج حیدرآباد

شیخ حسین سالک ۲۳ فروری ۱۹۲۹ء کو آندھرا پردیش کے اس علاقے میں پیدا ہوئے جس کے بارے میں اورنگ زیب عالمگیر نے کہا تھا " بودھن جائے بود و نیست " بودھن کے مدرسے میں تعلیم پائی۔ چند سال تک نظام شکر فیاکٹری میں ملازم رہے۔ پھر ملازمت ترک کر کے اپنے آبائی پیشے زراعت اور تجارت کی طرف متوجہ ہوئے۔ بودھن کی کوآپریٹو سوسائٹی اور کسانوں کی تنظیم کے سکریٹری ہیں۔ نو دس سال کی عمر سے شعر کہتے ہیں صحیح معنوں میں تلمیذ الرحمٰن ہیں۔ اپنے پیشے کی مصروفیت کے باوجود اُردو زبان و ادب کی خدمت کیلئے وقت نکال ہی لیتے ہیں۔ چھوٹی بحر میں ہلکی پھلکی غزلیں خوب کہتے ہیں۔ اکثر اشعار سہل ممتنع ہوتے ہیں۔ زبان و بیان میں سادگی کے ساتھ پرکاری بھی پائی جاتی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

غزل

وہ نہ آئے ہمدم رہ گیا
میری آنکھوں میں دم رہ گیا

ان کے حصے میں آئی خوشی
میری قسمت میں غم رہ گیا

مجھکو تلقین ہے صبر کی
کوئی شاید ستم رہ گیا

وہ نگاہیں اٹھیں جس طرف
فاصلہ اور کم رہ گیا

میں جو زندہ ہوں سالک ابھی
ایک باقی کرم رہ گیا

○

صبح ذکر مسیح تمام آیا
شام سے پہلے وقتِ شام آیا

○

مزا جینے کا پہلے تھا نہ اب ہے
مگر ہم کو یہاں رہنا ہی کب ہے؟

کم از کم آپ تو واقف ہیں شاید
مری بے چینیوں کا کیا سبب ہے؟

○

خطا کوئی مستی میں ہو معاف کردیں — ہے اک شرط پینے پلانے سے پہلے
تڑپنے میں اب لطف آنے لگا ہے — تھی اک دل لگی دل لگانے سے پہلے

○

کس نے مارا ہے؟ کیا کہوں؟ سالک! — لوگ کہتے ہیں غم کا مارا ہے

○

کوئی نہ دے سکا مری تنہائیوں کا ساتھ — جاگے تھے رات بھر کے ستارے چلے گئے
زندہ تو ہوں مگر نفس شعلہ زا نہیں — اب خاک رہ گئی ہے شرارے چلے گئے
سالک گذر رہی ہے بہر حال زندگی
کچھ لمحے رہ گئے ہیں گذارے چلے گئے

نوٹ:- عبدالقیوم خاں باقی مرحوم کی تیسری غزل کے بقیہ اشعار حسب ذیل ہیں۔ سلسلہ کے لئے صفحہ نمبر (١٤٧) دیکھئے:-

دیکھ رہا ہوں پس پردہ اسے — میرے حجابات نظر دیکھنا
پی گئے افسانۂ طور و کلیم — دیکھنے والوں کا جگر دیکھنا
پوچھنے والے تو یونہی رہ گئے — مل گئی غیروں کو خبر دیکھنا
دیکھتا ہے آپ کو سارا جہاں — آپ کے قربان ادھر دیکھنا
ہوش، سکوں، زیست، تمنا، خوشی — زیست کا سامان سفر دیکھنا
باعث جمعیت دل بن گیا
باقی آشفتہ نظر دیکھنا

جناب خواجہ حمید الدین صاحب شاہد
لکچرار اردو چادر گھاٹ کالج

عبداللہ ابن احمد۔ تاب

عبداللہ ابن احمد۔ تاب حیدر آباد کے خوش فکر نوجوان شاعروں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں (۳۵) سال کی عمر ہے لیکن ان کی جوانی بیروزگاری اور پریشان حالی کی تاب نہ لاسکی گزشتہ سال بیمار رہ کر اب صحت یاب ہو چکے ہیں ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہیں نہ جانے کب ان کو سکون و اطمینان کی زندگی نصیب ہو۔ تعلیم مدرسہ نظامیہ اور کایستھ پاٹ شالہ میں ہوئی ۱۹۵۳ء میں ایک ہفتہ وار "اردو" نکالتے تھے جو ایک سال کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے بعد مختلف اخبار کے دفتروں میں کام کرتے رہے شاعری کا ذوق فطری ہے گزشتہ (۲۰) سال سے شعر کہتے ہیں۔ ابتدائی زمانے میں سید حیدر پاشاہ صاحب حیدر اور کچھ دنوں مرحوم صفی اورنگ آبادی کو اپنا کلام دکھایا۔ غزل سے ان کی طبیعت کو بہت مناسبت ہے، زیادہ تر غزلیں کہتے ہیں جو سوز و گداز اور اثر میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں۔ انداز بیان میں خوبی اور طرز فکر میں گہرائی ہوتی ہے۔ حیدرآباد کے مشاعروں کے علاوہ ناگپور اور امراوتی کے مشاعروں میں شریک ہو چکے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے بھی اپنا کلام نشر کر چکے ہیں۔ تاب کی تین غزلیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱)

وہ غم عطا ہوا ہے کہ اب کوئی غم نہیں
آنسو مرے جواب تبسم سے کم نہیں

غم تیرا مل گیا ہے یہ عنوان زندگی
اب تو بھی ساتھ دے کہ نہ دے اسکا غم نہیں

لڑتے رہے اندھیروں سے جس صبح کیلئے
وہ صبح بھی تو صبح قیامت سے کم نہیں

جس کی جبیں پہ کھل گئے اسرار بندگی
سجدوں کو اس کے حاجت دیر و حرم نہیں

محفل وہی ہے صاحب محفل وہی ہیں تاب
ہر شے ہے اپنی جا پہ اک افسوس ہم نہیں

(۲)

زندگی کو جو تو نے درد کی منزل سمجھے
ہر تبسم کو وہ عنوان غم دل سمجھے

اتنے مانوس رہے ہیں ترے غم سے دوست
ہم تسلی کو بھی توہینِ غمِ دل سمجھے

کھو گئے اتنے ترے جلوے کے تیا مجھ میں
خود کو بیگانہ اپنے سے مشکل سمجھے

کیوں اجاڑا ہے بتاؤ تو بھری محفل کو
کیا خطا تھی جو تمہیں رونقِ محفل سمجھے

ہم تو منزل پہ پہنچ کر بھی لٹے ہیں اے تاب
لوگ پھر بھی ہمیں آسودۂ منزل سمجھے

(۳)

آنکھ جن کی واقف ہے صبح کے نظاروں سے
وہ بہل نہیں سکتے ڈوبتے ستاروں سے

اب تو ہر تسلی بھی دل پہ بار ہوتی ہے
صاف صاف کہتا ہوں اپنے غمگساروں سے

چند اشک ہوتے ہیں زیبِ دامنِ غربت
وہ بھی چھین لیتے ہیں آپ غم کے ماروں سے

میکدے کی بنیادیں جن کے دم سے قائم ہیں
جام کون چھینے گا ایسے بادہ خواروں سے

دوست کی صدا اب تو ہر طرف سے آتی ہے
کیا کہوں گزر آیا کتنے رہ گزاروں سے

اب کسی کے روکے سے صبح رک نہیں سکتی
لاکھ روشنی مانگو ڈوبتے ستاروں سے

جناب مغنی تبسم صاحب
لکچرار اردو ۔ کالج

امان ارشد

حیدرآباد کے نوجوان شاعروں میں امان ارشد کا نام محتاج تعارف نہیں ہے شہر اور اضلاع کے اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ شاہراہ، صبا، شاعر اور دوسرے معیاری رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوکر مقبولیت پاچکا ہے۔ پورا نام خواجہ امان اللہ ہے۔ ۸؍ نومبر سنہ ۱۹۲۳ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم سٹی کالج میں ہوئی۔ پھر علی گڈھ سے انٹرمیڈیٹ کامیاب کیا اور ایوننگ کالج حیدرآباد میں بی۔اے تک تعلیم پائی۔ اٹھارہ سال سے شعر کہتے ہیں لیکن بحیثیت شاعر پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۵۲ء میں منظر عام پر آئے نظم اور غزل ہر دو اصناف میں شعر کہتے ہیں۔ کچھ دنوں حضرت صفی اورنگ آبادی سے مشورہ سخن کرتے رہے زبان و بیان کی صحت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ بالعموم ترنم سے اپنا کلام سناتے ہیں۔ انکی غزلیں قلبی واردات اور دلی جذبات کی ترجمان ہوتی ہیں۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

(۱)

اب آخر شب ہے ہمسفرو تنویر کی منزل آپہنچی — خوابوں کے دھندلکے ختم ہوئے تعبیر کی منزل آپہنچی
اے چرخ کہن اب تجھ پر بھی انساں نے کمندیں ڈالی ہیں — تقدیر جہاں خود کہتی ہے تدبیر کی منزل آپہنچی
اسرار جمال ہستی کو ممنون تماشا ہونا ہے — اے واقف راز عشق و جنوں تفسیر کی منزل آپہنچی
تسکین غم دوراں کیلئے بے چین ضمیر فطرت ہے — اے نالہ کشان شام و سحر تاثیر کی منزل آپہنچی

مضطر ہیں تخیل میں کب سے گلزار تمنا کے جلوے؟
تاخیر نہ کر اے خون جگر تصویر کی منزل آپہنچی

(۲)

کس منزل میں ذوق سفر ہے — ہر منزل اک راہ گذر ہے
بیگانے ہیں حال سے اپنے — لیکن ہم کو سب کی خبر ہے

جناب مغنی تبسم صاحب
لکچرار اردو کالج حیدرآباد

خمار انصاری

خمار صاحب کی زندگی کے حالات کا مجھے پوری طرح علم نہیں ہے۔ صرف اس قدر جانتا ہوں کہ وہ بودھن میں کنٹریکٹر ہیں۔ اردو ادب اور شاعری سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ کسی زمانے میں نقاد کے فرضی نام سے تنقیدی مضامین لکھا کرتے تھے۔ اب مشاعروں میں شرکت کرکے اپنے ذوق کی تشنگی کو بجھا لیتے ہیں۔ بہت ہی پُرخلوص اور ملنسار آدمی ہیں۔ خمار صاحب سے میری ملاقات پہلی بار بانسواڑے کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی۔ سالک صاحب سے بھی میں وہیں متعارف ہوا۔

سچ پوچھیے تو گرمئ محفل انھیں شعرا کے دم سے تھی خمار صاحب شعر بڑے والہانہ انداز میں سناتے ہیں یہی وارفتگی اور ازخود رفتگی کی کیفیت ان کی شاعری کی جان ہے درستی زبان کا انھیں خاص خیال رہتا ہے۔ فن شعر کی پابندیوں کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ شعر کی تاثیر میں کمی نہیں ہونے پاتی۔

نمونۂ کلام :-

تلخئ صبر درد میں آج ملا کے بھول جا
یاد جو آرہے ہیں وہ اشک بہا کے بھول جا
قصۂ شام غم اگر وہ نہ سنیں تو غم نہ کر
تارے ہیں تیرے سامنے ان کو سنا کے بھول جا

o

میرے خیال میں یہاں اور تو کچھ کمی نہیں
جس کی تلاش ہے مجھے بزم میں اک وہی نہیں
میری نظر میں ہے ابھی تلخ مآل رسم و راہ
ایسا ڈرا ہوں میں کہ اب ہمت دوستی نہیں

o

بالیں پہ آکے تو بھی مرا انتظار کر
رو رو کے سو گیا ہوں ترے انتظار میں

o

ڈھونڈ سکیں تو ڈھونڈ لیں حسن کی بدگمانیاں
حد گماں سے بڑھ گئیں عشق کی بے نشانیاں

o

خود چھپ کے دیکھنا تھا جب میری بے بسی کو
کیوں اپنے ڈھونڈنے کی ترغیب دی مجھی کو

o

وحشت کا یہ عالم بھی کتنا دلکش عالم ہے
دنیا پر میں ہنستا ہوں دنیا مجھ پہ ہنستی ہے

حمید الماس

جناب مغنی تبسم صاحب
لکچرار اردو کالج حیدر آباد

میرے اور شاذ کے ناموں کی طرح حمید الماس' بھی ایک مغالطہ خیز نام ہے۔ ایسے نام رکھ لینے سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ پہلی ہی تخلیق پڑھنے والوں اور نقادوں کی توجہ کا مرکز یا شکار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میں بھی انھیں کچھ عرصے تک صنف نازک سے سمجھتا رہا پھر میرے ایک ملاقاتی نے جو لیبر ڈپارٹمنٹ میں کلرک تھے بتایا کہ حمید الماس انھیں کے دفتر میں کام کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کے دور ہو جانے سے مجھے زیادہ دکھ نہیں ہوا کیوں کہ چند ہی روز بعد میرا تعارف اسی نام کے ایک دبلے پتلے اداس آنکھوں والے نوجوان سے ہوا جس میں مناسب حد تک نسوانیت موجود تھی۔ ہم دونوں کے وصف مشترک کم آمیزی اور کم سخنی نے عرصہ تک درمیان میں حجابات حائل کر رکھے تھے یہی وجہ ہے کہ میں الماس کے خانگی حالات اور خیالات سے زیادہ واقف نہ ہو سکا۔ مگر جب کبھی میں الماس کے قریب ہوتا اور دکھے ہوئے لہجے میں انھیں بات کرتا دیکھتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی انجانا درد قطرہ قطرہ میرے دل میں ٹپک رہا ہے دن اور مہینے یوں ہی بیتتے چلے گئے۔ ایک دن میں نے الماس کو خلاف معمول بہت ہی عجیب حالت میں پایا (اس واقعے کی تفصیل غیر ضروری ہے) حمید الماس کو جو اپنے حلقۂ احباب میں خاموش نوجوان کے لقب سے معروف تھے، گویائی مل گئی تھی۔ وہ ایک ایک دوست کی خبر لے رہے تھے۔ سب ساکت و متحیر تھے۔ اس دن الماس کی شخصیت بے نقاب ہوئی۔ ان کے بارے میں بہت سی باتیں جو میرے علم میں نہیں تھیں اسی دن معلوم ہوئیں۔ تب میں نے جانا کہ الماس کی نظموں میں آہوں اور سسکیوں کی آوازیں کیوں آتی ہیں جیسے بچپن میں ماں باپ کا پیار اور گھریلو سکون نصیب نہ ہوا ہو اور آمد شباب سے پہلے ہی فکر روزگار نے آ گھیرا ہو۔ اس کی محرومیوں کا اندازہ لگانا آسان نہیں ہے۔ بالآخر شاعری کے روگ نے درمان کا کام کیا غم جاناں نے رہی سہی کمی کو پورا کر دیا۔ وہ سولہ برس کی عمر سے شعر کہتے ہیں۔ اب ان کی عمر چوبیس سال ہے

حمید الماس ۱۴ دسمبر ۱۹۳۳ء کو دکن کے ایک تاریخی مقام سگر (نصرت آباد) میں پیدا ہوئے۔ ناموافق معاشی حالات کے سبب کالج کی تعلیم حاصل نہ کر سکے سر رشتہ لیبر میں ملازم ہو گئے۔ اب گلبرگہ میں مقیم ہیں۔ یوں ان کی شعر گوئی کی عمر بہت ہی کم ہے لیکن پچھلے دو تین سالوں میں ان کی بعض اچھی نظمیں

اور غزلیں ہندوستان اور پاکستان کے معیاری ادبی رسالوں میں چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں۔ نظموں میں چراغ اور زندگی، تیشۂ وغم، آخری سہارا، محلکے، شہر آرزو، اور دیارِ غیر میں قابلِ ذکر ہیں۔ حمید الماس ان گنے چنے نوجوان شاعروں میں سے ایک ہیں جن کے ہاں قدیم روایت سے گریز اور جدید اسلوب کی تلاش ملتی ہے۔ نظم گو شاعر ہونے کے باوجود غزل بھی کہہ لیتے ہیں۔ وہ غزل کے مزاج سے آشنا ہیں اور مناسب حد تک اس کا احترام بھی کرتے ہیں۔

حمید الماس بہت پابندی، سنجیدگی اور محنت سے شعر کہتے ہیں فطرت نے انھیں شاعر کا دل اور دماغ بخشا ہے۔ اس لیے ہم بجا طور پر ان سے اچھی توقعات وابستہ کر سکتے ہیں۔ حمید الماس کی دو غزلیں بطور نمونہ درج ہیں:۔

غزل

(۱)

احسانِ تماشائے در و بام نہ لیتے — بس چلتا تو ہم عشق کا الزام نہ لیتے
کیا جانئے کس طرح بدل جاتی یہ دنیا — ہم ضبطِ محبت سے اگر کام نہ لیتے
ہم صاف نکل آتے رہِ شادی و غم سے — گر صبحِ ازل درد کا انعام نہ لیتے
شاید کہ نکل آئے تری دید کی صورت — کیوں کر قدم گردشِ ایام نہ لیتے

ساقی کی نگاہوں کا تھا کچھ اور ہی انداز
یہ جانتے الماسؔ تو ہم جام نہ لیتے

(۲)

بہاروں میں تلاشِ گل نہ کرتے ہم تو کیا کرتے — تمنائے خمِ سنبل نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
لبِ گل سے فغاں اٹھنے لگی جب گلستانوں میں — تلاشِ نغمۂ بلبل نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
سنورتا ہی نہ تھا ہم سے مزاجِ عالمِ ہستی — پریشاں پھر تری کاکل نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
گھٹا جاتا تھا دم وہ دردِ نومیدی کی کثرت تھی — چراغِ محفلِ غم گل نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

اب اس سے کیا کہ کس کے زخمِ دل مہکے ہیں گلشن میں
تمنائے شگفتِ گل نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

وحید نلگنڈوی

جناب خواجہ حمید الدین صاحب شاہد
لکچرار اردو چادر گھاٹ کالج

سید وحید اللہ شاہ قادری وحید ۲۲ مارچ سنہ ۱۹۰۰ء کو نلگنڈہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد سررشتۂ تعلیمات میں ملازم ہو گئے اور اب وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو چکے ہیں۔ بچپن ہی سے اردو فارسی میں شعر کہنے کا ذوق رکھتے ہیں۔ اردو میں حیدرآباد کے مشہور شاعر حضرت توفیق مرحوم اور فارسی میں علامہ شمسی مرحوم سے مشورۂ سخن کیا۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ نعتیہ کلام سے آپ کی طبیعت کو خاص لگاؤ ہے۔ حیدرآباد کے قدیم رسالوں مثلاً "ترقی" اور "تاج" میں آپ کا کلام شائع ہو چکا ہے۔ کلام میں بے ساختگی اور جذبات کی فراوانی کے ساتھ ساتھ پختگی اور استادانہ رنگ جھلکتا ہے۔

وحید کی دو غزلیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں:۔

غزل

(۱)

دل کبھی تیرے مقابل نہیں ہونے پاتے — کہ ستارے مہ کامل نہیں ہونے پاتے
خرد و ہوش کے کمزور سفینے اے دل! — کبھی آسودۂ ساحل نہیں ہونے پاتے
جیسے بجھنے ہی نہیں حسن کی نظروں کے چراغ — دل کے جوہر کبھی زائل نہیں ہونے پاتے
کتنی دشوار ہے تعبیر حدیثِ دل کی — لفظ، مفہوم کے حامل نہیں ہونے پاتے
باغباں! تیری نظر جب سے مرے ساتھ ہوئی — کانٹے گلزار میں حائل نہیں ہونے پاتے
تیز بنیانِ رہ شوق بڑھے جاتے ہیں — پردے جلوؤں کے بھی حائل نہیں ہونے پاتے
دل سے ٹکرا کے جگاتی ہے تری برقِ جمال — ہم جو نظارہ سے غافل نہیں ہونے پاتے

سامنے ان کی جبیں کا ہے ستارۂ تاباں
ہم جو گم کردۂ منزل نہیں ہونے پاتے

(۲)

اک چراغ سے میرے سو چراغ جلتے ہیں
ماہتاب بنتے ہیں، آفتاب ڈھلتے ہیں

موڑ زندگی کے جب دم بدم بدلتے ہیں
آپ کے اشاروں پر گرتے بھی سنبھلتے ہیں

دورِ جام چلنے دو! دورِ جام چلنے دو!!
اس کی چھاؤں چھاؤں میں مہر و ماہ چلتے ہیں

میں ازل سے یوں تیرا عشق و نغمہ اُٹھاتا ہوں
فاکہ میں چمن کی جو گلستاں بھی پلتے ہیں

جب نقاب اُٹھتا ہے آگے کون رہتا ہے
رات کے اندھیرے سب صبح کو نکلتے ہیں

کیا خرام مستی میں، ربط باہمی ہے یہ!
وہ جدھر کو چلتے ہیں میکدے بھی چلتے ہیں

جب وحید رہتا ہے، آپ اپنے ہی میں گم
نام اس کا سنتے ہی آپ کیوں مچلتے ہیں

راہ میں ہم سو بار لٹے ہیں — پھر بھی مستحکم عزم سفر ہے
ساتھ ہمارے بس وہی آئے — جس کے دل میں درد بشر ہے
ہر ذرہ اک حسن کی دنیا — لیکن شرطِ ذوقِ نظر ہے
عشق ہمیشہ کوچہ بہ کوچہ — رسوا رسوا خاک بسر ہے

مسلکِ رنداں اللہ اللہ!
وجہِ فضیلت دامن تر ہے

امۃ الکریم خورشید نذیر

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی

امۃ الکریم خورشید نام اور نذیر تخلص، ایک جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتی ہیں تعلیم گھر پر ہوئی، شاعری کا شوق بچپن سے رہا۔ مگر ایسا ماحول نہیں ملا جس سے شاعری کے ذوق کو ترقی ہوتی، البتہ شادی کے بعد شاعری سے دلچسپی زیادہ ہوگئی عبد القیوم خاں باقی مرحوم کو کلام بتایا جانے لگا۔ مگر ان کے انتقال پر یہ ذریعہ بند ہوگیا۔

مشاعروں کا شوق ہے خود اپنے مکان پر مخصوص مشاعرہ منعقد کرتی ہیں، غزل اور نظم دونوں کہتی ہیں۔ ترقی پسند زمرہ میں شامل ہیں۔ کلام میں آمد ہے، اسلوب بیان صاف ہے

غزل

ہاتھ میرا سینے سے اسطرح جدا ہوتا — تم سویرے آجاتے پھول اک کھلا ہوتا
پاس ہی تھے میرے جب بیخودی کا عالم تھا — تم اگر نہیں ہوتے بیخودی کا کیا ہوتا
خامشی ہماری گر ناگوار خاطر تھی — خود تمہیں بتا دیتے دل نے جو کہا ہوتا
تم اگر چلے آتے گلستاں مہک اٹھتا — زندگی حسیں ہوتی دل سے دل ملا ہوتا
بیخودی بڑھا دیتی آپ کی عنایت کو — ہوش آگیا ہائے ورنہ کیا سے کیا ہوتا
روٹھتے منا لیتے پر نہ یوں جدا ہوتے — شکوے ہر گھڑی کرتے عمر بھر گلا ہوتا

وہ نذیر بادہ کش یاد کیا نہیں آتی
جس کے لب سے پیمانہ ہر گھڑی لگا ہوتا

جناب خواجہ حمید الدین شاہد
لکچرار اردو چادر گھاٹ

قمر ساحری

سید علی رضا نام اور قمر تخلص ہے لیکن قمر ساحری کے ادبی نام سے مشہور ہیں انکی عمر ۴۳ سال ہوگی۔ انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی کسی دفتر میں اہلکار ہیں سنہ ۱۹۴۰ء سے شعر کہتے ہیں۔ حیدرآباد کے نوجوان شاعروں میں ان کا خاص مقام ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے ادبی رسالوں میں ان کا کلام شائع ہوتا ہے نظم، غزل اور رباعی بڑی روانی کے ساتھ کہتے ہیں۔ بڑے پرگو اور موزوں طبع شاعر ہیں۔ کبھی کبھی فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں۔ حیدرآباد کی ہر محفل شعر و سخن میں قمر ساحری کا کلام بہت پسند کیا جاتا ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف جہاد ان کی شاعری کا نقطۂ نظر ہے۔ غزلوں میں بھی کہیں کہیں یہ رنگ دکھائی دیتا ہے۔ قمر کی تین غزلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:-

غزل

(۱)

امن کی دنیا میں کوئی عقدۂ دشوار نہیں
جس کی تدبیر ستاروں کی پرستار نہیں

یہ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی موجوں کا ہجوم
کون کہتا ہے کہ طوفان کے آثار نہیں

جانے کیوں ڈرتے ہیں ارباب حکومت مجھ سے
میرے ہاتھوں میں قلم ہے ابھی تلوار نہیں

رو نہ یوں شاکیٔ ماحول! کوئی راہ نکال
اس زمانے میں کسے شکوۂ آزار نہیں

وقت کو جو بھی بدل دے وہی انساں ہے عظیم
وقت کے ساتھ بدلنا کوئی کردار نہیں

(۲)

وہ رہگزار قابلِ نقشِ قدم نہیں
جس میں قدم قدم پہ کئی پیچ و خم نہیں

ہے تیرے دم سے سلسلۂ روز و شب
تیرا ہی غم نہیں تو زمانے کا غم نہیں

اس رہ گزر پہ خضر بھی مایوس و نامراد
وہ رہگزر کہ جس پہ ہمارے قدم نہیں

یہ زندگی ہزار سہی زندگی مگر
تیرے بغیر موت کے عالم سے کم نہیں

تیرے کرم سے ایک زمانے کا تھا ستم — تیرا کرم نہیں تو کسی کا ستم نہیں
یہ فکرِ صبح و شام یہ آزارِ کشمکش — دنیا بہشت ہو کے بھی دوزخ سے کم نہیں

شاید یہ انکسار کی معراج ہے قمر
اپنا سرِ نیاز کسی در پہ خم نہیں

(۳)

یہ کیسی بزم کہ انصاف ہے یہاں معدوم — شراب ساز ہی خود ہیں شراب سے محروم
مجھے فریب نہ دے اے نشاطِ کون و مکاں! — تبسموں میں بھی ملتا ہے آنسوؤں کا ہجوم
ضمیر پاک نہیں تو نظر میں نور کہاں — خودی میں سوز نہیں تو حیات ہے مفہوم
یہی تو جبرِ مشیت کے شاہکار نہیں — یہی غریب یہی غم زدہ یہی مظلوم

ابھی نہ روک مغنّی! یہ نغمۂ جاں سوز
بہت سے قلب ابھی تک ہیں درد سے محروم

سعادت نظیر

"میری گزری ہوئی زندگی ایک المناک داستان ہے، جس کا ہر صفحہ یاس و حسرت سے عبارت ہے۔ میں ابھی چھٹی جماعت ہی میں تھا کہ شفیق ماں اللہ کو پیاری ہو گئیں اور سوتیلی ماؤں کا راج آیا۔ میں اور میرے معصوم بھائی بہن ظلم و ستم کا نشانہ بنتے رہے۔ دو تین سال بڑے ہی صبر سے گذرے مگر بعد میں قوتِ برداشت نہ رہی، زندگی نے کروٹ لی۔ فکر و عمل کا سہارا لینا پڑا۔

میں متوسط طبقے کا ایسا نوجوان ہوں جو پندرہ سال سے جینے اور جلانے کی جد و جہد میں لگا ہوا ہے کبھی راستے کی رکاوٹوں کی پروا رہی اور نہ ہی آبلہ پائی کا احساس ——————

—— ۵ رمضان المبارک م ۲۶ مارچ ۱۹۵۸ء کی صبح کو اپنی عمر کی اٹھائیسویں منزل پر پہنچا ہوں نجانے اور کتنی منزلیں طے کرنی ہونگی

میرے گھر کا ماحول ادبی تھا، بچپن میں والد محترم مولوی ابوالمحاسن محمد محسن خانصاحب متین مرحوم کو دیکھا کہ میز پر جھکے ہوئے کتابیں لکھ رہے تھے، وہ اس وقت سے لکھ رہے تھے جبکہ میں ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا اور اس وقت تک لکھتے رہے، جب تک موت کے بے رحم ہاتھوں نے ان کے ہاتھ سے قلم نہ چھین لیا۔ شبانہ روز محنتوں اور دماغی کاوشوں نے انھیں وقت سے پہلے بوڑھا بنا دیا۔ انھوں نے اولاد کا مستقبل سنوارنے کیلئے بہتیرا ہاتھ پیر مارا مگر وہ اپنے نام کے سوا کچھ نہ چھوڑ سکے۔

ہائی اسکول کی تعلیم ختم کرنے ہی پائی تھی کہ میرے ناتوان کندھوں پر بھائی بہنوں کی پرورش کا بوجھ پڑا۔ چھوٹے چھوٹے ٹیوشن کئے، اپنی تعلیم جاری رکھی اور اپنے بھائی بہنوں کی بھی۔ عثمانیہ سے انٹر کیا، بی۔ اے کیا اور پھر ایم۔ اے —— پی، ایچ، ڈی کا ارادہ ہے

کم عمری ہی سے شعر و شاعری کا ذوق ہے، غزل و نظم دونوں کا دلدادہ ہوں "آب و تاب" کے عنوان سے میرا منتخب مجموعہ کلام زیر ترتیب ہے، جو بہت جلد شائع ہو جائے گا۔" ادب برائے زندگی، زندگی برائے ارتقا" کا قائل ہوں اور بس۔

اردو میں میرؔ، دردؔ، آتشؔ، انیسؔ، غالبؔ، مومنؔ، اقبالؔ، اصغرؔ، یگانہؔ، اور حسرتؔ میرے پسندیدہ شاعر ہیں اور انگریزی میں بائرنؔ، کیٹسؔ اور شیلیؔ ——————

کوئی بات دل سے زباں تک نہ پہونچے
کوئی میرے رازِ نہاں تک نہ پہونچے

کہیں آرزو امتحاں تک نہ پہونچے
بھڑک کر یہ آگ آسماں تک نہ پہونچے

رہے دل کی دل میں! زباں تک نہ پہونچے!
مرا غم حدودِ بیاں تک نہ پہونچے

وہی حال ہے سوزشِ دل کا اب تک
کہیں نوبت آہ و فغاں تک نہ پہونچے

رہائی ہے یارب! یہ کیسی رہائی؟
قفس سے چلے آشیاں تک نہ پہونچے

ہیں کیا مشورے رہبر و راہ زن میں
یہ سازش کہیں کارواں تک نہ پہونچے

مری حسرتوں کے دیئے بجھ رہے ہیں
دعا ہے! اُٹھے گھر دھواں تک نہ پہونچے

کئی منزلوں سے گزر بھی گئے ہم
مگر اک ترے آستاں تک نہ پہونچے

یہی اب ہے بہتر کہ چپ سادھ لیجے
کوئی بات پھر داستاں تک نہ پہونچے

نہ چھیڑیں وہ تارِ رگِ جاں! سعادت!
کہیں نغمۂ دل فغاں تک نہ پہونچے

نظیرِ خستہ کی تقدیر جاگ اٹھی تو نہیں
کہ بے رخی تری تمہیدِ دوستی تو نہیں

جو شامِ غم نظر آتا ہے ایک اجالا سا
کسی کے حسنِ تصور کی روشنی تو نہیں

دلوں کے لٹتے ہی جاگے حیات کے جذبے
کسی کی راہ زنی عین رہبری تو نہیں

تری جفا کے تسلسل میں فرق کیوں آیا؟
مری وفاؤں میں اے دوست! کچھ کمی تو نہیں

قفس سے دور چمن میں دھواں سا اٹھتا ہے
الٰہی! خیر ہو! بجلی کہیں گری تو نہیں

ادائے خاص مبارک تجھی کو ہو ساقی!
جو عام ہو نہ سکے طرزِ میکشی تو نہیں

شبِ فراق میں اکثر یہ سوچتا ہوں نظیر!
کسی کا دردِ محبت ہی زندگی تو نہیں

متین سروش

جناب ابو محمود صاحب ایم۔اے (عثمانیہ)

شاعر، ادیب، تنقید نگار، بچوں کا شاعر و ادیب، متین سروش کا نام آتے ہی کئی شخصیتیں بیک وقت سامنے آجاتی ہیں۔ پورا نام مرزا متین احمد بیگ تخلص سروش۔ ادبی دنیا میں متین سروش کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

میٹرک بھوپال سے، انٹر میڈیٹ اورنگ آباد سے اور بی۔اے جامعہ عثمانیہ سے کامیاب کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوکر متین سروش نے جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں کام کیا پھر نشر گاہ اورنگ آباد میں مامور ہوئے اور آجکل نشر گاہ حیدرآباد میں ہیں۔

سروش نے کوئی سولہ، سترہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ عام روش کے برخلاف ان کی شاعری کی ابتداء نظم سے ہوئی۔ لیکن وہ نظم و غزل دونوں کے کامیاب شاعر ہیں۔ موضوع اور انداز بیان دونوں لحاظ سے انکی شاعری میں تنوع اور خوش ذوقی ( ) کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی شاعری جلال و جمال کا مجموعہ کہی جا سکتی ہے۔ اس میں غم ذات بھی ہے اور غم کائنات بھی۔ عشق کے مدہوش کیفیات بھی ہیں اور جنون کے جہاں ساز عزائم بھی، شوق کی سرمستیاں بھی ہیں۔ ذوق کی لطافتیں بھی۔ فرد کی شکست کی کسک بھی ہے تو آگے بڑھتے ہوئے کاروان حیات کے جرس کی پروقار گونج بھی۔

سروش غزلوں میں اصغر، حسرت اور فانی سے الگ الگ حیثیتوں سے متاثر ہوئے تہذیب عاشقی اور سادگی عشق میں حسرت سے، نشاط دل و کیفیت نظر میں اصغر سے اور غم پرستی و فنکارانہ انداز بیان میں فانی سے۔ دیدار حسن کی سرمستی عشق کی سرشاری، غم کی مدہوشی، جذبات کی پاکیزگی و طہارت محبت پر یقین۔ اور اعتبار وفا کی سرخوشی۔ زندگی کو زندگی بنانے اور اس سے بھرپور لذت اندوز ہونے کا ارمان ان کی غزلوں میں ہر جگہ ملیگا غم کی مستی اور عرفان حیات کے سرور کے ساتھ جو چیز سروش کے یہاں بطور خاص مابہ الامتیاز ہے وہ حسن کا حیات بخش تصور ہے۔

متین سروش کی دو غزلیں نمونتہً ملاحظہ فرمائیے :-

غزل

(۱)

تابانیٔ بہار ہے تو جلوہ گر نہیں ۔۔۔ موجِ شرابِ ناب ہے تیری نظر نہیں
یوں دیکھتے ہیں جیسے کہ دل پر نظر نہیں ۔۔۔ یوں پوچھتے ہیں حال کہ گویا خبر نہیں
شاید زبانِ ہوش میں ہے بے خودی بھی ۔۔۔ یوں دیکھتا ہوں جیسے وہ پیشِ نظر نہیں
وارفتگانِ شوق کی سرشاریاں نہ پوچھ ۔۔۔ کیفِ مئے حیات بے سوزِ جگر نہیں
لو اس کی بڑھتی جائیگی ہر موجِ غم کے ساتھ ۔۔۔ دل ہے کوئی چراغِ سرِ رہ گزر نہیں
رہ رہ کے کوندتی ہے ابھی برقِ یادِ یار ۔۔۔ یعنی غمِ حیات ابھی معتبر نہیں!

کیا منظرِ جمال نگاہوں میں ہے سروش
کیوں مجھ کو انتظارِ نمودِ سحر نہیں!

(۲)

وفورِ بے خودی میں کیوں زباں پر ان کا نام آیا ۔۔۔ مگر راہِ وفا میں پھر کوئی مشکل مقام آیا
چراغانِ شبِ فرقت نہ پوچھ اے ہم نشیں مجھ سے ۔۔۔ کہ ہر داغِ تمنا بن کے اک ماہِ تمام آیا
دلِ پرخوں میں ساقی یہ ترے جلووں کی تابانی ۔۔۔ کہ جیسے جامِ مے میں پرتوِ ماہِ تمام آیا
یہاں تو ہر نفس موجِ مے گلنار ہے ساقی ۔۔۔ میں وہ میکش نہیں جو میکدے سے تشنہ کام آیا

اب اس مدہوشیٔ غم کا کچھ اندازہ بھی ہے اے دل
کہ ان کی یاد میں پیہم زباں پر اپنا نام آیا

خواجہ حمید الدین صاحب شاہد

جناب مغنی تبسم صاحب
لکچرار اردو کالج

خواجہ حمید الدین صاحب شاہد خواجہ شجاع الدین صاحب کے بڑے فرزند ۱۴ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو شہر حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ حیدر آباد کی قدیم درسگاہ دار العلوم سے امتحان میٹرک بہ درجہ اول پاس کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر زور صاحب نے انھیں اپنے گھر میں بلا لیا جہاں یہ دس بارہ سال تک مقیم رہے۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ دو سال تک سنٹرل اسکول آف کامرس میں لکچرار اردو کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۴۷ء میں جونیر لکچرار اردو ہندی کی جائیداد پر تقرر عمل میں آیا۔ اس وقت چادر گھاٹ کالج میں لکچرار اردو کی خدمت پر مامور ہیں۔

سنہ ۱۹۳۸ء سے ماہنامہ سب رس ادارۂ ادبیات اردو کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں دس سال تک ادارہ کے مہتمم رہے ادارے کی کتابوں کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داریاں انھیں کے سر رہتی ہیں۔ ادارے کے شعبہ اطفال کے شریک معتمد رہے۔ کل ہند اردو کانفرنس کی مجلس انتظامی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس وقت ادارے کے شعبہ امتحانات اور تعلیم بالغان کی معتمدی کا کام انجام دے رہے ہیں۔

شاہد صاحب کی ان ہی خدمات کے پیش نظر ادارے کی مجلس انتظامی نے ان کو رفیق ادارہ کا اعزاز عطا کیا۔ شاہد صاحب سنہ ۱۹۵۳ء میں اکیڈمک کونسل عثمانیہ یونیورسٹی کے رکن منتخب ہوئے!!

شاہد صاحب کے تنقیدی اور تحقیقی مقالے مختلف موقر رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں اب تک شاہد صاحب کی جو تصنیفات اور تالیفات شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے (۱) شمس الامراء کے سائنسی کارنامے (۲) سرگذشت ادارہ (ادارہ ادبیات اردو کے آغاز و ارتقاء کی داستان) سنہ ۱۹۴۱ء۔ (۳) ادارۂ ادبیات اردو کے سنہ وار تذکرے سنہ ۱۹۴۱ء تا سنہ ۱۹۴۹ء۔ (۴) اردو میں سائنسی ادب۔ آجکل ادارۂ ادبیات کی جانب سے حیدر آباد کے ادیبوں اور شاعروں کا ایک تفصیلی تذکرہ مرتب کر رہے ہیں اسی طرح ساہتیہ اکیڈمی

اندھرا پردیش کی جانب سے بھی حیدرآباد میں رہنے والے اردو کے شاعروں کا ایک تذکرہ شائع کیا جا رہا ہے اس کی ترتیب و تدوین کا کام بھی شاہد صاحب ہی انجام دے رہے ہیں اس کے علاوہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے اردو مثنویوں پر مقالہ لکھنے میں مصروف ہیں۔ ادھر ڈھائی تین سال سے آپ باضابطہ شعرگوئی کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ طرحی مشاعروں میں بھی پابندی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے:-

غزل

(۱)

کبھی جو مجھ پہ تری برہمی نہیں ہوتی — امید چشم عنایت کبھی نہیں ہوتی
تصورات کی محفل سجائے رہتا ہوں — جو بے قراری دل میں کمی نہیں ہوتی
جب آپ کی نظر التفات ہوتی ہے — تو پھر کسی سے بھی دلبستگی نہیں ہوتی
تری اداس نگاہوں کا چل گیا جادو — ہجوم یاس میں کم دلکشی نہیں ہوتی
اس اعتماد پہ عزم گناہ کرتا ہوں — کہ تیرے لطف و کرم میں کمی نہیں ہوتی
زوال حسن ہے یا ذوق دید ہے معدوم — چراغ جلتے ہیں اور روشنی نہیں ہوتی

خدا گواہ کہ اس زندگی میں اے شاہد
خوشی بھی میرے لئے اب خوشی نہیں ہوتی

(۲)

نہ بہار کی کہانی نہ گلوں کا کچھ فسانہ — کہوں تا بہ کے بتاؤں میں قفس کو آشیانہ
نہ اسیر زلف و رخ ہوں نہ رہین رنگ و بو ہوں — میں مزاج دار عالم مرا غم زمانہ
یہ کمال عقل و دانش کہ زوال علم و عرفاں — کہ مقام آدمیت نہ سمجھ سکا زمانہ
مرے دل کی حسرتوں کا نہ کروں بیاں کسی سے — کوئی سن کے کیا کرے گا مرا دکھ بھرا فسانہ
وہ چمن چمن نہیں ہے نہ وہ شاخ ہے نہ گل ہے — میں بھٹک رہا ہوں ہر سو بہ تلاش آشیانہ
میں وفا شناس دل ہوں مری آرزو محبت — مری بندگی کا مقصد نہ جبیں نہ آستانہ
دل غم زدہ ہے شاہد مری بندگی کا مرکز — یہی خانۂ خدا ہے یہی میرا آستانہ

راشد آذر

جناب شاذ تمکنت صاحب

راشد آذر سے میری دوستی کب ہوئی؟ ہم نے کب "آپ" کا نقاب اٹھا کر "تم" سے ایک دوسرے کو مخاطب کیا؟ میرے حافظے میں موجود نہیں ہے۔ مجھے البتہ اس کی پہلی نظم یاد ہے جو اس نے غالباً نظام کالج کے مشاعرے میں سنائی تھی اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس نظم پر ہوٹنگ بھی ہوئی تھی۔ اس کا عنوان تھا "ل" کے گلے میں سونے کا ہار دیکھ کر"۔ یہ نظم غزل درس کے فارم میں تھی اور سرمایہ داری کے خلاف شاعر کے انقلابی خیالات کی ترجمانی کرتی تھی۔ مجھے یہ نظم سن کر تعجب ہوا کہ ایک ایسا شاعر یہ نظم سنا رہا تھا جس کا تعلق خود اونچے طبقے سے تھا۔

جوں جوں میں راشد کے قریب آیا اس کے جوہر کھلنے لگے میں نے راشد جیسا سیدھا سادہ اور پُر خلوص آدمی نہیں دیکھا، وہ منہ پھٹ ہونے کی حد تک صاف گو ہے۔ بلکہ میں کہوں گا کہ اس کے مزاج میں بھی ایک خاص قسم کا اکھڑ پن ہے۔ پتہ نہیں اس کے دوسرے احباب اس گوارا اور خوشگوار سختی کو محسوس کرتے ہیں یا نہیں۔

راشد کے فن کا ارتقا بہت مدھم اور آہستہ خرام رہا ہے۔ مجھے بھی کبھی تعجب ہوتا ہے کہ راشد کے وسیع مطالعے کے باوجود کیوں اس کی شاعری نے وہ سب خوبیاں سمیٹنے کی کوشش نہیں کی جن سے اعلیٰ درجے کی شاعری ممکن ہے۔ زبان و بیان، الفاظ کی دروبست پر اسے قدرت ہے۔ موضوع کے ساتھ انصاف کرنا بھی وہ جانتا ہے۔ اس لئے میں راشد کے مستقبل سے پر امید ہوں اور مجھے یقین ہے کہ وہ مایوس نہیں کریگا۔

راشد نظم کا شاعر ہے، لیکن اس کی یہ غزلیں جو انتخاب میں پیش کی جا رہی ہیں اپنے اندر امکانات رکھتی ہیں اور یقیناً کامیاب ہیں۔

غزل نمبر (۱)

وہ جو لمحے بہار میں گزرے — آپ کے انتظار میں گزرے
وہ جو لمحے کسی طرح نہ کٹے — سایۂ زلفِ یار میں گزرے
یہ بھی دن ہیں کہ ہے غمِ دنیا — وہ بھی دن تھے کہ پیار میں گزرے

جو بہارِ حیات تھے وہ دن انتظارِ بہار میں گزرے
خود فریبی میں کٹ گئے کچھ دن کچھ ترے اعتبار میں گزرے
حاصلِ زیست ہے وہ رات آذر
جو سحر کے سنگار میں گزرے

(۲)

میرا غمخانۂ دل آج بھی ویرانہ ہے میری ہر سانس تری یاد کا افسانہ ہے
ایک عرصہ ہوا چھوٹے ہوئے تجھ سے لیکن دل دیوانہ ابھی تک ترا دیوانہ ہے
جانتا ہوں تجھے پانے کی تمنا کرنا زندگانی کے لئے موت سے ٹکرانا ہے
ناخداؤں کے لئے موت ہے طوفاں کا خوف بیار میں ہار کا ڈر جیتے سے گھبرانا ہے
درحقیقت جسے کیفیتِ غم کہتے ہیں ہر تمنا کا کسی یاد میں کھو جانا ہے
شوق نے دل میں جو اصنام تراشے آذر
ان سے آباد تخیل کا صنم خانہ ہے

شاہد صدیقی

محمد سعادت اللہ خاں (ایم۔اے)

جس زمانے میں اکثر شاعر خیال و خواب کی دنیا میں کھوئے کھوئے سے تھے، اور ردیف و قافیہ کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے تھے، اُسی زمانے میں چند ایسے شاعر بھی پیدا ہوئے جن کا موضوعِ سخن حقایقِ زندگی اور عظمتِ انسان رہا۔ ان میں شاہد صدیقی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

شاہد حسین سرزمینِ "تاج" آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مذہبی اور غیر شاعرانہ فضا میں سانس لی۔ بچپن ہی میں پدری شفقتوں سے محروم ہو گئے۔ اپنے برادرِ معظم کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اُنھوں نے اُردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انگریزی زبان بھی سیکھی۔ ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد آئے۔ ہفتہ وار "الاعظم" میں کام کیا۔ قاضی عبد الغفار مرحوم کے اخبار "پیام" کی نائب ادارت سنبھالی، "صبح دکن" کے مدیر بنے، بعد میں "سلطنت" اور سہ روزہ اخبار "سینا" میں کام کیا اور اب سالار جنگ لائبریری میں برسرِ کار ہیں۔

شاہد صدیقی نے گیارہ سال کی عمر سے شاعری شروع کی۔ نظم بھی کہتے ہیں اور غزل بھی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل ہی ان کی محبوب صنفِ سخن ہے۔ ان کا مرتبہ باعتبارِ غزل نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے موجودہ بڑے شاعروں سے کچھ کم نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ نقادوں کی نظر اس جوہرِ نایاب پر نہیں پڑی، ورنہ وہ فراقؔ اور فیضؔ کے ساتھ شاہد کو بھی شریک کر لیتے۔ تغزل کو برقرار رکھتے ہوئے، سیاسی موضوع کو حسن و خوبی کے ساتھ اشعار میں سمونا شاہد ہی کا حصہ ہے۔

دو غزلیں بطور نمونہ اگلے صفحہ پر پیش کی جاتی ہیں

غزل

(۱)

جو کھو گئے ہیں اُجالوں میں اُن کو کیا معلوم؟
کہ ظلمتوں ہی سے ہوتا ہے راستا معلوم

یہ تازگی، یہ تبسم! یہ خندۂ پیہم!
ابھی گلوں کو مآلِ بہار کیا معلوم؟

اب اپنے آپ سے شکوہ ہے بیوفائی کا
بہت دنوں میں ہوئی فطرتِ وفا معلوم

وہی فنا سے حفاظت کی سعی جاری ہے
خرد کو رازِ بقائے دوام کیا معلوم

حیات کچھ بھی سہی، کائنات کچھ بھی سہی
قیام جزوِ سفر ہے مقام نا معلوم

سب اپنے زخم دکھاتے رہے تجھے لیکن
تری نظر پہ جو گزری کسی کو کیا معلوم

نہیں سکونِ مسلسل کی آرزو! شاہدؔ!
ہمیں ہے دردِ محبت کی انتہا معلوم

(۲)

کبھی خرد کا کبھی عشق کا بہانہ تھا
مری حیات کا مقصد فریب کھانا تھا

تری نگاہ کو گہرائیوں میں جانا تھا
مرے سکوت کی ہر تہ میں اک فسانا تھا

شبِ فراق کے مارے ہوئے نہ دیکھ سکے
طلوعِ صبح کا منظر بہت سہانا تھا

چمن کے ایک ہی گوشے میں ہے ہجومِ بہار
یہ وہ جگہ ہے جہاں میرا آشیانا تھا

جہاں ہوا انھیں پا شکستگی کا گماں
مسافروں کو وہیں سے قدم بڑھانا تھا

خزاں کا خوف تھا غنچوں کو فصلِ گل میں مگر
وہ مسکرا کے رہے جن کو مسکرانا تھا

حضورِ حسن مجالِ نظر نہ تھی! شاہدؔ!
ہمیں خود اپنے مقدر کو آزمانا تھا

جناب عالم خوندمیری صاحب
لکچرار فلسفہ نظام کالج

سلیمان اریب

اریب نے اپنی "شاعرانہ عمر" کے پندرہ سال یکساں نہیں گذارے' ان کی شاعری کا آغاز ایک ایسے دور میں ہوا جبکہ سماجی حقائق نے ادب اور فن کے قلعہ کو بڑی حد تک مسمار کر دیا تھا۔ اور ہر ادیب اور شاعر سے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ وہ صرف نازک جذبات کی ترجمانی کو شعر و ادب کی کل کائنات تصور نہ کرے بلکہ شعر و ادب کے ذریعہ سماجی حقائق سیاسی مطالبات' معاشی تصورات' اور تمدنی افکار کے اظہار کے مواقع فراہم کرے۔ تمدن میں شعر و ادب کو ایک عرصہ تک ایک مستقل اور اعلیٰ مقصد کی حیثیت حاصل رہی لیکن بیسویں صدی نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب کے بھی بنیادی معیارات میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ سلیمان اریب نے اسی انقلابی دور میں اپنے شعری سفر کا آغاز کیا لیکن ان کی ابتدائی نظموں میں نہ تو انقلاب کی فضا نظر آتی ہے اور نہ کسی تبدیلی کی خواہش کی ترجمانی ملتی ہے اس کے برخلاف وہ انتہائی معصوم لہجے میں فضاء کے ابر آلود ہونے پر خوشی مناتے ہیں اور "وقت سے پہلے شام کی آمد" کا تصور انہیں مسرور کر دیتا ہے۔ "پابندی اوقات" کی انتہا یہ ہے کہ وہ شام سے قبل مے خانے کی طرف رخ کرنا گوارا نہیں کرتے' شام نہ سہی' شام کا سا سماں ان کے لئے ضروری ہے۔ ایک انقلابی دور کے نوجوان شاعر کی یہ "رسم پرستی" واقعی بڑی مایوس کن نظر آتی ہے۔ اریب اپنی یہ نظم جھوم جھوم کر سناتے تھے اور خوش ہوتے تھے کہ شائد انہوں نے ایک بڑی غیر معمولی بات کہدی ہے۔ ان کے لہجہ کی معصومیت ان کے چہرے کی مسکراہٹ اور ان کی غمگین آواز کی وجہ سے ان کے ہلکے پھلکے اشعار میں بھی ایک نیا پن نظر آنے لگتا تھا۔ ان کی "شخصیت" میں اُس حرارت اور گرمی کی ہمیشہ کمی رہی جس کے بغیر ایک شاعر انقلاب کا مغنی نہیں بن سکتا۔ لیکن حالات کے تقاضوں نے اور "وقت" کے معیارات نے انہیں اپنے معصوم لہجے کو ترک کر دینے پر مجبور کر دیا۔ سماج اور سیاست کا حملہ مکمل ہو چکا تھا۔ سامعین کے مذاق بھی بدل چکے تھے۔ حسن سنجیدہ اور عشق متین ہو چکا تھا۔ سلیمان اریب نے بھی اپنی شخصیت کی راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریوں کو جمع کرنا شروع کیا۔

اور اس مختصر سی آگ کے ساتھ تہذیب و تمدن" کی حفاظت" کے لئے عوام جہاد کیا۔ چند دنوں تک آواز کی بلندی اور لہجہ کی تلخی کو انقلابی شاعری کا ایک ضروری جسز و تصور کرتے رہے۔ اب میکدہ کی جگہ سماج نے لی۔ اور محبوب کے انتظار کے بجائے اُس دور کا انتظار کرنے لگے جب انسان اُمر ہو جائیگا اور امن کی فاختائیں ہر طرف اُڑتی ہوئی نظر آنے لگیں گی۔ آریب کی اس دور کی شاعری کا مطالعہ اس حقیقت کو منکشف کر دیتا ہے کہ صرف عقیدہ کی پختگی کافی نہیں ہے لاکھ ضروری سہی" من کی گرمی نہو تو باہر سے مستعار حاصل کی ہوئی گرمی ایک "رقص شرر" کے لئے کافی ہوسکتی ہے۔ لیکن گرمی بزم" کے سامان فراہم نہیں کرسکتی۔ بہرحال آریب نے ایک عرصہ تک اپنے "خمخانہ" کو مقفل کر دیا اور اس کی کنجی بازار سیاست میں پھینک دی۔ کچھ دنوں کے لئے سیاست کے میدان میں سرگرم رہے اور آگ سے کھیلنے کی بھی کوشش کی۔ جیل گئے اور مہینوں "مراقبہ" کرتے رہے۔ شائد اسی "مراقبہ" کے دوران میں ان پر "تجلی" نمودار ہوئی کہ تہذیب و تمدن کی حفاظت "غزل" کے ذریعہ بھی ممکن ہے' انتظار محبوب بھی انقلاب کے انتظار سے کم "مقدس" نہیں۔ جیل سے باہر آئے تو آریب بڑی حد تک بدلے ہوئے انسان تھے۔ اب انھیں چنگاریوں کو جنھیں بڑی محنت سے اکٹھا کیا تھا' بجھانے میں مصروف ہو گئے۔ اُن کی زندگی کا یہ دور "زندگی" کے نقطۂ نظر سے کتنا ہی ناکام سہی لیکن شاعری کے نقطۂ نظر سے ان کا کامیاب ترین دور ہے۔

غزلگوئی میں آریب نے بڑی ایمانداری کا ثبوت دیا اور "مسائلی غزل" کے فریب کا شکار نہیں ہوئے۔ تلاش کیجئے تو ان کی "غزل" میں بھی مسائل کی جھلک نظر آجائے گی لیکن یہ اُن کی شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہوگا۔ بلکہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے یہ عادت کا نتیجہ ہوگا۔ اصل میں یہ کوئی نقص نہیں ہے کہ شعرا خصوصاً غزل میں زندگی کے مسائل بیان کئے جائیں۔ غالب نے حیات و کائنات کے کئی اسرار بے نقاب کئے لیکن اس میدان میں کامیابی کے لئے صرف 'طاقت' کافی نہیں۔ ایک خاص ذہن ضروری ہے۔ آریب نے اس مسئلہ پر سوچا ہو یا نہو' بہرحال اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے جرأت بے جا کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ان کی غزل میں مجھے جذبہ اور اظہار کی ایک ایسی تازگی محسوس ہوتی ہے جس کی اُن کے ہم عصر شعرا کے پاس ایک حد تک کمی ہے غزل کی صنف ہمارے تمدن کا ایک جزو بن گئی ہے اور اسی وجہ سے غزل کا لہجہ بہت مانوس نظر آتا ہے۔

لیکن اُسکی یہی قدامت ایک بڑا خطرہ بن جاتی ہے۔ قدیم علامتوں اور استعاروں کی تکرار اکثر غزل کے مستقبل سے مایوس کر دیتی ہے اسی بنا پر آریب کے انداز بیان اور ان کے جذبات کی تازگی نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ اُن کے جذبات کی صداقت سے انکار ممکن نہیں' یہ دوسری بات ہے کہ اُن کے جذبات کا محور اکثر اُن کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ غمِ دوراں سے غمِ جاناں اور غمِ ذات کی جانب اُن کی "واپسی" ایک شکست خوردہ شخصیت کی ہزیمت نہیں ہے بلکہ انھوں نے زندگی کے بہت سے تجربات اکٹھا کرنے کے بعد اپنی ذات کو اپنی شاعری اور اپنے شاعرانہ جذبات کا محور بنا لیا ہے۔ کہیں کہیں شکست خوردگی کے آثار بھی نظر آجاتے ہیں لیکن اُنکی لا اُبالی شخصیت اور اُن کا بے پرواہ مزاج اُنہیں احساس شکست سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ آریب کی غزل میں اُن کی بنیادی "تنہائی" بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ "تنہائی" اور "انتظار" کے امتزاج نے اُن کی شاعری کو ایک انوکھا حسن عطا کر دیا ہے۔ ایک مختصر مضمون میں گنجائش نہیں کہ میں انکے اشعار پیش کروں میں بھی ایک عرصہ تک اُن کی غزل کا بہت زیادہ معترف نہ تھا لیکن جب میں نے ایک بار اُن کی وہ غزل پڑھی جس کا پہلا شعر ہے۔ "کبھی بہ پاس صداقت بھی منہ نہیں کھلتا : بہت عجیب ہے یہ داستانِ جرم و سزا" تو مجھے اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اسی غزل کے ایک شعر نے مجھے چونکا دیا اور یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جو شاعر اتنا بلند شعر کہہ سکے اُسکو آسانی کے ساتھ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شعر یہ ہے ؎ "گزر رہا ہوں مسلسل اک ایسے عالم سے : حیات دے کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا"

آریب ایک غمگین فضا کی تخلیق تو کرتے ہیں لیکن وہ اپنی ہستی پر غم کو چھا جانے کی اجازت نہیں دیتے یہی غمگین فضا اُنکی شاعری کی ایک بڑی خصوصیت ہے یہ طے کرنا بڑا مشکل ہے کہ انکی "تنہائی" "غم پسندی" کا نتیجہ ہے یا انکا غم آگین لہجہ اُنکی "تنہائی" کا پیدا کردہ ہے یہ بات تو قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اُن کا تنہائی کا احساس اور اُنکی غم پسندی اُنکے مزاج کے ایسے اجزاء بن گئے ہیں کہ انہیں اُنکی شخصیت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے پاس "بات" بھی ہے اور اُنہیں بات کرنے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ اور اسی لئے میرا خیال ہے کہ اُردو شاعری کو آریب سے بڑی بڑی توقعات ہیں۔

آریب کی تین غزلیں بطور نمونہ ذیل میں درج کیجاتی ہیں :-

غزل

(۱)

شہرۂ کاکل و رخسار وہی ہے کہ جو تھا — دل حریف نگہ یار وہی ہے کہ جو تھا
شہ نشینوں سے ہوس جھانکتی بیٹھی ہے ابھی — عشق رسوا سر بازار وہی ہے کہ جو تھا
اور اک دامنِ نو کوئی کہاں سے لائے — شیوۂ دیدۂ خونبار وہی ہے کہ جو تھا
کوئی بتلاؤ کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ — نعرۂ کفر سرِ دار وہی ہے کہ جو تھا
زندگانی تری مانند حسیں ہے کہ جو تھی — زندگانی سے مجھے پیار وہی ہے کہ جو تھا

(۲)

ہم تجھ سے محبت کر کے بھی اے دوست محبت کر نہ سکے
جینے کے لئے تو جیتے ہیں، پر تیرے لئے بھی مر نہ سکے
کیا کس کو ملا کیا کس نے دیا، یہ بات کسی سے کیا کہئے
دنیا نے یہی دیکھا ہوگا، داماں ہی ہم بھر نہ سکے
جو کچھ بھی پڑی ہم جھیل گئے کیا ان کی جفا، کیا اُن کا کرم
آغازِ وفا کی دھار سہی پر انجام وفا سے ڈر نہ سکے
وہ پیرِ مغاں کی فیاضی، وہ مے کی فراوانی توبہ
میخانہ خالی ہو بھی گیا ہم جام بھی اپنا بھر نہ سکے
کیا زنجیریں کیا دار و رسن، سو بار اِدھر سے گزرے ہیں
ہم مر مر کے جیتے ہی رہے مارے بھی گئے تو مر نہ سکے

(۳)

تیری قربت تیری دوری، عالم عالم دنیا دنیا — تجھ سے مل کر دل کی حالت، محفل محفل تنہا تنہا
جانے کس کی بات بنے گی، جانے کتنی بات بڑھے گی — تیرا دامن ایک گلستاں، میری وحشت صحرا صحرا
تیرے غم سے پھوٹ بہے ہیں جانے کتنے غم دنیا کے — تیرا دامن سر آنکھوں پر، میرے آنسو دریا دریا
تم نے کتنے عشق کئے ہیں، عشق کی ایسی تیسی ہے — کو ہکنی سے میخواری تک عشق ہمیشہ رسوا رسوا
ظلمت ظلمت چیخنے والو! جھلمل جھلمل تارے دیکھو — صبحِ فردا روشن روشن، پنہاں پنہاں پیدا پیدا

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی

بشیر النساء بیگم بشیر

بشیر النساء بیگم نام بشیر تخلص۔ حیدر آباد کے ایک معزز اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جو صدیوں سے حیدر آباد کا متوطن ہے۔ بشیر کی ولادت حیدر آباد میں ہوئی اور فارسی کی تعلیم گھر پر پائی کسی مدرسے سے استفادہ نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود بہت اچھی قابلیت رکھتی ہیں۔

جس طرح شادی کے پہلے ان کی پرورش علمی فضا میں ہوئی اسی طرح شادی کے بعد بھی علمی ماحول نصیب ہوا۔ ان کے خسر صاحب ذوق اور سخن فہم تھے۔ شوہر بھی ایک ذی علم، سخن فہم، علم دوست فنون لطیفہ کے شایق ہیں۔ اس طرح بشیر کے ذوق سخن کو اور زیادہ جلا ہو گئی

بشیر کے اخلاق نہایت پاکیزہ اور سادگی پسند ہیں ان کے تمام ملنے والے ان کی وضع داری، مروت۔ شرافت، انسانیت، ہمدردی، خلوص، ملنساری اور مشرقی تہذیب کی دلدادگی کے معترف اور مداح ہیں۔ جو ایک مرتبہ ملتا ہے وہ انکا گرویدہ ہو جاتا ہے۔

ان کی سادگی اور اخلاق متاثر کرتے ہیں ان کے خلوص کا جواب بن نہیں پڑتا۔ ان کی ہمدردی دل کو موہ لیتی ہے۔ اس طرح ان کے کلام میں پاکیزگی، حلاوت، انسانیت کا درد اور تصورات کی رفعت اور بلندی ملتی ہے۔

بشیر کے کلام کو دیکھا جائے تو یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ وہ اقبال سے بہت متاثر ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ ان کی اپنی انفرادیت نے ہر مقام پر ندرت اور نفاست کے کنول کھلائے ہیں۔ بشیر کا کلام پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقبال کی شاگرد ہیں۔ جنھیں استاد نے خود اپنا رنگ سخن بخش دیا ہے۔ اقبال سے انکو بے پناہ عقیدت ہے جس کا ثبوت بشیر کی نظم داستان اقبال سے بخوبی مل سکتا ہے۔ یہ ایک بہترین نظم ہے جو اقبال کے رنگ میں ہے!

بشیر کی کتاب "آبگینۂ شعر" میں غزلوں کی تعداد کم ہے۔ مگر یہ بھی اقبال کے رنگ میں ہیں۔ ان میں سوز و ساز ہے درد و غم ہے تخیل کی رفعت ہے جذبات کی روانی ہے خیالات کی ندرت ہے۔ زبان کی لطافت ہے چند شعر پیش ہیں۔

بتادیں کیا تمھیں ہم کون ہوں کیا ہوں بہر صورت
سراپا درد ہوں اک ہستیِ محروم درماں ہوں
چمن میں پھول ہوں گل ہیں برنگ بو ہوں پوشیدہ
کہیں تعبیر ہستی ہوں کہیں خواب پریشاں ہوں

جو لذت میسر ہے ذوق طلب میں   نہیں اس سے واقف ترے عرش والے

فرشتے بھی نہ تھے واقف کہ یوں بن جائے گی دنیا
نہاں راز حیات دہر تھا گندم کے دانوں میں

مری فطرت کا ہر ذرہ ہے محو خود فراموشی   بظاہر آئینہ ہوں اور بباطن راز پنہاں ہوں
مثال شمع گریاں ہوں برنگ نے ہوں فریادی   کبھی ویرانہ مسکن ہے کبھی زیب گلستاں ہوں
تجھے کیا ساز عشرت سے مجھے کیا سوز حسرت سے
بشیر اس عالم ہستی میں ہم مانند پنہاں ہوں

بشیر کے پاس اقبال کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے بلند پایہ شعرا کا رنگ بھی نظر آتا ہے مثلاً مومن کے رنگ کی ایک غزل ہے۔

مطلع ہے۔

تجھ پہ کیا خاک اے زمین ہوتا   ہم نہ ہوتے تو کچھ نہیں ہوتا

انکے کلام میں اردو اور ہندی کا امتزاج بڑی خوبصورتی سے ہوتا ہے۔

احمد معین الدین بزمی

احمد معین الدین نام بزمی تخلص ۔ والد کا نام حکیم محمد شریف الدین ہے ۔ جنوری ۱۹۱۷ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے ۔ اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی ۔ بی اے اور ایل ایل بی کے امتحانات جامعۂ عثمانیہ سے کامیاب کئے ۔ بیس سال سے شعر کہتے ہیں ۔ شاعری کے ابتدائی دور میں حضرت علی منظور مرحوم نے بزمی کے کلام پر اصلاح دی اور یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانے میں پروفیسر عبدالقیوم خاں باقی مرحوم نے ۔ آج کل بورڈ آف ریونیو (اکسائز) میں منتظم ہیں ۔ غزل کا نمونہ حسب ذیل ہے ۔

غزل

(۱)

فصلِ گل میں خزاں کے نشاں رہ گئے / کتنے ٹوٹے ہوئے آشیاں رہ گئے
رہبروں کی نوازش رہی اس قدر / نزدِ منزل کئی کارواں رہ گئے
جن کا ذوقِ نظر نامکمل رہا / ان کی نظروں سے جلوے نہاں رہ گئے
عمر بھر حادثوں سے رہی کشمکش / پھر بھی تیرے ستم آسماں! رہ گئے
آگئے بڑھ گئے منزل پہ اہلِ جنوں / اہلِ دانش نہ جانے کہاں رہ گئے
ایسے پھولوں پہ بھی رکھ نظر باغباں / بن کے جو زینتِ گلستاں رہ گئے
حاصلِ زندگی تھے وہ لمحے کہ جو / عشق اور حسن کے درمیاں رہ گئے
تیری محشر خرامی نے کیا کردیا / ایک گردش میں دونوں جہاں رہ گئے
زندگی میں یہ کیسا انقلاب آگیا / غم نوازی کو اب مہرباں رہ گئے
آگہی ہم نے پائی بنامِ جنوں / باخبر محوِ خوابِ گراں رہ گئے

زندگی موت سے جاوداں ہوگئی
زندگانی کے بزمی نشاں رہ گئے

غزل

(۲)

نگاہِ ناز میں وہ کیفِ التفات نہیں / دلِ حزیں میں وہ رنگین واردات نہیں
[illegible] / [illegible] کے سامنے مائلِ تعینات نہیں

نظر سے چھیڑ دے اب ساز دل کے تاروں کو
جہانِ شوق میں ہنگامۂ حیات نہیں

یہ کس مقام پہ پہنچی ہے بیخودی اپنی
فراز دار پہ ہنسنا بھی کوئی بات نہیں

ترے جمالِ حقیقت کا یہ کرشمہ ہے
تری صفات ہیں مجھ میں مری صفات نہیں

نگاہِ شوق نے جلووں کو بے نقاب کیا
طریقِ عشق میں رسمِ تکلفات نہیں

ہے خوب تر نئی تعمیر کو بہ کو لیکن
رخِ حیات پہ کچھ رونقِ حیات نہیں

نہ آئے حرف کہیں تیرے آستانے پر
جبینِ شوق میں کب سے تجلیات نہیں

ہے اپنا عزم و عمل کس قدر حیات افروز
جہاں میں آج سحر ہی سحر ہے رات نہیں

جو مسکرا نہ سکے رنج و غم میں اے برزمی
مری نظر میں وہ شائستۂ حیات نہیں

غزل

(۳)

نہ صرف عشق کی ہے مجھکو ابتدا معلوم
مجھے تو حسنِ ازل کی ہے انتہا معلوم

ہزار بار مجھے آزما چکا طوفاں
ہر ایک موج کو ہے میرا حوصلا معلوم

غرورِ حسن ترا رہ گیا مرے آگے
تری نظر سے ہوا تیرا مدعا معلوم

نہ جانے کونسی منزل میں ہے جنوں اپنا
"نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم"

نیاز و ناز میں ہے ایک ارتباطِ لطیف
یہ عشق و حسن بظاہر ہوئے جدا معلوم

کچھ امتیاز نہ کر خار و گل میں اے گلچیں
ہوئی خزاں سے بہاروں کی ابتدا معلوم

وفا شعاری پہ میری انھیں ابھی شک ہے
ہے گرچہ سارے جہاں کو مری وفا معلوم

تڑپ کے شمع کی لو بن گیا ہے پروانہ
ہوئی ہے اس کو نئی منزلِ بقا معلوم

رکھا ہے میں نے نشیمن کو برق کی زد میں
کہ ہو سکے مجھے دونوں کا حوصلا معلوم

وہ بیقرار ہوئے میرے دل کی دھڑکن سے
ہوئی ہے ان کو مرے عشق کی صدا معلوم

بہارِ نو ہی میں مرجھا رہے ہیں غنچہ و گل
یہ ابتدا ہے تو پھر اس کی انتہا معلوم

بفیضِ عشق شعورِ نظر ملا برزمی
جمالِ یار کی ہے مجھکو ہر ادا معلوم

کچھ غزل کے بارے میں

زینت ساجدہ:

غزل کے معنی "راز گفتن بہ معشوق" یا عورتوں سے عشقیہ گفتگو کرنے کے ہیں۔ ضمناً حدیثِ شراب وشباب بیان کرنا بھی اسی میں داخل ہے۔ غزل میں عشق کی داستان عاشق کی زبانی ادا ہوتی ہے۔

غزل عربوں کی ایجاد ہے۔ وہاں قصائد میں جو تشبیب ہوتی تھی وہی غزل ہے۔ عربوں نے غزل کی روح کو زندگی میں اچھی طرح سمجھا تھا۔ جذبۂ عشق کی زندہ تفسیر وہاں "لیلیٰ مجنوں" کی داستان بن گئی۔ مجنوں اور اس کے داستانِ عشق کی تلمیحات سے فارسی اور اردو غزل خالی نہیں۔

عربی تشبیب میں مرد متکلم ہے اور عورت مخاطب۔ وہاں تشبیب کو محبوبہ کے اصلی نام سے منسوب کرنا باعثِ فخر خیال کیا جاتا تھا۔ عرب شاعری جذبات کا آئینہ ہے۔ عرب زندگی کے اور معاملوں کی طرح عشق ومحبت کے اظہار میں بھی نڈر اور صاف گو تھے۔ وہ اپنی محبوبہ کا نام ببانگ دہل لیتے۔ اس کے حسن وشباب کی تعریف کرتے اور اس کی اداؤں کو سراہتے تھے۔ نہ صرف اپنے جذباتِ عشق و وارداتِ قلب ہی کو نظم کرتے بلکہ محبوب کا حقیقی سراپا اور احوال بھی بیان کر جاتے۔ یہ صداقت اکثر ان کے اشعار کو دلکش بنا دیتی۔ ہر ایک کا نظریہ الگ الگ ہوتا ہے۔ بعض عشق کے چھپانے کو جذبات کا سلیقہ سمجھتے ہیں اور بعض اظہارِ عشق کو جراءت سمجھتے ہیں۔

سرزمین ایران اپنی بہار سامانی کے ساتھ ساتھ ایسی ایسی نزاکتوں اور لطافتوں کی حامل تھی کہ عشق ومحبت کو یہاں کا ماحول راس آنا ضروری تھا۔ حسن یہاں بہ افراط تھا۔ اس سرزمین میں ہر طرف حسن ورنگینی، طبائع میں ذوقِ نغمہ اور ہوا میں شراب کی تاثیر تھی۔ شعریت ایرانی خمیر میں تھی۔ اس لیے جب عرب سے غزل یہاں آئی تو سر آنکھوں پر خیر مقدم کیا گیا۔ فارسی شاعری میں غزل کی صنف ہی سب سے زیادہ مقبول ثابت ہوئی اور یہیں اس کا ارتقاء مکمل ہوا۔ مثنوی نگاری اور قصیدہ گوئی بھی جاری رہی لیکن ہر شاعر کا غزل گو ہونا ضروری قرار پایا۔ یہاں غزل کی زبان بنی۔ اس کا خاکہ مکمل ہوا۔ اس میں رنگ بھر گیا۔ اس کے موضوعات مقرر ہوئے۔ عرب کی تلمیحات یہاں بھی باقی رہیں۔ ایرانی ماحول اور تلمیحات نے اسے زیادہ مرصع بنا دیا۔ وہاں کے لیلیٰ مجنوں کے ساتھ یہاں شیریں فرہاد نے جنم لیا۔ فارسی زبان میں تذکیر وتانیث مفقود ہے۔ عجمیوں نے محبوب کے نام اور ذات کے اعلان کو نامناسب سمجھا۔ اس لیے اہلِ ایران نے عورت کو مرد کے پیرایہ میں پیش کیا۔ مجازی عشق پر حقیقی عشق کا کچھ نہ کچھ نقاب ڈال دیا گیا۔ مرد اور عورت کے ذاتی واردات کی بجائے حسنِ حقیقی اور عشقِ الٰہی کا ذکر ہونے لگا گویا مجاز کو حقیقت کے انداز میں رقم کیا گیا۔

مجنوں گورکھپوری

ڈاکٹر جانسن نے شعر کو موزوں تصنیف (Metrical composition) کہا ہے۔ جان اسٹورٹ مل پوچھتا ہے: "شاعری ایسے خیال اور الفاظ کے سوا جن میں جذبات کو بے ساختہ ظاہر کر سکیں اور کیا ہے؟" کارلائل شاعری کو "مترنم خیال" بتاتا ہے۔ شبلی "تخیل کے اظہار" کو شاعری کہتا ہے۔ ہیزلٹ کے نزدیک شاعری "تخیل اور جذبات کی زبان" ہے۔

لے ہنٹ کا خیال ہے کہ "انسان کے اندر حقیقت حسن اور قوت کی طلب کا جو پُرخروش جذبہ ہے اسی کے بے اختیارانہ اظہار کا نام شاعری ہے اور اس اظہار کے لیے تخیل اور الفاظ کا متناسب اتار چڑھاؤ لازمی ہیں" کولرج کے تصور میں شاعری علم وحکمت کی ضد ہے اور اس کا نصب العین حقیقت کی تلاش نہیں بلکہ حصولِ انبساط ہے"۔ ورڈسورتھ کی لغت میں "شاعری تمام علم انسانی کی جان اور اس کی لطیف دین روح ہے۔ شاعری جذبات کی وہ پرجوش علامت ہے جو تمام علم وحکمت کے چہرے میں نمایاں ہوتی ہے۔" ایڈگر ایلن پو کے خیال کے مطابق "شاعری حسن کی پرآہنگ اور مترنم تخلیق کا نام ہے۔" واٹس ڈنٹن (Watts Dunton) کا قول ہے کہ "شاعری جذباتی اور مترنم زبان میں شعور انسانی کے محسوس اور جمالیاتی اظہار کا نام ہے"

● ——— شاعری موزوں اور پُرترنم الفاظ میں دلی جذبات کا اظہار ہے اور اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ شاعری کی ترکیب میں جو عناصر غالب ہیں وہ داخلی ہیں اور جو چیز داخلی ہوگی اس کا انفرادی ہونا لازمی ہے لیکن انفرادیت کے معنی اپنی ذات میں کھوئے ہوئے رہنے کے نہیں ہیں سچی اور صحت مند انفرادیت اپنی جگہ خود ایک اجتماعی حقیقت ہے۔ مزماری یا غنائی شاعری کا (جس کی سب سے زیادہ رچی ہوئی صورت وہ صنف ہے جو فارسی اور اردو میں غزل کہلاتی ہے) اصلی جوہر شخصیت یا انفرادیت ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ اس صنف کے بہترین شاہکاروں کی عظمت ادبی دنیا کی تاریخ میں اس لیے ہے کہ وہ انسان کے عامتہ الورود جذبات وافکار کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جس سے ہر سننے والے یا پڑھنے والے کے اندر یہ احساس بیدار ہو جاتا ہے کہ یہ تو اسی کے دل کی باتیں ہیں۔

("نگار" ——— اصنافِ سخن نمبر)

● ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

"غزل اردو میں غنائیہ شاعری کا نمونہ ہے لیکن اس کی ترکیب میں غنا کے علاوہ اور بھی عناصر شامل ہیں۔ لغت نگاروں نے غزل کے معنے "بازی کردن از جوانی و حدیثِ محبت و عشق زنان" بتائے ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے غزل کو ان ہی معنوں میں محدود کر لیں تو اس سے بھی غزل کے مزاج کے بارے میں کچھ نہ کچھ اندازہ لگانے میں مدد مل سکتی ہے۔ بازی کردن از جوانی سے ظاہر ہے کہ غزل میں جذبات کی شدت ایک بنیادی عنصر ہے۔ جوانی دِوانی مشہور ہے۔ یہ دیوانگی اسی لیے طاری ہوتی ہے کہ اس میں پاسبانِ عقل کبھی کبھی دل کو تنہا چھوڑ دیتا ہے۔ فکرِ فردا اور غمِ دوش دونوں ایک لمحے کے لیے فراموش ہو جاتے ہیں۔ حال ہی سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ماضی اور مستقبل دونوں کے ڈانڈے اس سے آکر مل جاتے ہیں۔ یہاں مصلحت اندیشی، فکرِ مآل، رکھ رکھاؤ، تکلف اور تصنع کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ جذبات کا بے پناہ سیلاب امنڈ پڑتا ہے اور یہی جذبات جب شعر کا جامہ پہن لیتے ہیں تو غزل بن جاتے ہیں۔ غنائیت، شدتِ جذبات، نزاکتِ ادا اور سوز و گداز انہیں چار عناصر سے غزل کا خمیر اٹھتا ہے۔"

● ـــــ "غزل اپنی روایت میں داخلیت کے اعتبار سے ہمیشہ شدید ترین جذبات کے اظہار کا ذریعہ اور وسیلہ رہی ہے۔ یہ داخلیت غزل کو انفرادیت بخشتی ہے۔ یہاں صرف غمِ دوراں ہی نہیں ہوتا غمِ دل بھی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ غمِ دل خود غمِ دوراں کی ہی ایک جھلک ہوتا ہے لیکن غزل میں اس داخلی، ذاتی اور تاثراتی رنگ کی وجہ سے ایسا بھرپور جذبہ سما جاتا ہے جس کی مثال اور اصناف میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔"

● ـــــ "غزل میں دو عناصر ایسے ہیں، جنھوں نے اب تک غزل کا ساتھ دیا ہے اور جو بڑی حد تک بحیثیت ایک صنفِ شاعری زندہ رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ ایک شدید قسم کی داخلیت اور دوسرا اس داخلیت سے براہِ راست متعلق ایک خاص قسم کی اشاریت جسے اب غزل کی رمزیت کا نام دیا جاتا ہے۔ حالی کے عہد سے اردو غزل کے خلاف تنقید کا ایک طوفان اٹھا اور اگرچہ حالی کا مقصد صرف غزل کی اصلاح تھا لیکن شاعر اور نقاد یہ سمجھے کہ حالی نے دلِ زندہ کی کہانی جس دن ختم کی سب کے دلوں کی دھڑکنیں اسی دن بند ہو گئیں، عشق اور محبت کے سوتے سوکھ گئے۔ حسن اور جوانی ابدی خزاں سے ہمکنار ہو گئے، اور اس طرح غزل کا دور ختم ہو گیا۔ شاعر کا کام بیواؤں کی شادی کرانا، یتیم خانوں کے لیے چندہ جمع کرنا، کسی کانفرنس کے آغاز یا انجام پر ایک نظم کا فرض ادا کرنا رہ گیا۔ یہ سب نہایت مبارک افعال ہیں لیکن ان پر شاعری کی تہمت کیوں رکھیے؟ بہر حال حالی سے اقبال تک غزل پر ایک آزمائش کا دور گزر گیا لیکن اس میں بھی غزل کا شعلہ بالکل بجھا نظر نہیں آتا۔ لکھنؤ میں آخر آخر تک عزیز، آرزو اور صفی سے لے کر باقی ہند عظیم میں حسرت، اصغر، فانی اور جگر نے غزل کو اپنے خونِ جگر سے سینچا اور سنوارا۔"

● ـــــ "غزل پر سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ اس میں سوائے اس کے کہ سب اشعار ہم وزن، ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں اور کوئی باطنی ربط نہیں پایا جاتا۔ اس میں بے ربطی، انتشار اور پراگندگی کے علاوہ کچھ اور نہیں آتا یعنی جس طرح ایک مکمل نظم میں خیال کی ابتدا، ترقی اور انتہا ہوتی ہے ویسی کوئی چیز غزل میں نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے شاعر کی نفسیاتی کیفیت پر توجہ کرنا ضروری ہے۔ شاعری کے متعلق اربابِ ذوق متفق ہیں کہ انسان پر جب کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو خود بخود اس کے منہ سے موزوں الفاظ اور فقرے نکلنے لگتے ہیں، یہی شعر ہوتے ہیں۔ اس وقت شاعر کے ذہن کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ کوئی خیال، کوئی واقعہ، کوئی چیز شاعر کے جذبات کو تحریک میں لاتی ہے۔ پرانے تجربے اس نئی تحریک سے مل کر ایک نیا تجربہ پیش کرتے ہیں، جو کسی نئے خیال، نئے احساس یا نئے جذبے کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور وہی خیال، احساس یا جذبہ موزوں اور متناسب الفاظ میں زبان سے ادا ہو جاتا ہے، لیکن جذبات کا سلسلہ بجلی کی چمک نہیں تھی کہ آئی اور آناً فاناً چلی گئی، جذبات ہمیشہ سلسلے سے آتے ہیں اور اسی سلسلے کو ربطِ خیال (Association of ideas) کا قانون قابو میں رکھتا ہے۔ اس قانون کے ماتحت ایک خیال دوسرے خیال کو اور دوسرا خیال تیسرے خیال کو اور تیسرا خیال چوتھے خیال کو ذہن میں پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہر دو آگے پیچھے آنے والے خیالات میں کوئی ربط یا رشتہ ضرور ہوتا ہے۔ اگر یہ ربط یا رشتہ شعوری ذہن میں ہوتا ہے تو فوراً ہمیں بھی محسوس ہونے لگتا ہے مثلاً شاعر بہار سے متاثر ہوا، پھولوں کا خیال آیا، نرگس کے تصور نے محبوب کی چشمِ شہلا یاد دلا دی۔ محبوب کا خیال آتے ہی اس کا ستم و جور و جفا سب یاد آ گئے۔ اب بہار اور جور و جفا میں بظاہر کوئی ربط نہیں لیکن تسلسلِ خیال کو دیکھیں تو ربط نظر آنے لگتا ہے۔"

("غزل اور متغزلین" صـ۵، صـ۱۰، ۲۰۱، ۳۲۴ اور ۳۸)

محمد منظور احمد ایم۔ اے (عثمانیہ) منیجنگ ایڈیٹر نے اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد میں چھپوا کر مدرسہ فوقانیہ چوک سے شائع کیا۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

(اقبال)

مطبوعہ
اعجاز مشین پریس چھتہ بازار
حیدرآباد دکن